دُنیا مرے آگے



مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی



مکتبۂ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)


دنیا مرے آگے



محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : خضر اشفاق قاسمی

طبع جدید : شوال المکرم ۱۴۳۰ھ - اکتوبر ۲۰۰۹ء

مطبع : احمد بلاک ورکس کراچی

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : (92-21) 35031565, 35031566

ای میل : info@quranicpublishers.com

ویب سائٹ : www.quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

✿ مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون: 35031565 - 35031566

✿ ادارۃ المعارف کراچی
فون: 35049733 - 35032020

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدلله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم
و على آله و أصحابه أجمعين، و على كل من تبعهم باحسان الى يوم الدين. امابعد:

پیش لفظ

پچھلے تقریباً بیس سال سے میں ایک برگِ آوارہ کی طرح تسلسل سے سفر میں رہا ہوں، اور اس دوران نہ جانے کتنے ملکوں اور شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ان میں سے جن سفروں میں کوئی قابل ذکر معلومات حاصل ہوئیں، یا ان کی بدولت تاریخِ اسلام کے گمشدہ اوراق پلٹنے کا موقع ملا ہے۔ ان کی رُوداد میں سفرناموں کی شکل میں لکھتا رہا ہوں۔ ان سفرناموں کا پہلا مجموعہ ''جہانِ دیدہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور اس نے میری توقع سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ''جہان دیدہ'' کی اشاعت کے بعد بھی میرے سفروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ابتک جاری ہے، اور یہ سطور لکھتے وقت بھی میں ایک طویل سفر کے لیے پابہ رکاب ہوں۔ چنانچہ اس عرصے میں کچھ مزید سفرنامے بھی تحریر میں آئے، اور دوستوں کی خواہش ہوئی کہ ''جہانِ دیدہ'' کی دوسری جلد بھی شائع کی جائے۔ جو کتاب اس وقت آپ کے سامنے ہے، وہ اسی فرمائش کی تکمیل ہے۔ البتہ اسے ''جہانِ دیدہ'' کی دوسری جلد قرار دینے کے بجائے بوجوہ میں نے اس کا دوسرا نام تجویز کر دیا ہے۔ یعنی ''دنیا مرے آگے''!

دارالعلوم کراچی ۱۴

نام تبدیل کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں قاری کو اس بات کا پابند بنانا نہیں چاہتا کہ وہ دونوں کتابیں ایک ساتھ ضرور خریدے یا پڑھے، اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میری پہلی کتاب کا صحیح نام ''جہانِ دیدہ'' تھا (یعنی نون کے نیچے زیر تھا) مگر اس نام کو بہت سے پڑھنے والوں نے ''جہاں دیدہ'' اتنی کثرت سے پڑھا کہ میں دوسری کتاب کے ساتھ اس ظلم کا حوصلہ نہیں پاتا۔ جتنی بار میرے سامنے میری اس کتاب کو لوگ ''جہاں دیدہ'' (نون غنہ کے ساتھ) پڑھتے ہیں، اتنی ہی مرتبہ طبیعت پر تکدر کی چوٹ لگتی ہے۔ لہٰذا اس دوسری کتاب کا نام بدل دینے میں عافیت نظر آئی۔

بہرکیف! یہ کتاب اب آپکے سامنے ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قارئین کیلئے دلچسپی اور فائدے کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

۵/ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ

فہرست مضامین

اندلس میں چند روز



رمضان ۱۴۱۰ھ
اپریل ۱۹۹۰ء

اندلس میں چند روز

مجمع الفقہ الاسلامی اور البنک الاسلامی للتنمیۃ (جدّہ) کے تعاون سے پچھلے دنوں مراکش کے دارالحکومت رباط میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع مروجہ مالی معاملات کی شرعی حیثیت تھا۔ اس مذاکرے میں مجھے بھی شرکت کرنی تھی۔

چنانچہ میں مورخہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کی صبح کراچی سے پی آئی اے کے طیارے میں روانہ ہوا۔ چونکہ رباط تک کوئی براہ راست پرواز میسر نہیں ہے، اس لیے یہ سفر پیرس کے راستے ہونا تھا۔ درمیان میں طیارہ قاہرہ بھی ٹھہرا، اور گیارہ گھنٹے جہاز میں گذارنے کے بعد شام کے تین بجے پیرس کے اورلی ہوائی اڈے پر اترا۔ تقریباً چار گھنٹے ایئر پورٹ پر انتظار کرنے کے بعد مجھے شام ساڑھے سات بجے ایئر فرانس کا دوسرا طیارہ ملا جس نے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد مراکش کے وقت کے مطابق رات کے ساڑھے نو بجے رباط پہنچا دیا۔

قیام کا انتظام حیاۃ ریجنسی ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ مجلس مذاکرہ بھی اسی ہوٹل کے ایک ہال میں منعقد ہوئی، اور تقریباً پانچ دن میں مذاکرے کے اجلاسات اور اس کی مجلس تسوید کی ذیلی نشستوں میں مصروف رہا، بیچ بیچ میں چند بار شہر رباط کے مختلف حصوں میں بھی جانے کا موقع ملا، لیکن مذاکرے کے متواتر اجلاسات اور باہر مسلسل بارش کی وجہ سے زیادہ تر وقت ہوٹل ہی میں گزرا۔

مراکش اسپین سے قریب ترین اسلامی ملک ہے، اور اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ درخشاں تاریخ کی وجہ سے اس خطہ زمین کو دیکھنے کی خواہش بچپن سے تھی، خیال یہ تھا کہ اسپین سے مراکش کے قرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سفر میں اس خواہش کی تکمیل بھی ہو

جائے تو بہتر ہے۔ لیکن ساتھ ہی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت صرف کرنا ممکن نہ تھا۔ نیز اس سفر کے لیے کسی رفیق کی بھی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا سامان یہ ہوا کہ مذاکرہ اپنے طے شدہ وقت سے دو دن پہلے ختم ہو گیا۔ اور ان دو دنوں میں کراچی پہنچنے کے لیے کوئی مناسب طیارہ مجھے نہ مل سکا۔ دوسری طرف ہمارے محترم دوست سعید احمد صاحب جو فیصل اسلامک بینک بحرین کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ اس سفر میں احقر کے ساتھ چلنے کے لیے نہ صرف آمادہ ہو گئے، بلکہ سفر کی تمام کارروائیاں اپنے ذمے لے لیں، اور بحسن وخوبی انہیں اس طرح انجام دیا کہ مجھے کچھ کرنا نہ پڑا۔

پہلے خیال یہ تھا کہ ہم رباط سے بذریعہ ریل طنجہ جائیں اور وہاں بحر متوسط عبور کرنے کے لیے اسٹیمر استعمال کریں جو طنجہ سے الجزیرۃ الخضراء کی بندرگاہ پر اتارتا لیکن ہمارے پاس وقت کم تھا، اور اس راستے سے الجزیرۃ الخضراء پہنچنے میں پورا ایک دن صرف ہو جاتا، چنانچہ ہم نے اندلس کے ساحل مالقہ تک بذریعہ طیارہ سفر کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کی شام کو مذاکرہ ختم ہوا، اور ۲۴ ربیع الثانی کی صبح ۷ بجے ہم بذریعہ کار الدار البیضاء (کاسابلانکا) روانہ ہوئے۔ یہ سفر سڑک کے راستے دو گھنٹے کا ہے۔ دائیں جانب بحر متوسط کا ساحل ساتھ ساتھ چلتا ہے، اور بائیں جانب حد نظر تک سبزہ زار پھیلے نظر آتے ہیں۔ بیچ میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آتی رہیں۔ تقریباً نو بجے ہم کاسابلانکا کے مطار محمد الخامس پہنچ گئے۔

دن کے ساڑھے گیارہ بجے اسپین کی آئی بیرین ایئر لائنز کے طیارے نے مالقہ کی طرف پرواز شروع کی، کاسابلانکا سے نکل کر اس نے تقریباً پچاس منٹ میں بحر متوسط عبور کیا، اور تھوڑی ہی دیر میں اندلس کا ساحل اور اس پر پھیلی ہوئی مالقہ کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ مقامی وقت کے مطابق دن کا ڈیڑھ بجا تھا جب طیارہ مالقہ (Malaga) کے وسیع وعریض ایئرپورٹ پر اترا۔

مالقہ کا مکمل تعارف تو میں انشاء اللہ آخر میں کراؤں گا، لیکن یہاں اتنا ذکر کر دینا کافی ہے کہ یہ مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی اندلس کی ایک اہم بندرگاہ تھی، اور اندلس کی تاریخ کے بڑے اہم واقعات اس سے وابستہ ہیں۔ ہم طیارے سے اترنے کے بعد امیگریشن وغیرہ کے

مراحل سے فارغ ہوئے تو تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ یہاں سے غرناطہ کا سفر اندازاً ڈھائی تین گھنٹے کا تھا۔ اس لیے ظہر کی نماز مالقہ ایئر پورٹ پر ہی ادا کی۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں کا چپہ چپہ آٹھ سو سال تک تکبیر کی صداؤں سے گونجتا رہا۔ جہاں کا شاید کوئی قطعہ زمین ایسا نہ ہو جس میں مسلمانوں کے سجدوں کے نشان ثبت نہ ہوئے ہوں، لیکن آج یہاں کوئی قبلے کا صحیح رخ بتانے والا بھی موجود نہ تھا۔ میں نے قبلہ نما کے ذریعہ سمت کا تعین کیا اور ایئر پورٹ ہی کے ایک گوشے میں ہم دونوں نے نماز ظہر با جماعت ادا کی۔ جس خطے میں کبھی پیدا ہونے والا ہر بچہ سب سے پہلے توحید و رسالت کا اقرار سیکھتا اور نماز کے ارکان دیکھا کرتا آج وہاں کے باشندوں کے لیے ہم دونوں کی نماز کے یہ افعال اتنے نامانوس اور اچنبھے تھے کہ آس پاس سے گذرنے والے حیرت کے ساتھ ہمیں دیکھتے رہے۔ مجھے یورپ اور امریکہ کے بہت سے مقامات پر۔ اور بعض اوقات پبلک مقامات پر بھی۔ بارہا نماز پڑھنے کا موقع ملا ہے، لیکن نماز کے افعال سے لوگوں کی نامانوسیت کا وہ انداز اسپین کے سوا کہیں اور نظر نہیں آیا۔

بہر حال! عبرت اور حسرت کے جذبات دل میں لئے اندلس کی سرزمین پر پہلی نماز پڑھی۔ دوسرے مغربی ممالک کی طرح یہاں بھی کاریں بغیر ڈرائیور کے کرائے پر مل جاتی ہیں۔ ہم نے دو روز کے لئے ایک فیئٹ کار کرائے پر لے لی۔ ذاتی طور پر مجھے اس میں یہ تامل تھا کہ یہاں کے راستے بھی ہمارے لئے اجنبی ہیں، اور یہاں کی زبان سے بھی ہم واقف نہیں، اس لئے خود ڈرائیو کرنے میں راستے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ مگر میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب نے ہمت کی، اور کار خود ڈرائیو کرنے کا ذمہ لیا، یہیں سے ہمیں غرناطہ تک پہنچنے کے لئے راستوں کا ایک نقشہ بھی مل گیا۔ اور سعید صاحب نے اس نقشہ کی مدد سے سفر کا آغاز کر دیا۔

غرناطہ جانے والی شاہراہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں تھوڑی سی کاوش کرنی پڑی، لیکن پھر مالقہ کی اندرونی سڑکوں ہی پر نصب غرناطہ کی سڑک کے اشارے نظر آنے لگے یہ اشارے ہر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اتنے تواتر کے ساتھ اور اتنے برموقع لگے ہوئے ہیں کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انہی اشاروں کی پیروی کرتے ہوئے ہم مالقہ کی گنجان آبادی

سے باہر نکل آئے، اب ایک صاف ستھری ہائی وے ہمارے سامنے تھی جو غرناطہ جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ شہر کی عمارتیں ختم ہوئیں، اور سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی سبز پوش پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن کی سطح پر اور درمیانی میدانوں میں زیتون کے خوب صورت درخت حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے، تاریخ اور ادب کی کتابوں میں اندلس کے قدرتی حسن کے جو حالات کبھی پڑھے تھے، مشاہدہ ان کی پوری پوری تصدیق کر رہا تھا۔

یہ اندلس کی وہی سرزمین تھی، جس پر مسلمانوں کے عروج و زوال کی آٹھ سو سالہ تاریخ کے واقعات بچپن سے دلی وابستگی اور دلچسپی کے مرکز بنے رہے ہیں۔ تصور کی نگاہوں نے اس کے نہ جانے کتنے خاکے بنائے ہوئے تھے۔ عالم تخیل کی وہ حسین وادیاں آج نگاہوں کے سامنے تھیں، اور ان میں آٹھ سو سال کے واقعات کی ایک فلم چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس قوم نے تلواروں کے سائے میں یہاں تکبیر کے زمزمے بلند کیے تھے، وہ آٹھ صدیوں تک اپنے جاہ و جلال کا لوہا منوانے کے بعد طاؤس و رباب کی تانوں میں مدہوش ہو کر ایسی سوئی کہ آج اس کا کوئی نشان بھی سلامت نہیں رہا۔

اندلس جسے ہسپانیہ[1] اور اسپین بھی کہا جاتا ہے۔ یورپ کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں شمال میں فرانس سے اور مغرب میں پرتگال سے ملتی ہیں، اور اس کے مشرق اور جنوب میں بحر متوسط بہتا ہے جسے بحر روم بھی کہا جاتا ہے۔

اندلس کے جنوبی ساحل کی طرف بحیرہ روم تنگ ہو کر ایک چھوٹی سی آبنائے میں تبدیل ہو گیا ہے جس کے راستے وہ بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) میں جا گرتا ہے۔ یہ آبنائے آج کل آبنائے جبل الطارق (Strait of Gibraltor) کہلاتی ہے۔ اور اس کے دوسرے سرے سے براعظم افریقہ شروع ہو جاتا ہے جس کا انتہائی مغربی ملک مراکش ہے۔

---

[1] کہتے ہیں کہ طوفان نوحؑ کے بعد سب سے پہلے جو قوم اس خطے میں آباد ہوئی اس کا نام ''اندلش'' تھا، عربوں نے ''شین'' کو ''سین'' میں بدل کر اس پورے علاقے کا نام ''اندلس'' رکھ دیا۔ بعد میں یہاں ایک رومی بادشاہ کی حکومت ہوئی جس کا نام ''اشبان'' تھا۔ اسی نے اشبیلیہ شہر آباد کیا جس کی وجہ سے اشبیلیہ شہر کو ''اشبانیہ'' کہا جانے لگا، پھر رفتہ رفتہ یہ نام پورے ملک کے لیے بولا جانے لگا، اور اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہسپانیہ یا اسپین ہے۔ (نفح الطیب للمقری ١٣٠)

میں اپنے الجزائر کے سفرنامے میں عقبہ بن نافعؓ کے ہاتھوں مراکش کی فتوحات کا حال لکھ چکا ہوں۔ پہلی صدی ہجری کے آخر تک مسلمان افریقہ کی شمالی پٹی کو فتح کرتے ہوئے بحراوقیانوس تک پہنچ گئے تھے۔ قرونِ اولیٰ کی اسلامی قوت کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے پیش نظر ملک گیری کی ہوس یا اپنے اقتدار کے رقبے میں اضافہ کرنا نہیں تھا، اس کے بجائے وہ اللہ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانے کا مشن لے کر نکلے تھے، چنانچہ جہاں جہاں ان کی فتوحات کے پرچم لہرائے، وہاں وہاں عدل وانصاف اور سکون واطمینان کا دور دورہ ہوگیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مفتوح قومیں ان سے نفرت کے بجائے محبت کرتی تھیں، اور زمین کے جو خطے ابھی ان کے اقتدار سے محروم تھے، ان میں ظلم وستم سے کچلے ہوئے افراد یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ مسلمان ان کے علاقے پر بھی حملہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کرلیں۔

اس وقت اسپین میں ایک عیسائی بادشاہ کی حکومت تھی جس کا نام انگریزی تاریخوں میں راڈرک اور عربی تاریخوں میں لزریق مذکور ہے۔ ادھر مراکش کے ساحل سبتہ پر ایک بربری سردار کاؤنٹ جولین کی حکومت تھی، وہ بھی عیسائی تھا، لیکن راڈرک نے اسے اپنا باج گزار بنا رکھا تھا، راڈرک ایک ظالم حکمران تھا اور اس کی بہت سی بدعنوانیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اپنی رعایا کے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو شاہی تربیت کے بہانے اپنے زیراثر رکھتا۔ اور ان سے اپنی ہوس پوری کرتا تھا۔ جولین کی ایک نوعمر لڑکی بھی اس طرح اس کے "زیر تربیت" رہی اور بالآخر راڈرک نے اسے بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ لڑکی نے اپنی اس مظلومیت کی اطلاع اپنے باپ جولین کو کردی، جس کے نتیجے میں جولین کے دل میں راڈرک اور اس کی حکومت کے خلاف نفرت کے شدید جذبات پیدا ہوگئے۔

یہ وہ وقت تھا جب مسلمان موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں شمالی افریقہ کے بیشتر حصوں پر قابض ہو چکے تھے، جولین ایک وفد لے کر موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسپین پر حملہ کر کے لوگوں کو راڈرک کے ظلم وستم سے نجات دلائیں۔ موسیٰ بن نصیر نے جولین کی اس درخواست پر خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اندلس پر چڑھائی کی اجازت طلب کی، خلیفہ نے احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے اجازت دے دی تو موسیٰ بن نصیر نے پہلے

چند چھوٹی چھوٹی مہمات طنجہ سے اندلس بھیجیں، تا کہ حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے، یہ مہمات کامیابی سے ہمکنار ہوئیں تو موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر اندلس پر چڑھائی کے لئے روانہ کر دیا۔

طارق بن زیاد کا لشکر سات ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ انہیں طنجہ سے اندلس پہنچانے کیلئے چار بڑی کشتیاں استعمال کی گئیں جو کئی روز تک فوج کی نقل و حرکت میں مشغول رہیں، یہاں تک کہ پورا لشکر اندلس کے اس ساحل پر اتر گیا جو آج بھی جبل الطارق کے نام سے مشہور ہے۔

روایات میں ہے کہ کشتی پر سوار ہونے کے کچھ دیر بعد طارق بن زیاد کی آنکھ لگ گئی تو انہیں خواب میں نبی کریم سرور عالم ﷺ کی زیارت ہوئی، انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ، خلفاء راشدینؓ اور بعض دوسرے صحابہ تلواروں اور تیروں سے مسلح سمندر پر چلتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ طارق بن زیاد کے پاس سے گذرے تو آپ ﷺ نے فرمایا ''طارق! بڑھتے چلے جاؤ'' اس کے بعد طارق نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے مقدس رفقاء اس سے آگے نکل کر اندلس میں داخل ہو گئے۔

طارق کی آنکھ کھلی تو بیحد مسرور تھے۔ انہیں فتح اندلس کی خوشخبری مل چکی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ بشارت سنائی اور اس بشارت نے مجاہدین کے حوصلوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔[۱]

مشہور ہے کہ جب اندلس کے کنارے پر پورا لشکر جمع ہو گیا تو طارق نے اپنی کشتیاں جلا دیں، تا کہ فتح یا موت کے سوا لشکر کے سامنے کوئی تیسرا راستہ باقی نہ رہے۔ اسی واقعہ کو اقبال نے اپنے مشہور قطعے میں نظم کیا ہے۔

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم؟
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست؟

---

۱ نفح الطیب ص ۲۲۹ ج ۱۔

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

طارق نے جب اندلس کے ساحل پر اپنی کشتی جلائی۔
تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نگاہ میں تمہارا یہ عمل بڑی غلطی ہے۔
ہم لوگ اپنے وطن کی سرزمین سے دور ہیں، اب وطن کیسے پہنچیں گے؟
اسباب کو ترک کرنا تو شریعت کی رو سے بھی جائز نہیں۔
طارق جواب میں مسکرایا، اور اپنا ہاتھ تلوار تک لیجا کر بولا۔
''ہر ملک ہمارا ملک ہے، اس لئے کہ وہ ہمارے خدا کا ملک ہے''[1]

طارق اپنے لشکر کے ساتھ جبل الفتح یا جبل الطارق کے ساحل پر اترا تھا، اور وہاں سے ''الجزیرۃ الخضراء'' تک کی ساحلی پٹی اس نے کسی موثر مزاحمت کے بغیر فتح کر لی، لیکن اس کے بعد راڈرک نے اپنے مشہور سپہ سالار تدمیر (Theodomir) کو ایک بڑا لشکر دیکر طارق کے مقابلے کے لئے بھیج دیا، مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ اس کی پے در پے کئی لڑائیاں ہوئیں، اور وہ ہر لڑائی میں شکست سے دوچار ہوا، یہاں تک کہ متواتر ہزیمتوں کے نتیجہ میں اس کا حوصلہ جواب دے گیا، اور اس نے اپنے بادشاہ راڈرک کو لکھا کہ جس قوم سے میرا سابقہ پڑا ہے وہ خدا جانے آسمان سے ٹپکی ہے، یا زمین سے ابلی ہے اب اس کا مقابلہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ آپ بذات خود ایک لشکر جرار لے کر اس کی مزاحمت کریں۔ راڈرک نے اپنے سپہ سالار کا پیغام پا کر ستر ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا، اور طارق کی طرف روانہ ہو گیا۔

---

[1] کشتیاں جلانے کا یہ واقعہ آج کے دور کی تاریخوں میں تو بہت مشہور ہے لیکن فتح اندلس کے ابتدائی مستند مآخذ میں مجھے اس کا ذکر نہیں ملا۔ اندلس کے سب سے بڑے مورخ مقری نے فتح اندلس کا واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن اس میں کشتیاں جلانے کا ذکر نہیں ہے، ابن خلدون اور طبری وغیرہ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ طارق بن زیاد کا جو خطبہ آگے آ رہا ہے، اس کے ابتدائی الفاظ سے مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ طارق اپنی کشتیاں جلا چکا تھا۔ واللہ اعلم۔

دوسری طرف موسیٰ بن نصیر نے بھی طارق بن زیاد کی مدد کے لئے پانچ ہزار سپاہیوں کی کمک روانہ کی جس کے پہنچنے کے بعد طارق بن زیاد کا لشکر بارہ ہزار پر مشتمل ہوگیا۔ غالباً جولین کے رفقا، اس کے علاوہ تھے۔

وادی لکہ کے مقام پر یہ دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو طارق نے وہ تاریخی خطبہ دیا جو آج بھی عربی ادب اور تاریخ کی کتابوں میں تواتر سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے، اور جس کے ایک ایک لفظ سے طارق کے عزم، حوصلے اور سرفروشی کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خطبے کے چند جملے یہ ہیں:

> لوگو! تمہارے لئے بھاگنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟ تمہارے پیچھے سمندر ہے، اور آگے دشمن، لہٰذا خدا کی قسم تمہارے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ تم خدا کے ساتھ کئے ہوئے عہد میں سچے اترو اور صبر سے کام لو، یاد رکھو کہ اس جزیرے میں تم ان یتیموں سے زیادہ بے آسرا ہو جو کسی کنجوس کے دستر خوان پر بیٹھے ہوں۔ دشمن تمہارے مقابلے کے لئے اپنا پورا لاؤ لشکر اور اسلحہ لے کر آیا ہے۔ اس کے پاس وافر مقدار میں غذائی سامان بھی ہے، اور تمہارے لئے تمہاری تلواروں کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں، تمہارے پاس کوئی غذائی سامان اس کے سوا نہیں جو تم اپنے دشمن سے چھین کر حاصل کرسکو۔ اگر زیادہ وقت اس حالت میں گزر گیا کہ تم فقر و فاقہ کی حالت میں رہے اور کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور ابھی تک تمہارا جو رعب دلوں پر چھایا ہوا ہے، اس کے بدلے دشمن کے دل میں تمہارے خلاف جرأت و جسارت پیدا ہو جائے گی، لہٰذا اس برے انجام کو اپنے آپ سے دور کرنے کے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ تم پوری ثابت قدمی سے اس سرکش بادشاہ کا مقابلہ کرو، جو اس کے محفوظ شہر نے تمہارے سامنے لا کر ڈال دیا ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو موت کے لئے تیار کرلو تو اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔ اور میں نے تمہیں کسی ایسے انجام سے نہیں ڈرایا جس سے میں خود بچا ہوا

ہوں، نہ میں تمہیں کسی ایسے کام پر آمادہ کر رہا ہوں جس میں سب سے سستی پونجی انسان کی جان ہوتی ہے، اور جس کا آغاز میں خود اپنے آپ سے نہ کر رہا ہوں، یاد رکھو! اگر آج کی مشقت پر تم نے صبر کرلیا، تو طویل مدت تک لذت و راحت سے لطف اندوز ہو گے۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تمہارے ساتھ ہے، تمہارا یہ عمل دنیا و آخرت دونوں میں تمہاری یادگار رہے گا۔ اور یاد رکھو کہ جس بات کی دعوت میں تمہیں دے رہا ہوں اس پر پہلا لبیک کہنے والا میں خود ہوں۔ جب دونوں لشکر ٹکرائیں گے تو میرا عزم یہ ہے کہ میرا حملہ اس قوم کے سرکش ترین فرد راڈرک پر ہوگا، اور انشاء اللہ میں اپنے ہاتھ سے اسے قتل کروں گا۔ تم میرے ساتھ حملہ کرو، اگر میں راڈرک کی ہلاکت کے بعد ہلاک ہوا تو راڈرک کے فرض سے تمہیں سبکدوش کر چکا ہوں گا، اور تم میں ایسے بہادر اور ذی عقل افراد کی کمی نہیں جن کو تم اپنی سربراہی سونپ سکو، اور اگر میں راڈرک تک پہنچنے سے پہلے ہی کام آ گیا تو میرے اس عزم کی تکمیل میں میری نیابت کرنا تمہارا فرض ہوگا، تم سب مل کر اس پر حملہ جاری رکھنا، اور پورے جزیرے کی فتح کا غم کھانے کے بجائے اس ایک شخص کے قتل کی ذمہ داری قبول کر لینا تمہارے لئے کافی ہوگا کیونکہ دشمن اس کے بعد ہمت ہار بیٹھے گا۔[1]

---

[1] اصلی عربی الفاظ یہ ہیں: ایھا الناس: این المفر؟ البحرمن ورائکم والعدوامامکم، ولیس لکم واللہ الاالصدق و الصبرواعلموا انکم فی ھذہ الجزیرۃ اضیع من الایتام فی مادبۃ اللئام، وقد استقبلکم عدو کم بجیشہ و اسلحتہ، اقواتہ موفورۃ و انتم لاوزرلکم الاسیوفکم، ولااقوات لکم الاماتستخلصونہ من ایدی عدوکم، وان امتدت بکم الایام علی افتقار کم و لم تنجزوالکم امرا ذھبت ریحکم، و تعوضت القلوب من رعبھا منکم الجراۃ علیکم، فادفعوا عن انفسکم خذلان ھذہ العاقبۃ من امرکم بمناجزۃ ھذالطاغیۃ، فقد القت بہ الیکم مدینتہ الحصینۃ، و ان انتھاز الفرصۃ فیہ لممکن ان سمحتم لانفسکم بالموت، و انی لم احذر کم امرا انامنہ بنجوۃ و لا حملتکم علی خطۃ ارخص متاع فیھا النفوس الا و انا

طارق کے رفقاء پہلے ہی جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار تھے۔ طارق کے اس خطبے نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی، وہ وادی لکہ کے معرکے میں اپنے جسم و جان کو فراموش کر کے لڑے۔ یہ جنگ متواتر آٹھ دن تک جاری رہی، کشتوں کے پشتے لگ گئے، اور بالآخر فتح و نصرت مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ راڈرک کا لشکر بری طرح پسپا ہوا، اور خود راڈرک بھی اسی تاریخی معرکے میں کام آیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے خود طارق بن زیاد نے قتل کیا، اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا خالی گھوڑا دریا کے کنارے پایا گیا جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوا۔

وادی لکہ کی یہ فتح جو ایک ہفتے کی صبر آزما جنگ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئی، یورپ میں مسلمانوں کے داخلے کی تمہید تھی جس نے پورے اندلس کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے۔ اس کے بعد مسلمان اندلس کے تمام شہر فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے اس وقت کے دارالحکومت طلیطلہ (Tollido) کو بھی فتح کر لیا، اس کے بعد بھی ان کی پیش قدمی جاری رہی یہاں تک کہ وہ فرانس کے اندر جا کر کوہ پیری نیز کے دامن تک پہنچ گئے۔

اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں نے یہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی جس کے دوران انہوں نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے منفرد چراغ روشن کئے، اور اس خطے کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ بنایا۔

انہی تاریخی واقعات کی بزم، تصور میں سجائے ہوئے ہم نے غرناطہ جانے والی سڑک پر

(بقیہ صفحہ کا حاشیہ) ابدأ بنفسی، واعلموا انکم ان صبرتم علی الاشق قلیلا، استمتعتم بالارفه الالذطویلا ...... والله تعالیٰ ولی انجاد کم علی مایکون لکم ذکرا فی الدارین، واعلمو انی اول مجیب الی مادعوتکم الیه، و انی عند ملتقی الجمعین، حامل بنفسی علی طاغیة القوم لذریق فقاتله ان شاء الله تعالیٰ فاحملوا معی فان هلکت بعده فقد کفیتکم امره، و لم یعوزکم بطل عاقل تسندون امور کم الیه، و ان هلکت قبل و صولی الیه فاخلفونی فی عزیمتی هذه، واحملوا بانفسکم علیه واکتفوا الهم من فتح هذه الجزیرة بقتله فانهم بعده یخذلون۔ (نفح الطیب للمقری ص ۲۲۵ تا ۲۲۶ ج ۱)

اپنا سفر جاری رکھا۔آسمان پر ہلکا ہلکا ابر تھا،اور سڑک چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی، پہاڑیوں کی سطح پراور درمیانی وادیوں میں زیتون کے حسین درخت بڑے توازن اور تناسب کے ساتھ حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے،تصور کی نگاہیں پہاڑوں اور وادیوں کے اس نشیب و فراز میں مجاہدین اسلام کے اولوالعزم قافلوں کو اترتا چڑھتا دیکھ رہی تھیں،آج ہماری کار ایک صاف شفاف سڑک پر تیرتی جارہی تھی جس کے راستے میں کوئی پہاڑ حائل ہوا تو اس نے اس کا سینہ چیر کر سرنگ کا راستہ پیدا کرلیا،لیکن تیرہ سو سال پہلے صحرا نشینوں کے یہ قافلے ان دشوار گزار راستوں کو اپنے عزم و ہمت سے قطع کرتے ہوئے پیری نیز کے دامن تک پہنچ گئے تھے،اقبال نے طارق بن زیاد کی زبان سے انہی خدامست مجاہدوں کے لئے کہا تھا ؎

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی بستیاں اور بعض متوسط حجم کے شہر بھی گزرتے رہے،ان بستیوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی عربی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے،مثلاً پہلا نسبتاً بڑا شہر سامنے آیا تو اس کا نام کاسابرمجہ (Casa Bermaja) تھا۔کاسا دراصل عربی لفظ ''قصر'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے،لہٰذا صاف معلوم ہوگیا کہ اس بستی کا نام قصر برمجہ رہا ہوگا۔یہ سارا علاقہ چونکہ پہاڑی علاقہ ہے،اس لئے ہر بستی میں کوئی نہ کوئی پہاڑ ضرور ہوتا،اور ہر پہاڑ کی چوٹی پر ایک نمایاں کلیسا نظر آتا جس کا مینار اندلس کی مسجدوں کے مینار سے مشابہ ہوتا۔ سقوط اندلس کے کچھ عرصہ کے بعد چونکہ ملک کی تمام مسجدوں کو کلیسا میں تبدیل کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا،اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ پہاڑوں کی چوٹی پر بنے ہوئے یہ کلیسا جن میں ہر جگہ ایک ہی طرز کا مینار نظر آتا ہے،کبھی مسجد رہے ہوں گے،اوران سے پانچ وقت کی اذانوں کی آواز گونجتی ہوگی۔لیکن آج یہ مینار زبان حال سے یہ کہتے نظر آتے ہیں ؎

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

لوشہ میں

ہم غروب آفتاب سے پہلے غرناطہ پہنچنا چاہتے تھے، اس لئے سعید صاحب کافی برق رفتاری سے کار ڈرائیو کررہے تھے، اور ساتھ ساتھ میں انہیں اندلس کی تاریخ کے مختلف واقعات سنارہا تھا، جو وہ بڑی دلچسپی اور عبرت وحسرت کے ساتھ سن رہے تھے، تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایک بڑے شہر کے آثار شروع ہوئے، میں سمجھا کہ یہ غرناطہ کے مضافات ہوں گے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک نشان راہ پر اس شہر کا نام لوجا (Loja) لکھا ہوا نظر آیا، اور میں ٹھٹھک گیا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ یہ اندلس کے مشہور شہر لوشہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اور بعد میں تحقیق سے یہ اندازہ درست ثابت ہوا، یہ وہی لوشہ تھا جس کا ذکر نہ جانے کتنی مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا۔ اندلس کے مشہور مورخ، وزیر اور ادیب لسان الدین ابن الخطیب (متوفی ۷۷۶ھ) یہیں کے باشندے تھے، وہی لسان الدین ابن الخطیب جن کی کتاب ''الاحاطة فی اخبار غرناطه'' غرناطہ کی مستندترین تاریخ سمجھی جاتی ہے، اور جن کے تذکرے کے لئے مقری نے ''نفح الطیب'' کے نام سے اپنی مشہور کتاب (دس جلدوں میں) تالیف کی جو بعد میں پورے اندلس کی بہترین سیاسی، علمی، ادبی، اور ثقافتی تاریخ بن گئی۔

یہ وہی لوشہ تھا جو مسلمانوں کے عہد میں صوبہ غرناطہ کا نہایت ترقی یافتہ اور مشہور شہر سمجھا جاتا تھا، یہاں سے علم و ادب کے بڑے شناور پیدا ہوئے اور یہاں آخری دور میں عیسائیوں کے ساتھ جنگوں کے دوران سرفروشی وجاں بازی کی نہ جانے کتنی داستانیں لکھی گئیں، قشتالہ کے کیتھولک بادشاہ فرڈی ننڈ نے ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں اس شہر پر حملہ کیا تو شیخ علی العطار کی قیادت میں کل تین ہزار رضا کاروں نے اس کے سامنے اپنے عزم واستقلال کی سد سکندری کھڑی کردی، ان سرفروشوں نے فرڈی ننڈ کے ٹڈی دل لشکر کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا، اور اپنے خون پسینے سے اس شہر کی حفاظت کی، لیکن اس واقعے کے چار ہی سال کے بعد

فرڈیننڈ دوبارہ اس شہر پر حملہ آور ہوا، لیکن اس مرتبہ فرڈی ننڈ کے ساتھ تیر وتلوار سے زیادہ مکر وفریب اور اندرونی غداروں کی سازشوں کے ہتھیار تھے، جن کے نتیجے میں یہ شہر غرناطہ سے بھی پہلے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور ایسا نکلا کہ آج اس کا نام پہچاننے کے لئے بھی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

غرناطہ لوشہ سے تقریباً پچپس میل کے فاصلے پر ہے، چنانچہ لوشہ سے روانہ ہونے کے بعد آدھے گھنٹے سے بھی کم میں ہم غرناطہ کے مضافات میں داخل ہوگئے۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد نہ کسی راستے کا کوئی علم تھا، نہ کسی ہوٹل کا پتہ، ایک چوراہے پر گاڑی کھڑی کر کے ایک قریبی دکان سے کسی ہوٹل کا پتہ معلوم کرنا چاہا تو زبان نہ جاننے کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ یہاں انگریزی سمجھنے والے خال خال ہی ملتے ہیں، اور تقریباً پورے یورپ میں یہی حال ہے کہ برطانیہ کے سوا جس کسی ملک میں چلے جایئے، وہاں کے لوگ نہ صرف یہ کہ انگریزی نہیں سمجھتے، بلکہ انگریزی بولنا پسند بھی نہیں کرتے، ہر ملک اپنی زبان بولتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ یہ غلامانہ ذہنیت تو ہمارے ایشیائی اور افریقی ملکوں میں پائی جاتی ہے کہ انگریزی کو علم وکمال کا معیار سمجھ لیا گیا ہے، اسے بولنے لکھنے کو لوگ قابل فخر سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی خاطر اپنی اچھی خاصی زبان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور کسی معقول ضرورت کے بغیر اس میں انگریزی الفاظ ٹھونس کر اپنی زبان بھول بیٹھے ہیں۔

بہر صورت! قریبی دکانوں پر کوئی شخص انگریزی میں بات کرنے والا نہ ملا۔ سعید صاحب نے کہا کہ کچھ فاصلے پر ایک سیاحت کا مرکز میں نے دیکھا تھا، وہاں کوئی انگریزی سمجھنے والا ضرور ہوگا، چنانچہ وہ گاڑی سے اتر کر معلومات حاصل کرنے کے لئے چلے گئے، گاڑی چونکہ بے جگہ رکی ہوئی تھی، اس لئے میں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں نے گرد وپیش پر نگاہ ڈالی تو جس سڑک پر ہم کھڑے تھے، اس کا نام (Alpojara Road) لکھا ہوا نظر آیا، یہ یقیناً ''البجارہ'' کی بگڑی ہوئی شکل تھی، جو غرناطہ کا ایک قدیم علاقہ تھا۔

اسپین کے موجودہ ناموں میں جتنے نام AL سے شروع ہوتے ہیں، وہ سب عربی الاصل ہیں اور غور کرنے سے ان کی عربی اصل آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے۔

تھوڑی دیر میں سعید صاحب ہوٹل کی معلومات کر کے آئے تو پتہ چلا کہ غرناطہ میں سب سے

بڑا ہوٹل لز (Luz Hotel) ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ معمولی تلاش سے ہمیں ہوٹل نظر آ گیا، ہوٹل کے زیر زمین حصے میں پارکنگ کی بھی معقول جگہ موجود تھی، چنانچہ ہم گاڑی وہاں کھڑی کر کے ہوٹل میں آ گئے۔ گیارہویں منزل پر قیام ہوا۔ ہم نے اپنے کمرے کی بالکونی سے باہر کی طرف جھانکا تو شہر غرناطہ کا ایک بڑا حصہ نظروں کے سامنے تھا جس میں کچھ قدیم طرز کی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں، اور ان سب کے پیچھے کوہ سیرا نویدا کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ غرناطہ شہر سیرانویدا کے دامن میں آباد ہے، ان برف پوش پہاڑیوں نے اپنے سامنے پھیلی ہوئی اس وادی میں انقلابات عالم کے کتنے عبرتناک نظارے دیکھے ہیں، کتنے فاتحوں کے جلوس، کتنے مفتوحوں کے جنازے، یہاں کتنی تہذیبیں طرب کے شادیانے بجاتی ہوئی آئیں اور بالآخر نوحہ و ماتم کی فضا میں دفن ہوگئیں، سیرانویدا کی یہ چوٹیاں صدیوں سے یہ تماشا دیکھ رہی ہیں اور اگر ان میں زبان ہوتی تو کہتیں

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غرناطہ رومی زبان میں انار کو کہتے تھے، اور اس شہر کا نام کسی نامعلوم مناسبت کی وجہ سے غرناطہ رکھا گیا تھا۔ جب ابتدا میں مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو اس نام کا کوئی شہر موجود نہیں تھا، اور جس علاقے میں آج کل غرناطہ واقع ہے اسے البیرہ کہا جاتا تھا۔ تقریباً چوتھی صدی ہجری میں شہر غرناطہ بسایا گیا تو شہر البیرہ اس میں مدغم ہوگیا، اور مجموعے کا نام غرناطہ مشہور ہوگیا۔ اس وقت سے یہ شہر اندلس کا سب سے ترقی یافتہ اور سب سے حسین اور متمدن شہر قرار پایا جو اپنے قدرتی مناظر، اپنی آب و ہوا، اپنے طبعی اور انسانی وسائل، غرض ہر اعتبار سے ایک جنت نظیر شہر سمجھا جاتا تھا، اس شہر کے ایک سرے پر سیرانویدا کی چوٹیاں بھی تھیں جو جبل الشلیر کے کوہستانی سلسلے کا ایک حصہ ہیں اور دوسری طرف ایک حسین دریا بھی تھا جسے دریائے شنیل کہتے تھے، اور آج اسے Xenil کہا جاتا ہے۔ یہ وہی دریا ہے جس کے بارے میں لسان الدین بن الخطیب نے وہ مشہور ادبی جملہ کہا تھا کہ:

وما لمصر تفخر بنيلها، والف منه في شنيلها.

''مصر اپنے نیل پر فخر کیا کر سکتا ہے؟ کیونکہ غرناطہ اپنے شنیل میں ایک ہزار نیل رکھتا ہے۔''

اس جملے میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل مغرب کے یہاں حرف ''شین' کے عدد ایک ہزار ہوتے تھے، اور چونکہ ''نیل''میں شین کے اضافے سے ''شنیل'' بنتا ہے، اس سے لسان الدین نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ ''شنیل'' کو ''نیل'' پر ہزار گنا فوقیت حاصل ہے۔

پہاڑ اور دریا کے علاوہ یہ شہر حسین مرغزاروں، شاداب سبزہ زاروں اور خوشنما آبشاروں کا شہر تھا، اور لسان الدین ہی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

بلد تحف به الرياض كانه
وجه جميل والرياض عذاره

وكانما واديه معصم غادة
ومن الجسور المحكمات سواره

''اس شہر کو ہر طرف سے باغات نے اس طرح گھیرا ہوا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی حسین چہرہ ہے، اور باغات اس کے رخسار ہیں۔ اور اس کا دریا کسی نازک اندام کی کلائی ہے، اور اس کے مستحکم پل اس کلائی کے کنگن ہیں۔''

قدرتی وسائل کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ بڑا دولت مند تھا۔ یہاں سونے، چاندی، سیسے اور لوہے کی کانیں بھی تھیں، توتیا اور ریشم بھی پیدا ہوتا تھا، جنگلوں میں طرح طرح کی خوشبودار لکڑیاں بھی پائی جاتی تھیں، غرض اللہ تعالیٰ نے اس خطے کو ہر قسم کی ثروت سے مالا مال کیا تھا، اور اسی وجہ سے یہ مدتوں اندلس میں مسلمانوں کا پایہ تخت رہا، اور جب اندلس کے دوسرے صوبوں سے مسلمانوں کے پرچم سرنگوں ہوئے تو اندلس کے ہر حصے کے مسلمانوں نے اسے اپنی آخری پناہ گاہ بنایا، اور اس طرح اس کی آبادی کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اور یہ اندلس کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر بن گیا۔ یہاں علم وفضل کا وہ چرچا تھا کہ اس کی درسگاہیں اپنے اعلیٰ معیار کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہوئیں، اور عیسائی یورپ کے شاہی

خاندان کے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کو اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھنے لگے۔

اس علاقے پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال سے زیادہ حکومت کی، اور تہذیب وتمدن کے وہ چراغ جلائے جو اس وقت کی دنیا میں بے مثال تھے، لیکن وسائل دنیا کی فراوانی نے جب انہیں عیش وعشرت کی راہ دکھائی، اور ان کی زندگی پر دین اور فکر آخرت کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو تہذیب وتمدن کا یہ عروج انہیں زوال کے گڑھے میں گرنے سے نہ بچا سکا۔ غرناطہ جہاں پہنچ کر کبھی غیر مسلم سفراء کی نگاہیں چکا چوند ہو جایا کرتی تھیں، وہی غرناطہ تھا جہاں ابو عبداللہ نے شہر کی چابیاں فرڈی ننڈ اور ازابیلا کو پیش کر کے جان کی امان پائی تو اسی کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھا، اور پھر یہ وہی غرناطہ تھا جس کے چوراہوں پر عربی کتابوں کی شکل میں علم وفضل کے ذخیرے ہفتوں تک جلتے رہے، جس کی مسجدیں کلیسا بنادی گئیں، جس کے مسلمانوں کو بزور شمشیر عیسائی بنایا گیا، جس کی خواتین کی عصمت پر ڈاکے ڈالے گئے، اور مسلمانوں پر یہ زمین اس درجہ تنگ کر دی گئی کہ کچھ عرصے کے بعد یہاں کسی کلمہ گو کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ مسلمانوں کے عروج وزوال کی ایسی کرب انگیز تاریخ دنیا کے شاید کسی اور خطے میں پیش نہیں آئی۔ میں اور سعید صاحب ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے سیرانویدا اور اس کے دامن میں پھیلے ہوئے شہر کو دیکھتے رہے، اور چشم تصور کے سامنے ان سارے تاریخی واقعات کے سائے منڈلاتے رہے، یہاں تک کہ ہمارے سامنے سورج غروب ہو گیا۔

ہم دوپہر کے وقت کوئی باقاعدہ کھانا نہیں کھا سکے تھے، اس لئے کسی قدر بھوک معلوم ہونے لگی تھی، خیال تھا کہ نیچے اتر کر کوئی حلال غذا تلاش کی جائے، ہمارے ہوٹل کا مطعم ابھی کھلا نہیں تھا، اس لئے سوچا کہ کسی اور قریبی ریسٹورنٹ میں کوئی چیز دیکھی جائے، اور اس بہانے شہر کی کچھ سیر بھی ہو جائے۔ چنانچہ ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو یہ شہر کے وسط کا مصروف بارونق اور فیشن ایبل علاقہ تھا، قریب کے جس کسی ریسٹورنٹ میں گئے معلوم ہوا کہ وہ رات کو آٹھ بجے سے پہلے کھانے کے لئے نہیں کھلے گا۔ جس مین روڈ پر ہوٹل واقع تھا، ہم اسی پر چلتے رہے، تھوڑا سا آگے بڑھ کر ایک بورڈ نظر آیا جس پر ''الحمراء'' (Al-Hambra) لکھا ہوا تھا، اور اس کے ساتھ ایک تیر کے نشان سے الحمراء جانے کے لئے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی ہم اس

تیر کے نشان پر چل پڑے۔ تھوڑا سا مزید چلنے کے بعد ایک چوراہا آیا، اور وہاں سے الحمرا کی نشاندہی کرنے والا بورڈ دائیں جانب کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ہم اسی سمت مڑ گئے۔ یہ ایک نسبتاً چھوٹی سی سڑک تھی، جس کے دونوں طرف دکانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا، اور اس کے دائیں بائیں قدیم طرز کی چھوٹی گلیاں بڑی تعداد میں موجود تھیں جن کا انداز تعمیر قدامت کی گواہی دے رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ غرناطہ کا قدیم علاقہ ہے۔ اسی سڑک پر ایک کافی ہاؤس میں ہم نے چائے پی، اور اس کے بعد اس جستجو میں آگے بڑھتے گئے کہ شاید یہاں قدیم زمانے کی کوئی یادگار ابھی موجود ہو۔

کچھ دور چلنے کے بعد ایک قدیم طرز کے چوک کے ایک کنارے پر پتھروں کی بنی ہوئی ایک عظیم الشان قدیم عمارت نظر آئی جو آس پاس کی تمام عمارتوں میں سب سے ممتاز اور سرفراز تھی، اور اس کے سرے پر اسی طرز کا ایک تکونا بلند مینار تھا جیسا مالقہ سے آتے ہوئے ہم راستے میں بہت سے مقامات پر دیکھ چکے تھے، انداز تعمیر سے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی عالیشان مسجد ہو، ہم بڑے اشتیاق سے اس کی طرف بڑھے، اس کے دروازے پر دو تین سائل بیٹھے ہوئے بھیک مانگ رہے تھے۔ اور عمارت کا مرکزی دروازہ جو کتھئی رنگ کی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا، بند نظر آ رہا تھا، لیکن کواڑوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا ہوا تھا، جس میں سر جھکا کر اندر جا سکتے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ایک تاریک برآمدہ نظر آیا جس کے دائیں اور بائیں عمارت میں جانے کے بڑے دروازے تھے، بایاں دروازہ بند تھا، لیکن دائیں دروازے سے اندر داخل ہونا ممکن تھا، ہم نے اس دروازے سے اندر جھانکا تو دیکھا کہ وہ ایک کلیسا ہے، اور عیسائیوں کا ایک مجمع وہاں اپنی مذہبی رسوم ادا کر رہا ہے۔

ہم عمارت سے باہر آ گئے، لیکن دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمارت کسی مسجد کی رہی ہوگی، جسے بعد میں کلیسا بنا دیا گیا۔ یہ قیاس درست ثابت ہوا۔ تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ درحقیقت یہ عمارت ''جامع غرناطہ'' کی تھی۔ یہ کبھی غرناطہ جیسے شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد تھی۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی، جس عظیم مسجد میں توحید کے متوالوں نے صدیوں اپنے رب کے حضور سجدہ ہائے نیاز گزارے تھے، جہاں سے پانچ وقت اذان کی صدا بلند ہو کر پوری فضا کو

پرنور بناتی تھی، آج وہاں کفر و شرک کے تاریک سائے منڈلا رہے تھے۔

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں

جن عیسائیوں نے اندلس کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی، وہ انتہائی متعصب، تنگ نظر اور تاریک خیال عیسائی تھے۔ انہوں نے یہاں برسر اقتدار آنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ ملک کی ہر مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ اندلس کی تمام پرشکوہ مساجد کو کلیسا بنا دیا گیا تھا، یہ عظیم الشان مسجد بھی اسی ظالمانہ حکم کا نشانہ بنی، اور صرف یہی نہیں، غرناطہ کے عیسائی فاتح فرڈی ننڈ اور ازابیلا کی قبریں بھی اسی مسجد میں بنائی گئیں۔ اسی متعصب طرز فکر کا یہ شاخسانہ ہے کہ اب اس زمین پر کوئی ایک مسجد بھی باقی نہیں رہی۔

بعض مغربی مصنفین نے مسجدوں کو کلیسا بنانے کے اس نصرانی طرز عمل کا دفاع کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ دراصل عیسائیوں کی طرف سے انتقامی کارروائی تھی، کیونکہ مسلمانوں نے اپنے بہت سے مفتوحہ علاقوں میں کلیساؤں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ عیسائیوں نے جواباً اندلس میں وہی کام کیا اور مسجدوں کو کلیسا بنا دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کی طرف سے یہ جواب دہی حق و صداقت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

اول تو مسلمانوں کی طرف سے کلیساؤں کو مسجد بنانے کے واقعات تاریخ میں بہت کم ہیں، اور اندلس میں مساجد کے ساتھ جو کارروائی کی گئی کہ کسی ایک مسجد کا بھی نام و نشان نہیں چھوڑا گیا، اس کی کوئی نظیر مسلمانوں کے فتح کئے ہوئے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ اسلام میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کوئی علاقہ مسلمانوں نے صلح سے نہیں، بلکہ بزور شمشیر جنگ کے ذریعے فتح کیا ہو، وہاں کی زمینوں اور عمارتوں پر انہیں شرعاً مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے، اس اختیار میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو ضرورتاً ختم کر دیں، یا مسجد میں تبدیل کر لیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے اس شرعی اختیار کو بہت کم استعمال کیا، بعض مقامات پر کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت کلیسا کو مسجد بنایا گیا، لیکن غیر مسلموں کی بہت سی عبادت گاہیں اپنے حال پر چھوڑ دی گئیں۔

لیکن جو علاقہ صلح کے ذریعے فتح ہوا ہو، بالخصوص جہاں غیر مسلموں کے ساتھ ان کی عبادت گاہوں کو محفوظ رکھنے کا معاہدہ کرلیا گیا ہو، اس علاقے کی عبادت گاہوں کو زبردستی ختم کرنے یا مسجد میں تبدیل کرنے کا کوئی ایک واقعہ بھی تاریخ میں کم از کم مجھے نہیں ملا۔

اس کے برعکس غرناطہ کو عیسائیوں نے جنگ سے نہیں بلکہ ایک تحریری معاہدے کے تحت صلحاً فتح کیا تھا۔ جس وقت فرڈی ننڈ اور ازابیلا نے ابوعبداللہ سے الحمرا کا قبضہ لیا، اس سے پہلے وہ ایک تحریری معاہدے پر دستخط کر چکے تھے جو ۶۷ دفعات پر مشتمل تھا۔ اس معاہدے کی شرائط میں مندرجہ ذیل امور پوری وضاحت کے ساتھ مذکور تھے۔

(۱) مسلمان خواہ غریب ہوں یا امیر، ان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور وہ جہاں چاہیں، سکونت اختیار کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔

(۲) مسلمانوں کے مذہبی امور میں عیسائی دخل نہیں دیں گے، اور مذہبی قواعد کی ادائیگی میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کریں گے۔

(۳) مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔
کوئی عیسائی مسجد میں گھسنے نہیں پائے گا۔

(۴) مسلمانوں کے معاملات میں شرعی قوانین کی پابندی کی جائے گی۔

(۵) جو عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، انہیں دوبارہ عیسائی بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان عیسائی ہونا چاہے تو ایک مسلمان اور ایک عیسائی حاکم اس کے حالات کی تفتیش کر کے یہ دیکھیں گے کہ اس معاملے میں اس پر کوئی جبر تو نہیں کیا گیا۔[۱]

ان شرائط پر دستخط کرنے کے بعد اس معاہدے کی حیثیت کاغذ کے ایک بے جان پرزے سے زیادہ نہیں سمجھی گئی۔ معاہدے کی کوئی شرط ایسی نہیں تھی جس کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ کھلم کھلا خلاف ورزی نہ کی گئی ہو۔ فرڈی ننڈ، ازابیلا اور ان کے زمانے کے عیسائی

---

[۱] معاہدے کی یہ شرائط بہت طویل ہیں، یہاں صرف چند شرائط ذکر کی گئی ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو **نفح الطیب** ص ۲۷۷ ج ۶، اور اردو میں "خلافت اندلس" از نواب ذوالقدر جنگ ص ۲۹۹۔

پادریوں کی آنکھوں پر تو تعصب کی بدبودار پٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن حیرت ان نام نہاد "غیر جانبدار" مورخین پر ہے جو حق وانصاف کی اس انسانیت سوز پامالی میں بھی معقولیت یا انصاف کی کوئی پرچھائیں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس واقعے کی اگر کوئی صحیح توجیہ ہوسکتی ہے تو وہ اس کے سوانہیں کہ یہ مسلمانوں کی شامت اعمال تھی اور بس!

بہر کیف! صدمہ وعبرت کی ایک دنیا دل میں لئے ہم اس عمارت سے آگے بڑھے، اور دوبارہ الحمراء کا پتہ بتانے والے اشاروں کی پیروی کرتے ہوئے چلتے رہے۔ اور اس طرح یکے بعد دیگرے کئی سڑکوں اور گلیوں سے گزرنا ہوا۔ یہ سارا علاقہ غرناطہ کا قدیم علاقہ تھا۔ ایک جگہ اور ایک عظیم الشان قدیم عمارت نظر آئی۔ یہاں کچھ نوجوانوں کا ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک یونیورسٹی ہے، بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کا نام (Al-Madraza) ہے۔ یہ "المدرسہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ غرناطہ کا سب سے بڑا مدرسہ تھا جس میں صرف غرناطہ ہی کے نہیں، دور دور کے مغربی ملکوں کے طلبہ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ خدا جانے ہماری تاریخ کے کتنے بڑے بڑے علماء یہاں علم وفضل کے دریا بہاتے رہے ہوں گے۔ اب ان کا شمار اور نام معلوم کرنا بھی ممکن نہیں۔ تصور میں علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ، ابن الخطیب رحمۃ اللہ علیہ اور ابوالحسن ابن الامام رحمۃ اللہ علیہ جیسے علماء اور ادباء چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

بعد میں غرناطہ کے تعارف پر ایک انگریزی کتابچے میں نظر سے گزرا کہ عہد اسلام میں یہ عمارت غرناطہ کی خوب صورت عمارتوں میں شمار ہوتی تھی، اس کا صدر دروازہ سنگ مرمر کا تھا، اور اس پر گھوڑے کے نعل کی شکل میں ایک محراب تھی۔ چھت پر بڑی دلآویز مینا کاری تھی، اور کھڑکیوں پر عربی تحریریں کندہ تھیں۔ اسی کتابچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بہت بڑی یونیورسٹی تھی جس میں ابن الفجار، ابن مرزوق، ابوالبرکات بلفنی، ابن الطاوسی اور ابن فیفا نے تعلیم حاصل کی۔ یہ یونیورسٹی سلطان یوسف اول نے بنائی تھی۔ پھر عیسائیوں کے عہد حکومت میں چارلس اول نے ۱۵۲۶ء میں اسے ایک نئی یونیورسٹی کی شکل دی، اور عمارت میں بھی ترمیمات کیں۔

''المدرسہ'' سے آگے بڑھے تو پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک بار پھر ہم اسی مرکزی سڑک پر نکل آئے جو ہمارے ہوٹل کی طرف سے آرہی تھی، اس سڑک کا اختتام ایک بڑے چوک پر ہوا جس کے بیچوں بیچ ایک مجسمہ نصب تھا، اور ایک فوارہ چل رہا تھا، اس چوک کا نام Bibrambla ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ غرناطہ کا سب سے بڑا چوک تھا، اور اس کو ''میدان باب الرملہ'' کہتے تھے اور Bibrambla اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس چوک سے کئی سڑکیں مختلف سمتوں میں نکل رہی ہیں، ان سڑکوں کے نام بھی پرانے ہیں مثلاً ایک سڑک کا نام Zacatin ہے جو اصل میں شارع السقاطین تھی۔ ایک اور سڑک کا نام Boabdil ہے جو ''شارع ابوعبداللہ'' کہلاتی تھی۔

یہاں سے ''الحمرا'' کا بورڈ بائیں طرف کا اشارہ کررہا تھا، ہم اسی طرف مڑ گئے۔ یہ ایک کشادہ سڑک تھی جس کی کشادگی تھوڑی دور جاکر سڑک کے بیچ میں بنی ہوئی ایک عمارت نے ختم کردی تھی۔ اور سڑک اس عمارت کے بائیں جانب سے گزر کر تنگ ہوگئی تھی، اس تنگ سڑک کے دہانے پر ایک بورڈ نصب تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سڑک Albaicin جارہی تھی۔

Albaicin دراصل غرناطہ کے قدیم محلے ''حی البیازین'' کی تحریف شدہ شکل ہے۔ یہ غرناطہ کا مشہور تاریخی محلہ تھا، اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دور کے بہت سے آثار اس محلے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں سے سڑک قدرے تاریک ہوگئی تھی، اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ''حی البیازین'' یہاں سے کتنی دور ہے؟ اس لئے ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے لوٹ آئے۔ یہاں سے بائیں ہاتھ ایک تنگ گلی قصر الحمراء کی طرف جارہی تھی، اس گلی میں مڑنے کے بعد دیکھا کہ یہ گلی کسی پہاڑ پر چڑھ رہی ہے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ الحمراء یہاں سے کافی دور تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے، اور وہ شام پانچ بجے بند ہوجاتا ہے، اور صبح ساڑھے نو بجے سیاحوں کے لئے کھلتا ہے۔ ہمارا مقصد بھی اس وقت الحمرا جانا نہیں تھا، بلکہ اس کے اوقات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور شہر کے اس قدیم علاقے کی سیر تھی۔ اس لئے ہم نے اسی گلی کی ایک دکان سے غرناطہ کے تعارف پر مشتمل وہ کتابچہ خریدا جس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اور واپس ہوٹل کے لئے روانہ ہوگئے۔

الحمراء میں

اگلی صبح ہم ناشتہ کے فوراً بعد ایک ٹیکسی کر کے قصر ''الحمراء'' کے لئے روانہ ہوگئے۔ جس سڑک تک ہم رات پیدل آئے تھے وہاں سے سڑک مسلسل پہاڑ پر چڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ یہ بلند پہاڑ طے کرنے کے بعد اس کی چوٹی پر ٹیکسی نے ہمیں الحمراء کے دروازے پر اتار دیا۔

یہ عظیم الشان تاریخی قلعہ اصلاً چوتھی صدی میں تعمیر ہوا تھا، اس کے بعد غرناطہ کے مختلف حکمران اس میں کمی بیشی کرتے رہے، یہاں تک کہ محمد بن الاحمر الاَحمری نے ۶۳۵ھ میں اس میں بہت سے اضافے کر کے اسے مرکز سلطنت کی شکل دے دی، پھر ساتویں صدی ہجری کے آخر میں اس کے بیٹے محمد بن احمر نے جو ''غالب باللہ'' کے لقب سے مشہور تھا، اس قلعے میں وہ شاہی محل تعمیر کیا جو ''قصر الحمراء'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بیٹوں نے اس محل میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کر کے اسے اپنے زمانے میں فن تعمیر و آرائش کا ایک شاہکار بنا دیا۔

''الحمراء'' کا پورا علاقہ جس میں قلعہ، شاہی محل اور باغات وغیرہ سب داخل ہیں، طول میں ۷۳۶ میٹر اور عرض میں تقریباً دو سو میٹر ہے، اور اس کے گرد ایک مضبوط فصیل ہے جس کے کچھ حصے ابھی تک باقی چلے آتے ہیں۔ ٹیکسی ہمیں اس فصیل کے اندر مختلف خوشنما باغوں سے گزار کر اس جگہ لے کر آئی تھی جہاں سے قلعے اور محل کی اصل عمارتیں شروع ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ابھی قلعے کا دروازہ بند ہے اور تقریباً پندرہ منٹ بعد کھلے گا۔ وہ الحمراء'' جس کا ذکر بچپن سے تاریخوں میں پڑھتے آئے تھے، ایک پیکر عبرت کی صورت میں نظروں کے سامنے تھا۔ یہ ''تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ'' (آل عمران۔ ۲۶) کی ایک محسوس تفسیر تھی۔ اس پر شکوہ عمارت کے سامنے یا اس کے اندر کبر و نخوت کے کتنے پیکر ''انا و لا غیری'' کے نعرے لگاتے رہے، اور کتنے متکبروں کا غرور اس کی دہلیز پر خاک میں مل گیا، یہاں کتنے سروں پر بادشاہت کا تاج رکھا گیا، اور کتنے تاجوروں کے سر اتارے گئے۔ تاریخ کے نہ جانے کتنے راز اپنے کھنڈروں میں چھپائے یہ عمارت آج بھی کھڑی ہے، اور ہر دیکھنے والے کو عبرت و بصیرت کا درس دے رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد قلعے کا دروازہ کھلا تو اس میں داخل ہونے والے سب سے پہلے ہم تھے۔قدم قدم پر شکستہ عمارتیں عہد ماضی کی داستانیں سنا رہی تھیں، دروازے سے قریب ترین تاریخی جگہ ''برج الحراسہ'' ہے جو''الحمراء'' کا سب سے بلند برج ہے۔اور جسے''القصبہ'' بھی کہا جاتا ہے، اسی برج پر کبھی مسلمانوں کا پرچم لہرایا کرتا تھا، لیکن جب غرناطہ کے آخری حکمران ابوعبداللہ نے فرڈی ننڈ کو الحمراء کی چابی کا''تحفہ'' چاندی کی طشتری میں رکھ کر پیش کر دیا تو فرڈی ننڈ نے سب سے پہلا فاتحانہ قدم یہ اٹھایا کہ اس برج سے مسلمانوں کا پرچم اتروا کر پادریوں کے ہاتھوں یہاں ایک لکڑی کی صلیب نصب کی۔وہ دن اور آج کا دن یہ صلیب یہاں نصب چلی آ رہی ہے۔اور الحمراء میں داخل ہونے والے کسی مسلمان سیاح کا دل چھلنی کرنے کے لئے کافی ہے۔

''برج الحراسہ'' کا یہ حصہ''الحمراء'' کا فوجی اور دفاعی حصہ تھا، اس کے آس پاس بھی فوجی انداز کی عمارتوں کے باقی ماندہ آثار موجود ہیں۔''الحمراء'' کا شاہی محل یہاں سے مشرق میں کچھ فاصلے پر واقع ہے، اور راستے میں متعدد بوسیدہ عمارتوں اور کھنڈروں سے گزرنا پڑتا ہے۔کہیں چھوٹے چھوٹے کمروں کی شکستہ دیواریں، کہیں گہرے گہرے سلاخوں کے پیچھے بنی ہوئی کوٹھریاں جو قید خانے کے طور پر استعمال ہوتی ہوں گی، کہیں گہرے گہرے کنویں، کہیں سرنگیں اور خفیہ راستے، کہیں چڑھتے اترتے زینے، کہیں فصیل پر بنی ہوئی دفاعی چوکیاں۔غرض ایک دفاعی قلعے کا پورا نقشہ اپنی شکوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔کبھی یہاں عام آدمیوں کو پر مارنے کی اجازت نہ ہوگی، لیکن آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ بچے گھروندوں کا کھیل کھیلتے کھیلتے اچانک آپس میں لڑ بیٹھے ہوں اور ان گھروندوں کو الٹ پلٹ کر کہیں چلے گئے ہوں۔

فوجی قلعے اور شاہی محل کا درمیانی فاصلہ طے کرنے کے بعد محل میں داخل ہونے کے لئے ایک اور دروازہ ہے۔اور یہاں سے وہ عظیم الشان محلات شروع ہوتے ہیں جن کے حسن و جمال کی وجہ سے الحمراء دنیا بھر میں مشہور ہوا۔سب سے پہلے محل کا وہ حصہ آتا ہے جسے تاریخوں میں''ماسدہ'' یا''مربض الاسود'' کہا گیا ہے۔یہ خوشنما محرابوں والے چار برآمدوں

میں گھرا ہوا ایک صحن ہے جس کے بیچ میں ایک حوض ہے۔ اس حوض کے نیچے چاروں طرف شیر نما مجسمے بنے ہوئے ہیں جن کی آنکھیں، ناک اور چہرے کے نقوش غالباً بالارادہ نہیں بنائے گئے تاکہ بت کی شکل نہ بن جائے۔ ان کے منہ کی جگہ سے پانی فواروں کی شکل میں ابلتا رہتا ہے، یہ محل کا نہایت خوب صورت حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی کے متصل محل کا وہ حصہ بھی ہے جسے ''قاعة السفراء'' کہا جاتا ہے، اور جہاں بادشاہ غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کیا کرتا تھا، اس کی دیواروں پر پوری سورۂ ملک خوب صورت خط میں لکھی ہوئی ہے۔ یہیں بیگمات کے کمرے بھی ہیں، شاہی حمام بھی ہیں۔ ان تمام عمارتوں میں حسین ترین سنگ مرمر استعمال ہوا ہے، اور پتھروں کی اتنی نفیس مینا کاری کی گئی ہے کہ آج کے مشینی دور میں بھی پتھر کو اس طرح موم بنانے کا تصور مشکل ہے۔ دیواروں اور چھتوں پر ہر جگہ ''لا غالب الا اللہ'' خوبصورت عربی خط میں لکھا ہوا ہے جو بنی احمر کا شعار تھا، اور الحمراء کے آخری انجام پر بھرپور تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمرے میں پتھروں کو تراش تراش کر اندلسی خط میں عربی قصیدہ بھی لکھا ہوا ہے جسے پورا پڑھنے کے لئے بھی طویل وقت درکار ہے۔ یہیں وہ مشہور ''قاعة الاختین'' (Two Sisters Hall) بھی ہے جو بالکل ایک جیسے مرمر کے دو پتھروں سے بنا ہوا ہے، اسی خصوصیت کی وجہ سے اسے ''دو بہنوں کا ہال'' کہتے ہیں۔ اور غرناطہ کے آخری تاجدار ابوعبداللہ کی غمزدہ ماں جو ابوالحسن جیسے مجاہد بادشاہ کی بیوی تھی، اور عیسائیوں کے ساتھ ابوعبداللہ کے تعلقات اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے، اسی کمرے میں رہا کرتی تھی۔ ان میں سے بیشتر عمارتوں کی شمالی کھڑکیاں غرناطہ شہر کی طرف کھلتی ہیں جہاں سے پہاڑ کے دامن میں غرناطہ کا مشہور محلہ ''حی البیازین'' پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہاں سے محل کے باشندے شہر کی مجموعی کیفیت کا ہر وقت مشاہدہ کر سکتے تھے۔

ان محلاتی عمارتوں کے ساتھ بڑے خوب صورت پائیں باغ بنے ہوئے ہیں جہاں سے ایک طرف سیرانویدا کی دلفریب چوٹیوں اور دوسری طرف الحمراء کی حسین عمارتوں کا منظر نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ آج بھی جب کہ یہ باغ ویران پڑے ہیں، ایک سیاح ان کے خوشنما نظارے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خدا جانے اپنے عہد شباب میں ان کے حسن و

جمال کا عالم کیا ہوگا؟

الحمراء کے شمال مشرق میں ایک مستقل ٹیلے پر عمارتوں اور باغات کا ایک اور سلسلہ ہے جسے ''جنۃ العریف'' (Generalife) کہا جاتا ہے۔ غرناطہ کے کسی حکمران نے یہ شاندار باغ ایک شاہی تفریح گاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ سیرانویدا کے ڈھلان پر یہ کئی خوبصورت محل نما عمارتوں پر مشتمل ہے۔ اور ان عمارتوں کے سامنے انواع واقسام کے درختوں اور پودوں سے بڑے حسین سبزہ زار بنائے گئے ہیں اس عمارت کے مرکزی دروازے سے محل کی عمارت تک ایک طویل راہداری تمام تر سبز بیلوں سے بنی ہوئی ہے اس کی دیواریں، چھت اور درمیانی محرابیں سب سبزے کو اس طرح تراش کر بنائی گئی ہیں کہ انسان اس کے بنانے والوں کی خوش مذاقی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس خوبصورت محل اور اس کے ساتھ اندلس کی آٹھ سو سالہ تاریخ کو عیسائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہوئے مسلمانوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خود ابوعبداللہ جس کی حماقت اور نااہلی سقوط غرناطہ کا سب سے بڑا ظاہری سبب تھی، جب الحمراء چھوڑ کر جانے لگا اور ایک ٹیلے کی بلندی سے اس نے الحمراء پر آخری نظر ڈالی تو وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس کی والدہ ملکہ عائشہ جو اپنے بیٹے کی نااہلیوں کو مدت سے دیکھتی آرہی تھیں، انہوں نے اسے روتے دیکھا تو کہا کہ ''بیٹا جب تم مردوں کی طرح میدان جنگ میں کوئی کارنامہ نہ دکھا سکے تو بچوں کی طرح رونے سے کیا فائدہ؟''

دن کے تقریباً گیارہ بجے ہم الحمراء سے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل سے سامان لے کر تہ خانے میں کھڑی ہوئی کار میں سوار ہوگئے۔ اب ہماری منزل قرطبہ تھی جو یہاں سے تقریباً دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

جدید ترقی یافتہ ملکوں میں سڑکوں کا نظام اتنا آسان بنا دیا گیا ہے کہ ایک اجنبی سے اجنبی آدمی کو بھی راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، چنانچہ غرناطہ کی آبادی ہی سے ہمیں قرطبہ جانے والی شاہراہ کے اشارے ملتے گئے، اور بالآخر ہم اس سڑک تک پہنچ گئے جو قرطبہ

جارہی تھی۔

غرناطہ سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ایسا سرسبز پہاڑی علاقہ شروع ہوگیا جس میں حد نظر تک چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ان کی درمیانی وادیاں سبزہ وگل کے لباس میں ملبوس نظر آرہی تھیں، سڑک ایک پہاڑ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چوٹی تک جاتی، پھر اسی طرح نیچے کسی وادی میں اتر جاتی اور وہاں سے کوئی دوسرا پہاڑ سامنے آجاتا۔ ان پہاڑوں کی شکل میں قدرت نے غرناطہ کے دروازے پر پہرے دار کھڑے کئے ہوئے تھے، اور سقوط غرناطہ سے پہلے مدتوں بہت سے مجاہدین نے ان پہاڑیوں پر دشمن کا راستہ روکے رکھا۔

پہاڑی علاقے کے ختم ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سی بستیاں راستے میں پڑتی رہیں، اور ہر بستی میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک نمایاں کلیسا ضرور ملتا تھا جس کا مینار اسی طرح کا ہوتا جیسا ہم مالقہ سے آتے ہوئے دیکھتے آئے تھے، اور غالب گمان یہی ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ کوئی مسجد رہی ہوگی جسے بعد میں عیسائیوں نے کلیسا میں تبدیل کردیا۔

تقریباً تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہمیں افق پر شہر قرطبہ کے آثار نظر آنے لگے۔

قرطبہ

قرطبہ اندلس کے قدیم شہروں میں سے ہے، دوسری صدی قبل مسیح علیہ السلام کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ایک رہتے بستے شہر کی حیثیت سے ملتا ہے، اور اس وقت اسے ''کوردوبا'' (Cordoba) کہا جاتا تھا۔ جب پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو یہاں قوطیوں کی حکومت تھی۔ طارق بن زیاد نے ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسے فتح کیا۔ مسلمان فوجوں نے اہل شہر کے ساتھ بڑی فراخدلی اور رعایت کا معاملہ کیا۔ مسلمانوں نے اندلس فتح کرنے کے بعد شروع میں اشبیلیہ کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا، لیکن سلیمان بن عبدالملک کے دور میں والیٔ اندلس سمح بن مالک خولانی نے دارالحکومت اشبیلیہ سے قرطبہ منتقل کرلیا، اور اس کے بعد یہ صدیوں اندلس کا دارالخلافہ بنا رہا۔[1] ۱۳۸ھ میں جب عبدالرحمٰن الداخل نے

---

[1] نفح الطیب ص۹۷ ج ۲

یہاں اموی سلطنت قائم کی تو اس کے بعد سے اس شہر کو زبردست ترقی ہوئی۔

اموی خاندان نے قرطبہ پر تین صدی سے زائد حکومت کی، اس کے بعد یکے بعد دیگرے یہاں بنی حمود، بنی جہور، بنی عباد، مرابطین اور موحدین کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ۶۳۴ھ میں قسطلہ کا عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ اس پر قابض ہو گیا۔ اس طرح اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت ۵۳۴ سال قائم رہی۔

مسلمانوں کے دور میں قرطبہ دنیا کے متمدن ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ شہر اکیس بڑے بڑے محلوں پر مشتمل تھا۔ خلیفہ ہشام المؤید کے زمانے (۳۶۶ھ تا ۳۹۹ھ) میں شہر کا سروے کیا گیا تو شہر کے مکانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ دکانوں کی تعداد اسی ہزار چارسو شمار کی گئی۔ عبدالرحمٰن الداخل کے زمانے (۱۳۸ھ تا ۱۷۲ھ) میں شہر کی مسجدوں کی تعداد چار سو نوے تھی، اور بعد میں سولہ سو مساجد تک کا ذکر تواریخ میں ملتا ہے۔[۱]

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو عظیم الشان عمارتیں شاندار سڑکیں، زبردست پل، اپنے دور کے لحاظ سے زبردست کارخانے اور جدید تمدنی سہولیات قرطبہ کو دیں، ان کا تذکرہ کرنے کے لئے مورخین اور ادیبوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور اندلس کے مشہور مورخ مقری نے ''نفح الطیب'' کی ایک پوری جلد قرطبہ ہی کے تذکرے کے لئے وقف کی ہے۔

علم وفضل کے لحاظ سے بھی ''قرطبہ'' اندلس کا عظیم ترین شہر سمجھا جاتا تھا، اندلس سے علم ودانش کے ہر میدان میں جو قد آور عالمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان میں سے بیشتر قرطبہ ہی سے تعلق رکھتی تھیں، مشہور مفسر اور صحیح مسلمؒ کے شارع علامہ قرطبی، فقہ اور فلسفہ کے امام علامہ ابن رشد، مسلک اہل ظاہر کے سرخیل علامہ ابن حزم، طب اور سرجری کے مسلم الثبوت سائنس دان ابوالقاسم زہراوی، سب اسی شہر میں داد علم وفضل دیتے رہے۔

قرطبہ کے کتب خانے دنیا بھر میں ضرب المثل تھے۔ علم وادب کے ذوق اور اس کے ہمہ گیر چرچے کا عالم یہ تھا کہ کوئی گھر ایک اچھے کتب خانے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ معاشرے

---

[۱] نفح الطیب ص ۷۹ ج ۲

ایسا نادر نسخہ ہے جو کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ جو لوگ طبعی طور پر کتابوں کا ذوق نہ رکھتے ہوں، انہیں معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، چنانچہ بہت سے لوگ محض فیشن کے طور پر اپنے گھروں پر کتابوں کی الماریاں رکھتے، اور انہیں مختلف علوم وفنون کی کتابوں سے سجاتے تھے۔

اس سلسلے میں مقریؒ نے ایک حضرمی شخص کا ایک دلچسپ واقعہ اسی کے الفاظ میں نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک نادر کتاب کی ضرورت تھی، میں اس کی تلاش میں قرطبہ آیا، اور کتابوں کے سارے بازار چھان لئے۔ بالآخر ایک جگہ کتابوں کا نیلام ہورہا تھا، وہاں مجھے وہ کتاب مل گئی جس کی مجھے ضرورت تھی، میں اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا، اور اسے حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ بولی لگانی شروع کردی۔ لیکن جونہی میں کوئی بولی لگاتا، ایک دوسرا شخص اس سے آگے بڑھ کر بولی لگا دیتا۔ ہوتے ہوتے اس شخص نے اتنی قیمت کی بولی لگا دی کہ وہ حد سے زیادہ تھی۔ میں نے نیلام کرنے والے سے کہا کہ ذرا مجھے اس شخص سے ملاؤ جو یہ حد سے زیادہ بولی لگا رہا ہے۔ اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو اپنے لباس سے کوئی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے جا کر کہا کہ ”آپ کوئی بڑے فقیہ معلوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی عزت میں اضافہ کرے، اگر واقعتاً آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہے تو میں آپ کے حق میں دستبردار ہو جاتا ہوں۔“

اس شخص نے جواب دیا ”میں کوئی فقیہ نہیں ہوں، بلکہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے؟ لیکن میں نے بڑی محنت سے اپنے گھر میں ایک کتب خانہ بنایا ہے جو شہر کے شرفاء میں کوئی مقام پا سکے۔ ایک الماری میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے جس میں یہ کتاب سما سکتی ہے۔ اس کتاب کی جلد بھی بہت خوب صورت ہے، اور تحریر بھی بہت حسین ہے، اس لئے میں اس جگہ کو پر کرنے کے لئے یہ کتاب خریدنا چاہتا ہوں۔“ اس پر میں نے اس سے کہا کہ ”بادام اس شخص کو مل رہا ہے جس کے منہ میں دانت نہیں۔“[۱]

ایک مرتبہ قرطبہ کے مشہور عالم علامہ ابن رشدؒ اور اشبیلیہ کے رئیس ابوبکر بن زہر کے

---

[۱] نفح الطیب ص ۱ ج ۲

درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ قرطبہ بہتر ہے یا اشبیلیہ۔ ابوبکر بن زہر نے اشبیلیہ کی بہت سی خوبیاں بیان کیں تو علامہ ابن رشدؒ نے جواب دیا:

''آپ جو خوبیاں بتا رہے ہیں، ان کا تو مجھے علم نہیں، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جب اشبیلیہ میں کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا کتب خانہ بکنے کے لئے قرطبہ آتا ہے، اور جب قرطبہ میں کسی گویے کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا ساز و سامان بکنے کے لئے اشبیلیہ جاتا ہے۔''[1]

جس شہر میں کتابوں اور کتب خانوں کے ساتھ عوام کی محبت کا یہ عالم ہو، اس کی علمی اور ادبی فضا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ قرطبہ کی خواتین اور بچے تک اس علمی ذوق سے جس طرح سرشار تھے، اس کا حال مورخین نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

شہر بھر پر چھائے ہوئے اس علمی ذوق کا نتیجہ یہ تھا کہ قرطبہ کے لوگ اپنی شرافت ونجابت اپنی خوش اخلاقی، خوش وضعی اور سنجیدگی میں نہایت ممتاز سمجھے جاتے تھے، اور سامان عیش کی فراوانی، مناظر قدرت کے حسن، آب وہوا کی نشاط انگیزی اور تفریح گاہوں کی کثرت کے باوجود وہ اوچھی حرکتوں، اور خلاف تہذیب منکرات سے کوسوں دور تھے۔ اندلس کے ایک باشندے اہل قرطبہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہترین اور صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں، دینی احکام کی پوری پابندی کرتے ہیں، نمازیں پابندی سے پڑھتے ہیں، تمام اہل قرطبہ شہر کی جامع مسجد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، اگر کسی بھی شخص کو کہیں کوئی شراب کا کوئی برتن نظر آجائے تو وہ اسے بلا تکلف توڑ ڈالتا ہے، وہ ہر طرح کے منکرات سے نفرت کرتے ہیں، اور ان کا سرمایہ فخر وناز تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک خاندانی شرافت، دوسرے سپہ گری اور تیسرے علم''[2]

جس قرطبہ کے حالات کتابوں میں پڑھے تھے، اور جس کی حسین فضا میں لکھی ہوئی کتابیں آج بھی مجھ جیسے طالب علم کے لئے رہنمائی کا عظیم ذخیرہ ہیں، آج وہی قرطبہ نگاہوں

---

[1] ایضا [2] نفح الطیب ص ۱۵۰ ج ۳

کے سامنے تھا، لیکن دنیا بدلی ہوئی تھی، نہ وہ دین و ایمان، نہ وہ علم وفضل، نہ وہ مسجدیں اور درسگاہیں، نہ کتب خانے اور کتابیں، نہ وہ شرافت ومتانت، نہ وہ عالی دماغ انسان جنہوں نے اس خطے کو دنیا بھر میں سرفرازی عطا کی تھی، اب تو میرے سامنے بیسویں صدی کے یورپ کا ایک شہر تھا جس کی وسیع سڑکوں پر مادہ پرستی کی دوڑ ہورہی تھی، جس کی دورویہ عمارتوں میں کفر و شرک کا بسیرا تھا۔ اور جس کے بسنے والے انسان شرافت ومتانت کو بزورِ شمشیر زیر کر کے سات سو برس کا سفر طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں نفس پرستی شرافت کا منہ چڑا کر اسے عہدِ رفتہ کی جہالت سے تعبیر کرتی ہے۔

قرطبہ کی ابتدائی آبادی سے گزر کر ہم کچھ اور آگے چلے تو سامنے ایک دریا اور اس پر بنا ہوا پل نظر آیا۔ یہ قرطبہ کا مشہور دریا ''وادی الکبیر'' تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوسیدہ فصیل نظر آرہی تھی جو یقیناً کبھی قرطبہ کی شہر پناہ رہی ہوگی۔ پل عبور کرنے کے بعد ہم باقاعدہ شہر میں داخل ہوگئے۔ ہم نے غرناطہ سے روانہ ہوتے وقت ہوٹل لز کے استقبالیہ سے قرطبہ کے ایک اچھے ہوٹل کا پتہ معلوم کرلیا تھا، اس کے مطابق ہم کسی دقت کے بغیر اس بارہ منزلہ ہوٹل کے گیٹ پر پہنچ گئے جس کا نام ہوٹل میل تھا۔ یہ قرطبہ کا مشہور ترین ہوٹل تھا، اور جب ہم اس کمرے میں پہنچے جس میں ہمیں ٹھہرنا تھا تو اندازہ ہوا کہ اس کا معیار غرناطہ کے ہوٹل لز سے کافی بہتر تھا۔

جب ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو تقریباً پونے دو بجے کا عمل ہوگا۔ ہوٹل کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ جامع قرطبہ چار بجے سیاحوں کے لئے کھلتی ہے، چنانچہ ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ ریستوران میں کھانا کھایا، مغربی ملکوں میں جہاں حلال گوشت میسر نہ ہو، وہاں ابلی ہوئی مچھلی سب سے بہتر غذا ہوتی ہے، چنانچہ وادی الکبیر کی صاف ستھری اور تازہ مچھلی نے کام ودہن کی خوب خوب تواضع کی۔

کھانے کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی، اور جامع قرطبہ روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی پیچ در پیچ سڑکوں اور محلوں سے ہوتی ہوئی ایک طویل وعریض قلعہ نما عمارت کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہی مسجد قرطبہ ہے۔ ہمارے سامنے مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ایک پرشکوہ، بلند وبالا اور

طویل عمارت تھی جس کی دیوار کو زمین پر بنے ہوئے بڑے بڑے پشتوں نے سہارا دیا ہوا تھا۔

جامع قرطبہ

جس جگہ آج جامع قرطبہ واقع ہے، رومانی بت پرستوں کے زمانے میں یہاں ان کی ایک عبادت گاہ تھی۔ جب اسپین میں عیسائی مذہب پھیلا تو انہوں نے اس عبادت گاہ کو گرا کر یہاں ایک کلیسا تعمیر کرلیا جو''بخت'' (Vincent) کے نام سے مشہور ہوا۔ جب مسلمانوں نے قرطبہ فتح کیا تو یہاں تقریباً وہی صورت پیش آئی جو دمشق کی فتح کے وقت دمشق میں پیش آئی تھی۔[1] جس طرح دمشق کا کلیسا نصف نصف تقسیم ہوگیا تھا، اسی طرح قرطبہ کے اس کلیسا کو شرائط صلح کے مطابق دوحصوں میں بانٹ دیا گیا، ایک حصے کو مسلمانوں نے بدستور کلیسا رہنے دیا، اور دوسرا حصہ مسجد بنادیا گیا۔ اور ایک مدت تک یہاں مسجد اور کلیسا دونوں ساتھ ساتھ قائم رہے۔

لیکن جب قرطبہ مسلمانوں کا دارالحکومت قرار پایا، اور یہاں کی آبادی تیز رفتاری سے بڑھی تو مسجد کا حصہ نمازیوں کے لئے تنگ پڑ گیا۔ یہاں تک کہ جب عبدالرحمٰن الداخل کی حکومت آئی تو اس کے سامنے جامع قرطبہ کی توسیع کا سوال آیا، مسجد کی توسیع اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ کلیسا کو مسجد میں شامل کیا جائے۔ لیکن چونکہ عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ ہو چکا تھا کہ نصف حصے میں کلیسا برقرار رکھا جائے گا، اس لئے مسلمانوں کی روایات اور شرعی احکام کے مطابق عیسائیوں کو راضی کئے بغیر اسے مسجد میں شامل کرنا ممکن نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل نے بڑے بڑے عیسائی رئیسوں کو بلا کر ان سے کلیسا کی زمین خریدنے کی تجویز پیش کی، اور منہ مانگی قیمت دینے کا وعدہ کیا، عیسائی مذہب میں کلیسا کی فروخت جائز ہے، اس لئے عیسائیوں کے لئے اس پیشکش کو قبول کرنے میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن عیسائی کلیسا ہٹانے پر راضی نہ ہوئے، کافی دن تک انہیں راضی کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر انہوں نے گراں قیمت کے علاوہ اس شرط پر رضامندی ظاہر کردی کہ شہر کے باہر ان کے جو کلیسا منہدم ہوئے

---

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب'' جہانِ دیدہ''

انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے یہ شرط منظور کرلی، اور اس طرح یہ کلیسا کا حصہ بھی مسجد کو مل گیا۔

وسیع زمین حاصل کرنے کے بعد عبدالرحمٰن الداخل نے جامع قرطبہ کی تعمیر از سرِ نو شروع کی "مسجد" کا نقشہ بڑا عظیم الشان تھا اور دمشق کے ایک ماہرِ فن نے تیار کیا تھا۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے طویل مدت درکار تھی۔ لیکن عبدالرحمٰن الداخل تعمیر شروع ہونے کے بعد دو سال ہی میں (۱۷۲ھ) میں فوت ہوگئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے ہشام نے تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا، اور چھ سال میں اسی ہزار دینار کے خرچ سے اسے مکمل کرلیا۔ بعد میں خلفاء بنی امیہ اس مسجد میں مزید توسیع کرتے رہے، یہاں تک کہ آٹھ مرحلوں میں یہ اپنی انتہائی شکل کو پہنچی۔

جامع قرطبہ کا اندرونی حصہ دنیا بھر میں اپنی وسعت اور حسن کے لحاظ سے ممتاز تھا، شاید ساری دنیا میں آج بھی مسجد کا مسقف حصہ اتنا وسیع کہیں اور نہیں ہے، اور یہ سارا حصہ صف در صف بنے ہوئے خوبصورت دالانوں پر مشتمل ہے جن کی چھتیں گنبد نما ہیں، اور دونوں طرف سنگِ مرمر کے خوبصورت ستونوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں اس مسجد کے کل ستونوں کی تعداد چودہ سو سترہ تھی، مسجد کا کل رقبہ تینتیس ہزار ایک سو پچاس مربع ذراع (ہاتھ) تھا۔[1]

مسجد کھلی تو ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہوئے۔ دنیا کی اس عظیم اور تاریخی مسجد کے خوشنما ستون، جو بوسیدگی کے باوجود آج بھی بڑے دلکش معلوم ہوتے ہیں، دور تک پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے، لیکن پورے ہال میں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس مسجد کی چھت میں تین سو ساٹھ طاق اس ترتیب سے بنائے گئے تھے کہ سورج اپنے سال بھر کی گردش میں ہر روز ایک طاق میں داخل ہوتا تھا۔[2] رات کے وقت مسجد میں دو سو اسی فانوس روشن ہوتے تھے جن کے روشن پیالوں کی کل تعداد سات ہزار چار سو پچیس تھی۔ مسجد میں جلنے والی شمعوں اور چراغوں میں تیل کا سالانہ خرچ ۴/۱۔۱۰۲۵۱ قسطار یعنی ۳۱۴ من کے قریب تھا۔ سال بھر میں ساڑھے تین من موم اور

۱؎ نفح الطیب ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ ج ۲ ۲؎ نفح الطیب ص ۶۰ ج ۲

ساڑھے چونتیس سیر سوت بتیاں بنانے میں صرف ہوتا تھا، ہر جمعہ کو مسجد میں آدھا سیر عود اور پاؤ بھر عنبر جلایا جاتا تھا۔ لیکن آج یہ مسجد دن کے وقت بھی تاریک نظر آ رہی تھی، کافی کافی فاصلوں پر کچھ بجلی کے بلب جل رہے تھے، مگر وہ اندھیرا دور کرنے کے لئے کافی نہ تھے۔ مسجد پر کفر و شرک کے تسلط سے جو تاریک سائے صدیوں سے مسلط ہیں، یہ اندھیرا ان کی محسوس نمائندگی کر رہا تھا۔

داخل ہونے کے بعد بائیں ہاتھ کی جانب پوری دیوار عیسائیوں کے بنائے ہوئے کلیساؤں کے مختلف کمروں پر مشتمل ہے جن میں بہت سے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے بیچوں بیچ مسجد کے نقشے کا حلیہ بگاڑ کر ایک بہت بڑا کلیسا بنا دیا گیا ہے، مسجد کے خوب صورت دالانوں کی گنبد نما چھتوں پر تصویریں نقش کر دی گئی ہیں۔ کلیسا کی سروس کے لئے بڑے بڑے اسٹیج بنا دیئے گئے ہیں جن کے سامنے دور تک کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔

عیسائیوں نے مسجد کے اندر جو تصرفات کئے ہیں، ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد کلیسا کی کوئی حقیقی ضرورت پورا کرنا نہیں بلکہ مسجد کے اسلامی روکار کو مسخ کرنا ہے، اور پیش نظر یہ ہے کہ اس عالیشان مسجد کا کوئی حصہ عیسائی تصرف سے محفوظ نہ رہے، خواہ اس غرض کے لئے عمارت کو کتنا بڑا نقصان پہنچ جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسجد قرطبہ میں اپنی متعصبانہ بد مذاقی کا دل کھول کر مظاہرہ کیا ہے، اور مسجد کا کوئی حصہ اپنی دستبرد سے سلامت نہیں چھوڑا۔

لے دے کر مسجد کی محراب اور اس کے سامنے دو تین چھوٹی سی صفوں کی جگہ رسی باندھ کر الگ کر لی گئی ہے، شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ حصہ مسجد کی یادگار کے طور پر باقی رکھا جائے۔ اس حسین اور پرکار محراب کے اوپر گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں اور اس کا خوب صورت چہرہ ستم ہائے زمانہ سے کملایا ہوا ہے، اسی کے قریب وہ منبر بھی ہے جس سے کبھی قاضی منذر بن سعید جیسے خطیب کی آتش نوا تقریریں فضا میں بکھرا کرتی تھیں، یہ مسجد کا وہ حصہ ہے جہاں یقیناً علامہ قرطبیؒ، علامہ ابن رشدؒ، اور حافظ ابن عبد البرؒ جیسے لوگوں نے نمازیں پڑھی ہوں گی، عیسائیوں کی ہزار ستم رانیوں کے باوجود اس فضا میں ان انفاس قدسیہ کے اذکار کی مہک محسوس

ہوئے بغیر نہیں رہتی، لیکن

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

عصر کا وقت ہو چکا تھا اور ہم ہوٹل سے یہی نیت لے کر چلے تھے کہ نماز عصر مسجد قرطبہ میں ادا کریں گے۔ نہ جانے کس نے یہ بے بنیاد بات ہم سے کہی تھی کہ مسجد قرطبہ کو نمازیوں کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع بالکل غلط تھی، اور یہاں باقاعدہ نماز پڑھنے کی اب بھی اجازت نہیں ہے۔ اکا دکا سیاح آ کر نماز پڑھ لیں تو بات دوسری ہے۔ چنانچہ میرے دوست اور رفیق سعید صاحب نے یہاں اذان کہی۔ حی علی الصلوۃ کی اس دلآویز پکار کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، چنانچہ ہم دونوں نے محراب کے قریب کھڑے ہو کر نماز عصر ادا کی۔ اس مسجد کے فرش پر سجدہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے آٹھ صدیوں کا فاصلہ یک لخت سمٹ گیا ہے، اور ہم وقت کی اس تاریک سرنگ سے نکل کر اس کھلی فضا میں پہنچ گئے ہیں جہاں چاروں طرف توحید کا نور بکھرا ہوا ہے، اور یہ فضائے بسیط خدائے وحدہ لاشریک کی حمد و ثناء کے زمزموں سے لبریز ہے۔ سبحان ربی الاعلی کی معنویت یہاں اور زیادہ واضح ہوئی۔ میرے پروردگار کی شان کبریائی عروج و زوال کی اس دھوپ چھاؤں سے کہیں بلند و بالا ہے۔ وہ اس وقت بھی ''اعلیٰ'' تھا۔ جب یہاں سجدے کرنے والی جبینوں سے یہ وسیع و عریض مسجد تنگ پڑ گئی تھی اور اس وقت بھی ''اعلیٰ'' ہے جب حی علی الصلوۃ کی آواز پر کوئی ایک قدم بھی محراب کی طرف نہیں اٹھا، اس کی توحید کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں ہوں، یا انگلی پر گن لئے جائیں، اس کے دین کو سینے میں بسانے والے دنیا پر اپنے جاہ و جلال کا سکہ بٹھائیں، یا اپنے اعمال کے ہاتھوں مغلوب و مقہور ہو جائیں، اس کی شان احدیت اور صمدیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لاالہ الا اللہ

دور دور تک پھیلی ہوئی اس مسجد میں اس محراب کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں قلب و

نظر کو سکون مل سکے۔ مسجد کے باقی ماندہ تمام حصے عیسائی تصرفات سے زخمی تھے، اور انہیں دیکھ کر دل وجگر بھی زخمی، ہم تھوڑی دیر محراب کے آس پاس رہے، پھر حسرت بھری نگاہوں سے مسجد کے ان ستونوں کو دیکھتے رہے جن کے سائے میں کبھی ذکر وفکر اور کبھی علم وفضل کی محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں، جہاں انسانیت کو تہذیب وشرافت کا درس دیا جاتا تھا، جہاں علم وادب کی شمعیں روشن ہوتی تھیں، اور جہاں انسانوں کے سر پر فضیلت وتقویٰ کا تاج رکھا جاتا تھا، یہ ستون ان محفلوں کو ضرور یاد کرتے ہوں گے، ان کا وجود مسلمانوں کی غیرت وحمیت کے لئے ایک سراپا فریاد ہے، ایسی دردناک فریاد جو یہاں آکر آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے، کانوں سے سنی نہیں جاسکتی۔

اس مسجد میں اس وقت ہم دو مسلمان تھے، اور دونوں خاموش۔ تھوڑی دیر بعد سعید صاحب نے جو دیر سے اس پر اثر منظر سے متاثر تھے، سکوت توڑا، اور مجھ سے کہا:

"تقی صاحب! یہاں سے جلدی چلیئے، یہاں تو دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ گھٹن جگہ کی تنگی اور تاریکی سے پیدا نہیں ہوئی تھی، یہ وہ گھٹن تھی جس کا علاج نہ ان کے بس میں تھا نہ میرے بس میں۔ ہم آہستہ آہستہ مسجد کی دوسری طرف سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ دل پر ابھی ایک چوٹ اور لگنی باقی تھی۔ اسی دروازے کے اندرونی حصے میں ایک سازندہ دیر سے اپنا ستار اور ہارمونیم ٹھیک کرنے میں مشغول تھا ہم اس کے پاس پہنچے تو اس نے موسیقی کی تانیں اڑانی شروع کردیں۔ دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ یا اللہ! ایسی بے بسی کے عالم میں کسی مسجد کی زیارت آئندہ نہ کرائیے۔

میں نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے تاریخی مقامات دیکھے ہیں، بہت سے عبرت کدوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، لیکن دل ودماغ پر جو حسرت ناک تاثر جامع قرطبہ کو دیکھ کر ہوا، وہ کسی اور تاریخی مقام کو دیکھ کر نہیں ہوا۔ اور اب سمجھ میں آیا کہ اقبال مرحوم نے مسجد قرطبہ میں جو طویل نظم کہی ہے وہ تاثر کے کس عالم میں کہی ہے ؎

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات

سلسلہ روز وشب اصل حیات و ممات

سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلہ روز و شب صیرفی کائنات

وادی الکبیر اور اس کا پل

مسجد سے باہر نکلے تو بادلوں کے ترشح سے زمین نم تھی، ہم جامع قرطبہ کی دیوار قبلہ کی طرف آگے بڑھے تو تھوڑی دور چل کر شہر پناہ کا ایک پرانا دروازہ نظر آیا۔ یہ باب القنطرہ تھا جو مسلمانوں کے عہد میں جنوب کی سمت سے شہر میں داخل ہونے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے زمانے کا دروازہ اب باقی نہیں ہے۔ یہ دروازہ ایک عیسائی معمار کا بنایا ہوا ہے۔اس دروازے کے سامنے شرقاً غرباً ایک سڑک جارہی ہے، سڑک کو پار کرتے ہی سامنے قرطبہ کا مشہور دریا وادی الکبیر بہہ رہا ہے۔ دوپہر کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے بھی ایک جدید پل سے ہم نے بذریعہ کار یہ دریا عبور کیا تھا، میرا اندازہ تھا کہ یہ دریا ''وادی الکبیر'' ہوگا کیونکہ قرطبہ کے تذکروں میں اسی دریا کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ پھر جب دریا کے ایک کنارے ایک بورڈ پر Guadal Quinur لکھا ہوا دیکھا تو یقین ہوگیا کہ یہ نام ''وادی الکبیر'' ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

شہر قرطبہ قدیم زمانے میں اس دریا کے شمالی سرے پر آباد تھا، اور جنوب کی طرف سے دریا عبور کرتے ہی شہر پناہ شروع ہوجاتی تھی جس کے اندر شاہی محلات واقع تھے۔

پہلی صدی ہجری میں جب طارق بن زیاد وادی لکہ کے معرکے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اپنے لشکر کے مختلف حصے اندلس کے مختلف شہروں کی طرف روانہ کردیئے تھے۔ چنانچہ قرطبہ کو فتح کرنے کی مہم خلیفہ ولید بن عبدالملک کے آزاد کردہ غلام مغیث رومی کے سپرد ہوئی تھی۔ مغیث رومی جنوب کی طرف سے آئے، اور وادی الکبیر سے ذرا پہلے شقندہ کے مقام پر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ قرطبہ کو فتح کرنے کے لئے پہلے دریا کو عبور کرنا اور اس کے بعد

قرطبہ کی مضبوط اور بلند فصیل پر قبضہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن اللہ کے راستے میں نکلنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد ساتھ تھی۔ مغیث کے جاسوسوں نے شقندہ کے قریب ایک چرواہے کو روک کر اس سے پوچھ گچھ کی۔ چرواہے نے بتایا کہ قرطبہ کے رؤسا جنگ کے خوف سے پہلے ہی طلیطلہ کی طرف فرار ہو چکے ہیں، اور شہر کی حفاظت کے لئے فوج بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے چرواہے سے قرطبہ کی فصیل کے بارے میں معلومات کیں تو چرواہے نے بتایا کہ فصیل تو بڑی مستحکم ہے، البتہ اس کے ایک حصے میں ایک شگاف پڑا ہوا ہے۔ جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

رات کے وقت مغیث نے قرطبہ کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا تو ایک غیبی امداد کے طور پر آسمان سے بارش شروع ہوگئی، اور بارش کی آواز میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز دب کر رہ گئی، یہاں تک کہ مسلمانوں کے لشکر نے اطمینان سے وادی الکبیر کا پل عبور کر لیا۔ بارش اور سردی کی وجہ سے فصیل کے محافظ بھی فصیل سے ہٹ کر اپنی چوکیوں میں پناہ لے چکے تھے، اور فصیل خالی پڑی تھی۔

چرواہے نے جس شگاف کی نشان دہی کی تھی، وہ واقعتاً موجود تھا لیکن وہ اتنی بلندی پر تھا کہ اس تک پہنچنا بھی آسان نہ تھا، لیکن ایک سرفروش مجاہد ایک انجیر کے درخت کا سہارا لے کر اس شگاف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مغیث نے اپنا عمامہ اتار کر اس کا ایک سرا اس کے ہاتھوں کی طرف پھینک دیا، اور اس طرح یہ عمامہ مسلمانوں کے لئے کمند کا کام دینے لگا۔ اور یکے بعد دیگرے کئی سپاہی شگاف تک پہنچ گئے۔ انہوں نے مل کر فصیل کے اندر چھلانگ لگائی اور قریبی پہرے داروں پر حملہ کر کے انہیں قابو کر لیا، اور شہر کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس طرح یہ شہر کسی موثر مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔[1]

ہمارے سامنے وادی الکبیر کا وہی کنارہ تھا جہاں تیرہ سو سال پہلے یہ انقلابی معرکہ پیش آیا تھا۔ سڑک پار کر کے ہم دریا کے کنارے پہنچے تو یہاں سے ایک قدیم اور بوسیدہ پل جنوب کی طرف جا رہا تھا۔

---

[1] نفح الطیب للمقری ص ۲۴۵ ج ا

آج یہ ایک عام قسم کا پل معلوم ہوتا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے خستہ حالت میں نظر آتا ہے۔ لیکن کسی وقت یہ ساری دنیا کا سب سے عظیم الشان پل سمجھا جاتا تھا اور چونکہ دنیا بھر میں اتنا پختہ، اتنا وسیع اور اتنا مضبوط پل کوئی اور نہ تھا، اس لئے یہ دنیا کے عجائب میں شمار ہوتا تھا۔ مسلمانوں سے پہلے یہاں ایک معمولی سا کمزور پل تھا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو انہوں نے دمشق میں بیٹھ کر قرطبہ کی ضروریات کا اندازہ لگایا، اور اندلس کے گورنر سمح بن مالک خولانی کو حکم دیا کہ وہ وادی الکبیر پر ایک مستحکم پل تعمیر کریں۔ چنانچہ ۱۰۱ھ میں ایک ماہر تعمیرات عبدالرحمٰن بن عبید اللہ الغافقی کی نگرانی میں یہ عالیشان پل تعمیر کیا گیا جس کا طول آٹھ سو ہاتھ اور چوڑائی چالیس گز سے زیادہ تھی، اور یہ دریا کی سطح سے ساٹھ ہاتھ بلند تھا۔ اس کے نیچے اٹھارہ خوبصورت در تعمیر کئے گئے تھے، اور اس کے اوپر انیس برج بنائے گئے تھے۔ اس وقت دنیا بھر میں اس پل کی کوئی نظیر نہیں تھی، اس لئے اس دور کا ایک مورخ لکھتا ہے:

ان قنطرة قرطبة احدى اعاجيب الدنيا

قرطبہ کا پل دنیا کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے۔

اس پل کی توسیع اور مرمت بار بار ہوتی رہی ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ اب بھی وہی پل ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا۔ زمانے کے انقلابات اور بوسیدگی نے اس کی شکل وصورت بگاڑ دی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سالہا سال سے کسی نے اس کی حالت زار کی طرف توجہ نہیں دی، لیکن اس کے مضبوط آثار اس کے عہد شباب کی داستان سنا رہے ہیں۔

پل کے اوپر کھڑے ہو کر دونوں طرف دریا بہتا نظر آتا ہے، لیکن سردی کی وجہ سے اس کا بہاؤ سست تھا، اور جگہ جگہ اگی ہوئی خودرو جھاڑیوں نے اس کے تسلسل اور روانی میں رکاوٹ پیدا کی ہوئی تھی، دریا کے کنارے کچھ پرانی عمارتوں کے کھنڈر بھی نظر آتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ پن چکیاں تھیں جو مسلمانوں نے تعمیر کی تھیں، اور اندلس کے مسلمانوں کی خاص صنعت سمجھی جاتی تھی۔

ہم اس پل پر چلتے ہوئے اس کے جنوبی کنارے پر پہنچے تو وہاں ایک اور قدیم قلعہ کا

دروازہ نظر آیا۔ یہ ایک بہت پرانا قلعہ ہے جو رومانی دور میں تعمیر ہوا تھا، اور ''کالی گورس'' (Caliguris) کہلاتا تھا۔ مسلمانوں کے دور میں یہ ''قلہرہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اور اب اسے ''کالا ہورا'' (Calahorra) کہتے ہیں۔ اب اس قلعے کا بہت چھوٹا سا حصہ باقی رہ گیا ہے جس میں ایک سرکاری دفتر قائم ہے، باقی حصہ سڑکوں میں آ گیا ہے۔

مدینۃ الزہرا میں

وادی الکبیر کے پل ہی پر کھڑے ہوکر ہم نے ایک ٹیکسی روکی، اور اس میں سوار ہوکر اسے ''مدینۃ الزھرا'' چلنے کے لئے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور شروع میں ہماری بات نہ سمجھ سکا۔ ہمارے مختصر سے انگریزی جملوں کے جواب میں وہ اسپینی زبان کی تقریر شروع کر دیتا جو ہمارے پلے نہ پڑتی۔ بالآخر میں نے قرطبہ کی سیاحت کے بارے میں ایک کتابچہ نکالا جس میں ''مدینۃ الزھرا'' کی تصویر بنی ہوئی تھی، وہ تصویر اسے دکھائی تو وہ فوراً ہمارا مطلب سمجھ گیا، اور پھر اس جگہ کی تعریف اور تعارف میں اسپینی زبان کے ساتھ دو چار انگریزی الفاظ فٹ کر کے اس اعتماد کے ساتھ بولتا چلا گیا جیسے ہم اس کی ہر بات سمجھ رہے ہیں۔ اس کی یہ خوش گمانی ہمارے ان انگریزی جملوں سے دور ہوئی جو ہم نے اس کے جواب میں بولے، اس کے بعد اس نے خاموشی میں عافیت سمجھ کر چپ سادھ لی۔

''مدینۃ الزھرا'' شہر قرطبہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے، چنانچہ کار قرطبہ کی مختلف سڑکوں اور محلوں سے گزرتی رہی۔ اب قرطبہ ایک جدید شہر ہے جو پرانی عمارتوں کو بالکل ادھیڑ کر از سرنو بنا دیا گیا ہے، اس لئے اس میں اب جامع قرطبہ اور اس کے آس پاس کے چند آثار کے سوا مسلمانوں کے عہد کی کوئی اور یادگار باقی نہیں ہے، البتہ سڑکوں اور محلوں کے بہت سے نام اب بھی ایسے ہیں کہ ان کی تھوڑی سی کرید کی جائے تو ان کی عربی اصل دریافت ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی شہر سے باہر نکل آئی۔ اور ایک ایسے میدانی علاقے سے گزرنے لگی جس کے دونوں طرف سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ اور بالآخر اسی سڑک پر ایک جگہ ''مدینۃ الزھرا'' کا بورڈ نظر آیا جو دائیں طرف اشارہ کر رہا تھا، گاڑی دائیں طرف مڑ کر ایک سڑک پر

آ گئی، اور بائیں جانب بنی ہوئی ایک پرانے طرز کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ مدینۃ الزھرا کی فصیل تھی۔تقریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد میدانی علاقہ ختم ہو گیا اور سڑک بائیں طرف گھوم کر ایک سرسبز پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ پہاڑ کے تقریباً بیچ میں پہنچ کر ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی، اور ہمیں بتایا کہ مدینۃ الزھرا میں داخلے کا راستہ یہی ہے۔ہم ٹیکسی سے اترے تو سڑک کے مشرقی جانب پہاڑ نظر آ رہا تھا، اور مغربی جانب دور تک پھیلی ہوئی وادی تھی جس میں مدینۃ الزھرا کے کھنڈر نظر آ رہے تھے۔

''مدینۃ الزھرا'' ایک چھوٹا سا شاہی شہر تھا جو خلفائے قرطبہ اور ان کے متعلقین کی رہائش کے لئے بنایا گیا تھا۔اس شہر کی تعمیر کی ابتداء ۳۲۵ھ میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے کی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی ایک کنیز بہت سا ترکہ چھوڑ کر مر گئی تھی۔خلیفہ نے حکم دیا کہ اس ترکے کی رقم ان مسلمان جنگی قیدیوں کی رہائی میں خرچ کی جائے جو عیسائیوں کے پاس قید ہیں۔ جب تحقیق کی گئی تو عیسائیوں کی قید میں بہت کم مسلمان قیدی دریافت ہوئے، اور ان کو رہا کرانے کے باوجود اس دولت کا بہت بڑا حصہ باقی رہ گیا۔اس موقع پر خلیفہ کی ملکہ ''زہرا'' نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے نام پر ایک شاندار شہر تعمیر کیا جائے۔خلیفہ ناصر نے اس کی خواہش کی تکمیل میں ''مدینۃ الزھرا'' کی تعمیر شروع کر دی۔

''مدینۃ الزھرا'' کے اکثر حصے کی تعمیر پچیس سال میں خلیفہ ناصر ہی کے عہد حکومت میں مکمل ہو گئی تھی، لیکن اس کی بہت سی عمارتیں بعد میں خلیفہ الحکم ثانی کے زمانے میں بنیں۔ اس وقت اس شہر کا طول شرقاً غرباً ۲۷۰۰ ذراع اور عرض شمالاً جنوباً ۱۵۰۰ ذراع تھا۔

''مدینۃ الزھرا'' شاہی محلات، درباروں، مجلسوں، جامع مسجد اور شاہی خاندان کے رہائشی خاندان کے رہائشی مکانوں پر مشتمل تھا، اور اپنے وقت میں دنیا کا سب سے حسین شہر سمجھا جاتا تھا۔

ہم جس پہاڑ پر کھڑے تھے، غالباً یہی وہ ''جبل العروس'' تھا جس کے بارے میں تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا تھا کہ جب ''مدینۃ الزھرا'' کی تعمیر مکمل ہوئی، اور ملکہ زہرا اس کے معائنے کے لئے خلیفہ ناصر کے ساتھ آئیں تو انہوں نے تعمیرات کو تو بیحد پسند کیا، لیکن ان تعمیرات کے

ایک جانب ایک سیاہ بدنما پہاڑ نظر آیا تو خلیفہ سے کہا کہ ''کیا یہ حسین وجمیل کنیز اس حبشی کی گود میں رہے گی؟'' خلیفہ ناصر نے اس کے بعد اس پہاڑ سے بے ہنگم درختوں کو اکھاڑ کر جگہ جگہ میوہ دار درختوں کے باغ لگا دیئے جن سے یہ پہاڑ ایک دلہن کی طرح حسین ہو گیا، اور اسی لئے اس کا نام ''جبل العروس'' رکھ دیا گیا۔

''مدینۃ الزہرا'' کا قصر شاہی اپنے حسن و جمال، شان و شوکت اور شکوہ و جلال کے اعتبار سے دنیا بھر میں اپنی مثال آپ تھا، اور ایشیاء اور یورپ کے بڑے بڑے ملکوں کی سفارتیں بعض اوقات صرف اسے دیکھنے کے لیے آیا کرتی تھیں، اس محل کا ایک ایوان ''قصر الخلفاء'' کہلاتا تھا، اس کی چھت اور دیواریں سونے اور شفاف مرمر کی تھیں۔ بیچ میں چھت سے وہ جوہر عجیب لٹکا ہوا تھا جو قسطنطنیہ کے بادشاہ لیو نے خلیفہ ناصر کو تحفے میں بھیجا تھا۔ اس ایوان کے بالکل بیچ میں ایک خوبصورت حوض تھا جس میں پارہ بھرا رہتا تھا۔ اور ایوان کے ہر ضلع میں آٹھ آٹھ محرابوں والے در تھے۔ محرابیں رنگ برنگ کے سنگین اور بلوریں ستونوں پر قائم تھیں اور کواڑ آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے۔ جن پر سنہرا کام کر کے اس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جب دھوپ اس ایوان کے اندر آتی تو چھت اور دیواریں اس طرح چمکنے لگتیں کہ دیکھنے والوں کی نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔ جب خلیفہ ناصر اس کمرے میں ہوتے، اور حاضرین پر رعب طاری کرنا مقصود ہوتا تو اپنے کسی غلام کو اشارہ کر دیتے کہ حوض میں جو پارہ بھرا ہوا ہے، اس کو ہلا دے۔ پارے کے ہلنے سے دھوپ کی شعاعیں بجلی کی طرح پورے کمرے میں کوندنے لگتیں، اور بالکل ایسا محسوس ہوتا جیسے پورا کمرہ گردش کر رہا ہے۔ بعض غیر ملکی سفراء جو ایوان کے اس راز سے واقف نہ ہوتے، اس منظر کو دیکھ کر رعب سے کانپنے لگتے تھے[1]

''مدینۃ الزہرا'' اس طرح کے خدا جانے کتنے عجائب پر مشتمل تھا، اس میں مصنوعی دریا بھی بنائے گئے تھے، اور جانوروں کے باغ بھی جن میں وہ اپنے قدرتی ماحول کے ساتھ رہتے تھے، اور آج کی دنیا میں جانوروں کے محفوظ باغ (Game Reserve) بنانے کا جو دستور نکلا ہے، اس کی ابتدا ''مدینۃ الزہرا'' ہی سے ہوئی تھی۔

---

[1] نفح الطیب ص ۶۵ تا ۶۸ ج ۲

بظاہر وہ زمانہ جس میں ''مدینۃ الزہرا'' تعمیر کیا گیا، اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا، اور اس جنت ارضی کو دیکھ کر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں لرزہ براندام ہو جایا کرتی تھیں، لیکن اگر حقیقت شناس نگاہ سے دیکھا جائے تو اندلس میں مسلمانوں کے زوال کا آغاز انہی عشرت کدوں کی تعمیر سے ہوا جنہوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں سے ان کا زہد، ان کی جفاکشی اور ان کی بے تکلف زندگی کی قوت چھین لی۔

جس وقت دنیا کا یہ عظیم شاہی محل تعمیر ہو رہا تھا، اس وقت کے صاحب دل علماء نے خلیفہ کو اس پہلو کی طرف متوجہ کرنے کا فرض کس طرح ادا کیا؟ اس کے بھی عجیب واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔ اس وقت شاہی مسجد کے خطیب اور امام قاضی منذر بن سعیدؒ تھے جن کے فصیح و بلیغ خطبوں کو اندلس کے عربی ادب کا بہت بڑا خزانہ سمجھا جاتا ہے۔ جب خلیفہ ناصر ان کے پیچھے نماز پڑھنے آتا تو وہ اپنی تقریروں میں دنیا طلبی کے انہماک اور عیش و عشرت پر کی جانے والی فضول خرچیوں پر دل کھول کر تنقید کرتے تھے۔

ابھی جس ایوان کا ذکر اوپر آیا ہے کہ اس کی چھتیں اور دیواریں سونے اور مرمر سے بنائی گئی تھیں، ایک مرتبہ خلیفہ ناصر اس ایوان میں بیٹھا ہوا اپنے مصاحبوں سے کہہ رہا تھا کہ ''دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ نے بھی تعمیر کی تاریخ میں ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جیسا میرے ہاتھوں اس ایوان کی تعمیر سے ظاہر ہوا؟'' بادشاہوں کی مجلسیں خوشامدی درباریوں سے ہمیشہ آباد رہی ہیں، انہوں نے جواب میں بڑے جوش و خروش سے خلیفہ کی تائید کی، اور اس کی تعریف میں زمین و آسمان کی قلابیں ملانی شروع کر دیں۔ اتنے میں قاضی منذر بن سعیدؒ بھی تشریف لے آئے۔ خلیفہ ناصر نے ان کے سامنے بھی اس ایوان کی زرنگار تعمیر اور اس کی سونے کی چھت کو اپنا قابل فخر کارنامہ قرار دیا۔ اس پر قاضی منذر نے فرمایا: ''امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل و کرم سے بہت نوازا ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس فضل و کرم کو چھوڑ کر کسی ایسی بات پر فخر کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے بیان فرمائی ہے۔''

خلیفہ ناصر نے کہا ''وہ کیسے؟''

اس کے جواب میں قاضی منذر نے قرآن کریم کی یہ آیات تلاوت فرمائیں:

"و لو لا ان يكون الناس امة واحدة لجعلنا لمن يكفربالرحمن لبيوتهم سقفا من فضة و معارج عليها يظهرون و لبيوتهم ابواباوسررا عليها يتكئون، وزخرفا و ان كل ذلک لما متاع الحيوة الدنيا، والاخرة عندربک للمتقين." (زخرف: ۳۳ تا ۳۵)

"اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہو جائیں، تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے، اور زینے بھی جن پر سے وہ چڑھا کرتے، اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں، اور سونے کی بھی، اور یہ سب کچھ بھی نہیں، صرف دینوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے، اور آخرت آپ کے رب کے ہاں خدا ترسوں کے لیے ہے۔"

خلیفہ ناصر نے یہ آیات سنیں تو سر جھکا لیا، قاضی منذر نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور مؤثر انداز میں خلیفہ کو نصیحت کی، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور بعد میں اس نے ایوان کی چھت سے سونا چاندی اتروا دیا۔[1]

قاضی منذر بن سعید ہی نے "مدینۃ الزہرا" کے بارے میں یہ شعر بھی کہے تھے، اور خلیفہ کو بھی سنائے تھے:

یابانی الزهراء مستغرقا	اوقاته فيها اما تمهل
له ما احسنها رونقا	لو لم تكن زهرتها تذبل

"اے زہرا کے بانی جس نے اپنے اوقات اس شہر میں غرق کر رکھے ہیں، کیا تم ٹھہر کر سوچتے نہیں؟ مدینۃ الزہرا کی رونق کتنی حسین ہے بشرطیکہ یہ پھول مرجھانے والا نہ ہوتا۔"

---

[1] نفح الطیب ص ۱۰۹ ج ۲

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی منذر اس عشرت کدے کا انجام آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، یہ عظیم الشان شہر جس کی تکمیل میں چالیس سال لگے تھے تکمیل کے بعد صرف ۳۵ سال اپنی بہار دکھا سکا، ۳۹۸ھ سے ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اسی خانہ جنگی کے دوران ''مدینۃ الزھرا'' ایسا تباہ ہوا کہ اس کا تمام تر شکوہ وجلال آن کی آن میں خاک کا ڈھیر بن گیا۔ ۴۳۵ھ میں اندلس کے ایک وزیر ابوالحزم وہاں سے گزرے تو دیکھا کہ جو مدینۃ الزھرا کبھی بادشاہوں اور شہزادوں کا مسکن تھا، اب وہاں جنگل کے چرند پرند کا بسیرا ہے۔ یہ عبرتناک منظر دیکھ کر انہوں نے یہ مشہور شعر کہے

قلت یوما لدار قوم تفانو!
این سکانک العزاز علینا؟
فاجابت ھنا اقاموا قلیلا
ثم ساروا ولست اعلم اینا؟''

''میں نے ایک دن ان لوگوں کے گھر سے کہا جو فنا ہو چکے تھے۔''
''تمہارے وہ مکین کہاں ہیں جو ہمیں بہت عزیز تھے؟''
''اس نے جواب دیا وہ یہاں کچھ دیر کو ٹھہرے تھے''
''پھر چلے گئے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں؟''

ہم جبل العروس کے بیچوں بیچ کھڑے تھے، سامنے محکمہ آثار قدیمہ کا ایک دفتر بنا ہوا تھا اور اس کے پیچھے وادی کی ڈھلان پر دور تک ''مدینۃ الزھرا'' کے کھنڈر نظر آرہے تھے، ۱۹۱۰ء تک مدینۃ الزھرا کا کوئی نام ونشان یہاں باقی نہ رہا تھا لیکن ۱۹۱۰ء میں اس پہاڑ کے دامن میں ماہرین آثار قدیمہ کو کچھ نشانات ایسے دریافت ہوئے جن کی بنیاد پر انہوں نے یہاں کھدائی شروع کی، اور اس طرح اس عالی شان شہر کے یہ آثار دریافت ہوگئے، ۱۹۱۰ء سے آج تک کھدائی کا کام مسلسل جاری ہے۔ اور اسی (۸۰) سال کی اس مدت میں شہر کے بہت سے حصے برآمد ہوگئے ہیں۔ ہم ان کھنڈرات کے مختلف حصوں میں حسرت وعبرت کے یہ نمونے دیکھتے رہے۔ جن کے بارے میں اب یہ معلوم کرنا بھی دشوار ہے کہ وہ اصل میں کیا تھے؟ اس پوری

کھدائی کے دوران قصر شاہی کا صرف ایک ایوان بڑی حد تک اصلی حالت میں برآمد ہوا ہے جو ''مجلس المونس'' کہلاتا تھا۔ اسپین کی حکومت نے اس ایوان کو از سر نو اپنی اصلی حالت میں تعمیر کرنا شروع کیا ہے، اس ایوان کی محرابوں، چھتوں اور فرش کے ٹوٹے ہوئے پتھر کھنڈرات میں بری طرح بکھرے ہوئے پائے گئے تھے اب ان پتھروں کو جوڑ جوڑ کر دوبارہ ان کی جگہ پر فٹ کرنے کا کام بڑی دیدہ ریزی سے انجام دیا جارہا ہے، اور اس کے نتیجے میں ''مجلس المونس'' کا ہال کافی حد تک اپنی اصل صورت میں نظر آنے لگا ہے۔

اس ہال کے باہر ایک برآمدہ ہے جس میں کھڑے ہو کر وادی میں دور تک پھیلے ہوئے کھنڈر نظر آتے ہیں، اور ان کے پیچھے حد نگاہ تک سبزہ زار پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موسم، فضا، آب و ہوا اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اس جگہ کا انتخاب کتنی خوش ذوقی سے کیا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اندلس کی تعریف میں یہاں کے ایک ادیب کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ اسے حاکم وقت نے اندلس چھوڑنے کا حکم دیدیا تھا، اس حکم پر نظر ثانی کیلئے اس ادیب نے حاکم کے نام ایک پر اثر خط لکھا جس کے بعد حاکم نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اس نے خط کو ان الفاظ سے شروع کیا تھا:

''یاسیدی کیف افارق الاندلس وھی جنة الدنیا ، افق صقیل و بسا ط مدبج، و ھواء سائح، وماء متدفق، وطائر مترنم............''

''جناب والا! میں اندلس کو کیسے چھوڑ جاؤں؟ یہ تو دنیا کی جنت ہے، یہ صیقل شدہ افق، یہ منقش بساط زمین، یہ جھومتی ہوئی ہوا، یہ اچھلتا ہوا پانی، یہ ترنم ریز پرندے۔''

یہاں سے جو منظر نگاہوں کے سامنے تھا، اس کے بارے میں یہ سارے جملے واقعی صادق آرہے تھے۔

مدینۃ الزھرا'' کی کھدائی پوری ماہرانہ احتیاط کے ساتھ اب بھی جاری ہے، لیکن جتنا حصہ اس کھدائی کے نتیجے میں برآمد ہو چکا ہے، اس کا رقبہ بھی کافی طویل ہے، اور اسے دیکھنے

کیلئے خاصا وقت درکار ہے، ہم تھوڑی دیر اس عبرت کدے کی سیر کرتے رہے، لیکن مغرب کا وقت قریب تھا، اس لئے جلد ہی واپس ہوٹل کے لئے روانہ ہوگئے۔

رات کو عشاء کی نماز اور کھانے کے بعد ہم ہوٹل سے چہل قدمی کے لئے باہر نکلے، موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی، اور قرطبہ کی کشادہ سڑکوں اور خوب صورت عمارتوں کے درمیان یہ سیر بڑی پر لطف رہی۔ غرناطہ کی طرح یہاں شہر کے وسطی علاقے میں پرانے دور کی کوئی یادگار نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا شہر از سر نو نئی منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا گیا ہے، اور اس میں یورپ کے جدید شہروں کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔

وہ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب تھی، اور شاید شہر میں کسی جگہ کوئی جشن بھی منایا جارہا تھا، اس لئے سڑکوں پر چہل پہل سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قرطبہ کے تمام باشندے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ خیال آیا کہ ان لوگوں میں نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جو نسلی اعتبار سے عرب ہوں، اور ان کے آباؤ اجداد مسلمان رہے ہوں۔ عیسائی تسلط کے بعد جس بڑے پیمانے پر لوگوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اس کے نتیجے میں ہزار ہا مسلمان عیسائی آبادی میں پوری طرح ضم ہوگئے تھے۔ اس لئے اسپین کے موجودہ باشندوں میں یقیناً مسلمان نسل کے بیشمار لوگ ہیں۔ اب ان کے وجود اور سراپا میں کوئی اسلامی خصوصیت تو باقی نہیں رہی، البتہ ان کی بعض صفات اور عادتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی پرانے زمانے کی یادگار چلی آتی ہیں۔ اس علاقے سے مسلم اقتدار کے زوال کو صدیاں گزر چکیں، تاریخ کے انقلابات نے دنیا بدل ڈالی لیکن یہ چند صفات ابھی تک ان کے عہد ماضی کی خفیف سی یادگار کے طور پر محفوظ ہیں۔

اول تو اسپین کے باشندوں کے خدوخال یورپ کے دوسرے علاقوں سے قدرے مختلف ہیں، ان کے گورے رنگ میں گندمی آمیزش اور چہروں کی تیکھی بناوٹ ان کی عربی اصل کی یاد دلاتی ہے اور ان میں یورپ کے دوسرے خطوں کے برخلاف زیادہ بشاشت، تواضع اور ظرافت پائی جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے ملتے وقت تپاک اور گرمجوشی کا انداز بالکل عربوں جیسا ہے، بلکہ ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو لفظ ان کی زبان پر آتا ہے وہ ''اولا'' (Ola) ہے، اور غالباً یہ عربی زبان کے لفظ ''اھلا'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

اسی طرح اسپین کے لوگوں میں معانقے اور ایک دوسرے کو بوسہ دینے کا عربی طریقہ اب تک چلا آتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا دستور یہاں ابھی تک رائج ہے جو یورپ کے کسی اور علاقے میں نظر سے نہیں گزرا، چنانچہ بڑے ہوٹلوں کے مطعم میں بھی عموماً ہاتھ دھونے کا انتظام ہوتا ہے۔ اور بظاہر یہ بھی اس اسلامی تہذیب کی ایک دھندلی سی یادگار ہے جس نے کبھی اس علاقے کو اپنی برکات سے نہال کیا ہوا تھا۔

اسپینی زبان پر بھی عربی زبان کے بہت سے اثرات ہیں۔ اس زبان کے بہت سے الفاظ عربی الاصل ہیں جنہیں معمولی تصرف کے بعد اسپینی بنالیا گیا ہے۔ مثلاً پل کو عربی ''قنطرہ'' کہتے ہیں، اسپینی زبان میں اس کا نام Alcantara ہے۔ چینی کو عربی میں سکر کہتے ہیں، اسپینی میں Azucar ارز (چاول) کو اسپینی میں Arroz کہا جاتا ہے۔ القریہ (گاؤں) کو Alquria کہا جاتا ہے۔ قائد کو اب بھی Al- Caide اور ''امین'' کو Al-Amin کہتے ہیں۔ غرض زبان پر عربی اثرات اب بھی خاصے نمایاں ہیں، اور اسپینی زبان کا ہر وہ لفظ جو Al سے شروع ہوتا ہے، وہ یقیناً عربی الاصل ہے۔

مالقہ میں

اگلی صبح آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا، اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، اسی روز مالقہ سے دو بجے سہ پہر کے جہاز میں پیرس کے لئے ہماری سیٹ بک تھی، جس کے لئے ایک بجے تک ایئرپورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ اور مالقہ یہاں سے تقریباً دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ بارش کی وجہ سے پہنچنے میں تاخیر کا بھی امکان تھا، اس لئے ہم ناشتہ کے بعد جلد ہی مالقہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اتوار کا دن تھا، اس لئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھٹی منا رہے تھے، اور سڑکیں ٹریفک کے ہجوم سے خالی تھیں۔ قرطبہ سے نکلنے کے بعد بارش بھی بند ہوگئی، اور کار صاف شفاف سڑک پر تیرتی چلی گئی۔ راستے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیاں اور شہر آتے رہے، مگر سب چھٹی کی وجہ سے سنسان تھے۔ مالقہ سے تقریباً بیس پچیس میل پہلے ایک خوب صورت

پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ اندلس کے مشہور کہسار ''البشارات'' (Al-Puxarras) کا سلسلہ تھا جو غرناطہ کے جنوب میں بحر متوسط کے ساتھ ساتھ المریہ تک چلا گیا ہے، اور کبھی اندلس کا حسین ترین خطہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں ابو عبداللہ غرناطہ کے تخت سے محروم ہونے کے بعد کچھ عرصے تک مقیم رہا۔ اور جب اسے وہاں سے بھی جلاوطنی اختیار کرنی پڑی تو یہاں کے مسلمانوں نے ایک عرصے تک عیسائی حکومت کے خلاف جنگ چھاپہ مار جاری رکھی، اور نویں صدی ہجری تک عیسائی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

یہ علاقہ قدرتی مناظر کے اعتبار سے اس قدر حسین ہے کہ ایک بلند پہاڑ کی چڑھائی طے کرنے کے بعد ہم سے رہا نہ گیا، اور ایک جگہ کار روک کر ہم باہر نکلے اور کچھ دیر تک سامنے پھیلی ہوئی خوبصورت وادی کے دل آویز منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہم مالقہ شہر میں داخل ہوئے۔ مالقہ اندلس کا مشہور قدیم شہر ہے جس کی تاریخ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بھی پہلے تک پہنچتی ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ ایک مستقل صوبے کا مرکزی شہر تھا، اور آج بھی صوبہ مالقہ (Malaga) کا دارالحکومت ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی یہ اندلس کی ایک اہم بندرگاہ اور تجارتی منڈی تھی، یہاں کی پیداوار میں انجیر اور انگور پورے اندلس میں مشہور تھے۔ مٹی کے سنہرے برتنوں کی صنعت مالقہ کی ممتاز ترین صنعت سمجھی جاتی تھی، اور آج بھی اس کی یہ صنعت ملک بھر میں مشہور ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت آٹھ سو سال قائم رہی۔ یہاں سے بڑے بڑے علماء بھی پیدا ہوئے جو ''مالقی'' کی نسبت سے مشہور ہیں۔

جب اندلس کے بڑے بڑے شہر اور صوبے عیسائی تسلط کا شکار ہو گئے اور صرف غرناطہ مسلمانوں کے پاس باقی رہ گیا تو اس وقت بھی مالقہ غرناطہ کی حکومت کے ماتحت رہا۔ لیکن آخر دور میں جب سلطان ابوالحسن غرناطہ کے تخت پر بیٹھے تو انہوں نے اپنے اقتدار میں کمی کر کے مالقہ کی حکومت اپنے بھائی الزغل کے حوالے کر دی، اور اسے ایک خودمختار ریاست قرار دیدیا۔ ابوالحسن اور الزغل دونوں بھائیوں نے مل کر عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے جارحانہ عزائم پر بند باندھنے کے لئے جہاد کا سلسلہ شروع کیا، اور ان کے خلاف متعدد کامیابیاں حاصل کیں جن

سے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا، اور قریب تھا کہ پورے اندلس میں عیسائی حکومت سے آزادی کی تحریک شروع ہو جائے لیکن اسی دوران ابوالحسن کے بیٹے ابوعبداللہ نے محلاتی سازشوں کے ذریعے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر کے اسے تخت سے اتار دیا، اور غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ابوالحسن اس موقع پر غرناطہ سے فرار ہو کر اپنے بھائی الزغل کے پاس آ گئے، اس واقعے نے غرناطہ اور مالقہ کے درمیان باہمی تعاون کے رشتے کاٹ دیئے، اور اسی باہمی افتراق کے نتیجے میں عیسائیوں نے مزید قوت حاصل کر لی، ابوالحسن اور الزغل دونوں بھائی ۸۸۸ھ سے ۸۹۱ھ تک عیسائیوں سے دست وگریبان رہے، یہاں تک کہ ۸۹۱ھ میں دونوں بھائی عیسائیوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں جان نہ رہی، اور قشتالہ کے عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ مالقہ پر قبضے کے بعد غرناطہ میں ابوعبداللہ کی حکومت بھی سات سال سے زائد قائم نہ رہ سکی، اور ۸۹۸ھ میں ابوعبداللہ نے غرناطہ بھی فرڈی ننڈ اور ازابیلا کے حوالے کر دیا۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں مالقہ ایک اہم شہر ضرور تھا لیکن غرناطہ اور قرطبہ جیسے شہروں کے مقابلے میں چھوٹا شہر تھا، لیکن آج صورت حال برعکس ہے۔ رقبے، آبادی اور تمدنی سہولیات کے لحاظ سے آج کا مالقہ قرطبہ اور غرناطہ سے کہیں بڑا شہر ہے۔ بندرگاہ اور بین الاقوامی ہوائی اڈے کی وجہ سے اس کی اہمیت موجودہ قرطبہ اور غرناطہ سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مالقہ کا ساحل سمندر بھی بہت خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ اور یہاں کا موسم بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے، اس لئے یہ شہر سیاحت کا بھی بہت بڑا مرکز بن گیا ہے۔

اب مالقہ میں اسلامی عہد کے مآثر ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد کا ایک بازار ابھی تک موجود ہے جسے اب سبزی منڈی کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ مالقہ کی جامع مسجد جسے عیسائی تسلط کے بعد کلیسا بنا لیا گیا تھا، اب کلیسا کی شکل میں شہر کی اہم قدیم عمارت ہے۔ اس کے علاوہ شہر سے کچھ دور شمالی جانب کے ساحل سمندر پر مسلمانوں کے دور کا ایک قلعہ ابھی محفوظ ہے۔ جسے ''حصن جبل فارہ'' (Gibral Fara) کہا

جاتا ہے۔[1] لیکن ان تمام مقامات تک پہنچنے کے لئے وقت بھی درکار تھا، اور کوئی رہنما بھی۔ ہمیں دونوں چیزیں میسر نہ تھیں۔ اس لئے ہم ان مقامات پر نہیں جا سکے۔

انتقیرہ

جہاز پر پہنچنے سے پہلے جو تھوڑا سا وقت تھا، اس میں ہم شہر کے عام نظارے کے علاوہ نقشے کی مدد سے ایک ایسے ساحل سمندر کا انتخاب کر سکے جو ایئر پورٹ کے مغرب میں چند میل کے فاصلے پر واقع تھا، اور نقشے میں اس کا نام Antequerra لکھا ہوا تھا۔ یہ دراصل صوبہ مالقہ کے ایک قدیم شہر "انتقیرہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو سمندر کے شمال میں بلندی پر واقع تھا۔ کہتے ہیں کہ اسلامی عہد کی شہر پناہ کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں، اور قریب کی ایک پہاڑی پر مسلمانوں کے دور کا ایک عالی شان قلعہ بھی ابھی تک موجود ہے۔ شہر کے مشرقی جانب ایک ٹیلہ ہے جس میں زمین کی سطح سے ۶۵ فٹ نیچا ایک تہ خانہ ہے۔ یہ زمانۂ قبل تاریخ کا ایک زمین دوز قبرستان سمجھا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جو پہاڑ واقع ہیں، ان میں سنگ مرمر کی ایک کان ہے۔ اس شہر کے لوگوں میں ابوبکر یحییٰ بن محمد انصاری حکیم انتقیری ایک مشہور شاعر گزرے ہیں۔ یہ شہر ۸۱۳ھ تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا۔ بعد میں جب یہاں عیسائیوں کا تسلط ہو گیا تو یہاں کے مسلمانوں نے یہاں سے فرار ہو کر غرناطہ میں سکونت اختیار کی، چنانچہ قصر الحمراء کے قریب ایک محلّہ انہی کی نسبت سے آج بھی انتقیرہ (Antequera) کے نام سے مشہور ہے۔[2]

لیکن آج انتقیرہ ایک تفریحی شہر ہے جو سر بفلک ہوٹلوں اور کرائے کے فلیٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ ساحل سمندر کا لطف اٹھانے کے لئے یہاں ہفتوں قیام کرتے ہیں۔ سردی کے موسم کی وجہ سے اس وقت یہاں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ لیکن سنا ہے کہ گرمی کے موسم میں یہ علاقہ سیاحوں سے بھر جاتا ہے۔

ہم نے تھوڑی دیر کے لئے انتقیرہ کی ساحلی سڑک (Drive Marine) پر گاڑی روکی۔ پورے ساحل پر سناٹے کی حکمرانی تھی، اور سامنے بحر متوسط کی موجیں کروٹیں لے رہی تھیں، اسی

---

[1] آثار الاندلسیۃ الباقیہ۔ محمد عبداللہ عنان مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۱ھ ص ۲۴۸

[2] اندلس کا تاریخی جغرافیہ۔ از محمد عنایت اللہ مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۱۳۶

سمندر کا سینہ چیر کر کسی وقت مسلمان اندلس کے ساحل تک پہنچے تھے، اسی سمندر نے ان مجاہدین کی ترکتازیوں کا نظارہ کیا تھا جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اور یہی وہ سمندر ہے جس نے آٹھ سو سال بعد انہی مجاہدوں کے فرزندوں کو لٹی پٹی حالت میں جہازوں پر سوار ہو کر اس میں مراکش کا رخ کرتے دیکھا تھا کہ جس کسی شخص کو اپنے خاندان کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا، وہ خوش نصیب کہلایا اور رشک کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اسی سمندر میں تاریخ اسلام کے مشہور جہاز ران خیر الدین باربروسا کے جہاز برسوں تک اندلسی مہاجرین کو عیسائیوں کی دستبرد سے بچا کر مراکش اور الجزائر پہنچانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اور آج یہی سمندر ہے جس کے کنارے سیاحت و عشرت کے یہ خدا فراموش اڈے قائم ہیں۔ تلک الایام نداولها بین الناس. (آل عمران۔ ۱۴۰)

میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب اندلس کے ماضی و حال کے تصورات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک مرحلے پر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا، کیا کبھی مسلمان اس خطے کو دوبارہ ایمان سے منور کر سکیں گے؟

میں نے عرض کیا: ''اس وقت تو مسلمان اپنے موجودہ خطوں کو ٹھیک سے سنبھال لیں اور اس بات کا انتظام کر لیں تو بہت ہے کہ وہاں اندلس کی تاریخ نہ دہرائی جائے۔'' اندلس میں مسلمانوں کے عروج کے اسباب بھی واضح تھے، اور زوال کے اسباب بھی واضح ہیں۔

تمشیر وسناں اول، طاؤس و رباب آخر

اب یہ ہمارا کام ہے کہ کن اسباب کو اپنے لئے اختیار کرتے ہیں؟

سفر برونائی



۲۹ صفر ۱۴۱۴ھ

سفر برونائی

مجمع الفقہ الاسلامی (اسلامی فقہ اکیڈمی) ایک بین الاقوامی تحقیقی ادارہ ہے جو تمام مسلمان ملکوں کی تنظیم منظمة المؤتمر الاسلامی (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس جسے او آئی سی کے مختصر نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد نئے فقہی مسائل پر اجتماعی غور و فکر اور فقہ کے میدان میں مختلف النوع تحقیقی کام سرانجام دینا ہے۔

اس ادارے نے اپنے باقاعدہ کام کا آغاز ۱۹۸۴ء سے کیا۔ اور اس کے بعد سے ہر سال اس کی مجلس عام کا سالانہ اجتماع منعقد ہوتا ہے، جس کے موضوعات پہلے سے طے کر کے ان پر اہل علم سے تحقیقی مقالات لکھوائے جاتے ہیں اور ارکان کے پاس بھیج دئے جاتے ہیں تاکہ وہ ان پر غور و فکر کر سکیں، پھر سالانہ اجتماع میں ان مقالات پر مفصل بحث ہوتی ہے اور بالآخر ہر موضوع کے بارے میں ایک قرارداد منظور کی جاتی ہے جسے اکیڈمی کے اجتماعی فیصلے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

۱۹۸۴ء سے اب تک اکیڈمی کے آٹھ بڑے سالانہ اجتماعات منعقد ہو چکے ہیں اور ان میں سے ہر اجتماع کی مفصل لفظ بہ لفظ کارروائی (جس میں پیش کئے جانے والے مقالات، ارکان کی طرف سے عام مباحثہ اور اکیڈمی کا فیصلہ، سب کچھ شامل ہے) ایک ضخیم مجلّے میں شائع ہوتی ہے جس کی اب تک سترہ ضخیم جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

اس اکیڈمی کے رکن کی حیثیت سے میں ہر سال اس کے سالانہ اجتماع کی روداد البلاغ کے صفحات میں پیش کرتا رہا ہوں۔

امسال برونائی دارالسلام کی حکومت نے اکیڈمی کے آٹھویں اجتماع کی میزبانی کی پیش کش کی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع محرم ۱۴۱۴ھ سے برونائی کے دارالحکومت بندرسری باگوان میں منعقد ہوا۔

اکیڈمی کے مستقل ارکان کے علاوہ سالانہ اجتماع میں عالمِ اسلام کے مختلف خطوں سے بہت سے اہل علم کو خصوصی دعوت پر بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ پاکستان سے برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب (صدر دارالعلوم کراچی) اور ہندوستان سے مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کو خصوصی دعوت پر مدعو کیا گیا تھا۔

اجتماع ۲۱ رجون کو شروع ہونا تھا۔ لیکن پروازوں کی ترتیب ایسی تھی کہ ہمیں ۱۸ رجون کی رات کو کراچی سے روانہ ہونا پڑا۔ برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم اور احقر رات کو دس بجے سنگاپور ایئر لائنز کے طیارے سے روانہ ہوئے، اور صبح چھ بجے کے قریب سنگاپور اترے۔ چند گھنٹے سنگاپور شہر میں گزارنے کے بعد دوپہر ساڑھے بارہ (۱۲-۳۰) بجے رائل برونائی ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوئے جو اپنی خوبصورتی، نفاست اور حسن انتظام کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ جب دوپہر کے کھانے کا وقت آیا اور کھانے کا مینو سامنے آیا تو اول تو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس میں مشروبات کی بڑی طویل اور متنوع فہرست تھی، لیکن ان میں کوئی مشروب الکوحل سے ملوث نہیں تھا، بلکہ نیچے ایک نوٹ لکھا ہوا تھا کہ برونائی کی حدود میں الکوحل آمیز مشروبات کا داخلہ نہ صرف ممنوع ہے، بلکہ ان کا استعمال ایک فوجداری جرم ہے جس پر سخت سزا دی جاسکتی ہے۔

کھانے میں چونکہ گوشت بھی تھا اور احقر کو شبہ تھا کہ کہیں وہ سنگاپور کی عام دوکانوں سے نہ لیا گیا ہو اس لئے احقر نے فضائی میزبان سے پوچھا کہ یہ گوشت کہاں سے حاصل کیا گیا ہے، میزبان نے فوراً جواب دیا کہ ''آپ بالکل فکر نہ کیجئے، برونائی ایئر لائنز میں حلال ذبیحے کا خاص انتظام ہوتا ہے، اور ایئر لائنز میں استعمال ہونے والا تمام گوشت شرعی طریقے سے ذبح شدہ اور حلال ہے۔''

تقریباً ڈھائی گھنٹے سمندر پر پرواز کرنے کے بعد جہاز نے اترنا شروع کیا، اور تھوڑی

دیر بعد دائیں جانب برونائی کا سبزے سے ڈھکا ہوا حسین جزیرہ نظر آنے لگا، اور تقریباً تین بجے سہ پہر برونائی کے دارالحکومت بندر سری باگاوان کے ہوائی اڈے پر اتر گئے۔ یہاں ہمارے استقبال کے لئے مجمع الفقہ الاسلامی کے جنرل سیکریٹری شیخ حبیب بلخوجہ، برونائی کی وزارتِ مذہبی امور کے سیکریٹری، وزارت مذہبی امور کے مشیر اسلامی قانون ڈاکٹر انوار اللہ صاحب (جو پاکستانی ہیں) اور وزارت اور اکیڈمی کے اعلیٰ افسران موجود تھے۔ وی آئی پی لاؤنج میں کچھ دیر ان حضرات سے برونائی کے حالات اور کانفرنس کے بارے میں گفتگو رہی وزارت مذہبی امور کے سیکریٹری برونائی کے باشندے ہیں، لیکن پاکستان سے گہری محبت رکھتے ہیں، اور اسی محبت کے نتیجے میں انہوں نے اچھی خاصی اردو سیکھ لی ہے، اور وہ ہم سے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ خاصی روانی سے اردو بولتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک پروٹوکول آفیسر کی معیت میں ہمیں ہوٹل پہنچا دیا گیا، یہاں کے ہوٹل دنیا کے بڑے شہروں کی طرح بہت زیادہ ٹھاٹ باٹ والے نہیں ہیں، البتہ سادگی کے ساتھ ضرورت کی تمام اشیاء میسر ہیں، احقر کا قیام ریورویو ہوٹل میں ہوا جو شہر کے چند ممتاز ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہے اور جس کمرے میں ہوا اس کی شیشے کی دیوار سے حد نظر تک سرسبز وشاداب مناظر کا سلسلہ ہر وقت سامنے تھا۔ کمرے میں پہلے سے ایک ورق موجود تھا جس پر مہینے کے تمام نمازوں کی تقویم چھپی ہوئی تھی۔ کمرے میں قبلے کا نشان بھی موجود تھا، اور اس طرح صاف محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی اسلامی ملک کے ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔

برونائی دارالسلام جنوبی بحر چین کے کنارے ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا مجموعی رقبہ کل ۵۷۶۵ کلومیٹر ہے اور آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ ملک ملائشیا کے جزیرۂ بورنیو کے شمال مغربی ساحل پر واقع ہے اور اس کی سرحد ملائشیا کی ریاست سراواک سے ملتی ہے۔ آبادی کا تقریباً ۷۰ فیصد حصہ ملایائی نسل کے سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور تقریباً تیس فیصد آبادی چینی اور ہندوستانی نسل کے لوگوں کی ہے جن کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ ملک کی سرکاری اور عوامی زبان ملایائی ہے لیکن انگریزی زبان وسیع پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

خط استوا کے بہت قریب ہونے کی وجہ سے یہاں سردی نہیں ہوتی۔ لیکن بارشیں اتنی

کثرت سے ہوتی ہیں کہ گرمی بھی بہت زیادہ نہیں ہو پاتی اور زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت ۳۰ درجے تک پہنچتا ہے۔

• برونائی جنوب مشرقی ایشیا کی ایک قدیم ریاست ہے، بعض نئے انکشافات سے پتہ چلا ہے کہ تقریباً چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں مشرق وسطٰی سے بعض مسلمان تاجر اس علاقے میں اسلام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنے۔ اس وقت پورے جزیرۂ بورنیو پر ایک غیر مسلم شاہی خاندان کا تسلط تھا، پھر رفتہ رفتہ یہ سلطنت زوال پذیر ہوئی اور بورنیو کے مختلف علاقوں میں مختلف سلطنتیں قائم ہوگئیں، یہاں تک کہ پندرھویں صدی عیسوی میں برونائی اس علاقے کی طاقتور ترین سلطنت شمار ہونے لگی اور سولھویں صدی عیسوی میں سلطان بلقیا کی سرکردگی میں برونائی کے بحری بیڑے نے نہ صرف بورنیو بلکہ فلپائن کے بعض علاقوں تک اپنی فتوحات کو وسیع کرلیا۔

لیکن انیسویں صدی عیسوی میں اس پورے علاقے پر مغربی استعمار کا تسلط ہوا۔ اور برونائی کا بیشتر حصہ اس کے زیر اثر آ گیا، اور برونائی کی سلطنت سمٹتے سمٹتے اپنی موجودہ حدود تک آ گئی۔ لیکن سولھویں صدی سے آج تک برونائی پر سلطان بلقیا ہی کا شاہی خاندان حکمران چلا آتا ہے۔ موجودہ بادشاہ حسن بلقیا ایک نوجوان بادشاہ ہیں جو آج شاہی خاندان کے انیسویں تاجدار ہیں۔ اور پچیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے تھے۔

برونائی اگرچہ ایک خود مختار سلطنت تھی، لیکن مغربی سامراج کے تسلط نے اسے مجبور کیا کہ وہ ۱۹۰۲ء میں برطانیہ کے زیر حمایت رہا جہاں ایک برطانوی ریزیڈنٹ مستقل موجود رہتا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں برطانیہ کا اثر و نفوذ صرف امور خارجہ اور دفاع کی حد تک محدود کر دیا گیا اور بالآخر ۱۹۸۴ء میں اسے مکمل آزادی حاصل ہوئی، اور وہ ایک نئے اسلامی ملک کی صورت میں دوبارہ دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔

جو شاہی خاندان برونائی پر صدیوں سے حکومت کر رہا ہے، وہ ماضی میں شعائرِ دین کے بارے میں ہمیشہ نیک نام رہا ہے، اور آزادی کے بعد بھی اس نے برونائی کو ایک حقیقی اسلامی ملک بنانے کے عزم کا اظہار کیا، اور اس سمت میں کچھ عملی اقدامات بھی کئے جن میں شراب کی

بندش کا قانون قابلِ ذکر ہے۔ وزارت مذہبی امور میں ایک مستقل محکمہ رائج الوقت قوانین کو اسلامی قوانین میں تبدیل کرنے کے لئے کام کررہا ہے۔ پاکستان سے ڈاکٹر انوار اللہ صاحب اسی مقصد کے لئے بلائے گئے ہیں۔ یہ صاحب جامعہ اشرفیہ لاہور کے فارغ التحصیل عالم ہیں اورانہوں نے بعد میں انگریزی اور بعض دیگر مروجہ علوم بھی پڑھے، میں جب فیڈرل شریعت کورٹ کا جج تھا، اس وقت یہ عدالت کے مستقل مشیر کی حیثیت میں وہاں تعینات تھے، جہاں ان کی صلاحیتوں کا مشاہدہ ہوتا رہا۔ کئی سال تک فیڈرل شریعت کورٹ میں کام کرنے سے ان کی صلاحیت اور تجربے میں نمایاں اضافہ ہوا، اور جب برونائی کی حکومت نے اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے کوئی موزوں شخص طلب کیا تو بلاشبہ ان کا انتخاب ایک اچھا انتخاب تھا۔ اوراب وہ یکسوئی کے ساتھ اس خدمت میں مشغول ہیں۔

نفاذ شریعت سے حکومت برونائی کی دلچسپی ہی کا ایک ثمرہ یہ بھی ہے کہ اس مرتبہ اس نے مجمع الفقہ الاسلامی کے سالانہ اجلاس کی میزبانی کی ازخود پیش کش کی، اور اس کے انعقاد کے لئے شاندار انتظامات کئے۔

ہم بدھ ۱۸ رجون کی شام کو برونائی پہنچے تھے، جمعرات اور جمعہ کے دن فارغ تھے، اور اکیڈمی کا اجلاس ہفتے کی صبح شروع ہونا تھا، چنانچہ یہ دو دن برونائی کے بعض مقامات دیکھنے اور احباب سے ملاقات میں صرف ہوئے۔ ہمارے دوست محمد طارق صاحب یہاں یونیورسٹی میں استاذ ہیں، انہوں نے بڑی محبت سے پاکستانی احباب سے ملاقات کروائی، پرلطف دعوتوں کا اہتمام کیا، اور شہر کے قابل ذکر مقامات کی سیر کرائی۔

ہفتہ ۲۱ رجون کو برونائی میں محرم کی پہلی تاریخ تھی اور نئے ہجری سال کا آغاز ہورہا تھا۔ برونائی کی روایت یہ ہے کہ یہاں ہجری سال کا آغاز بڑے تزک واحتشام سے کیا جاتا ہے، عمارتوں کو سجایا جاتا ہے عوامی اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ اور بادشاہ کسی اجتماع عام میں عوام سے خطاب کرتا ہے۔ اس مرتبہ مجمع الفقہ الاسلامی کا افتتاحی اجلاس یکم محرم کو رکھا گیا تھا جس کی صدارت شاہ حسن بلقیا کو کرنی تھی۔

بندرسری باگاوان، برونائی کا دارالحکومت بھی ہے اور اس کا سب سے بڑا شہر بھی۔ اسی

شہر کے ایک کنارے عالمی کانفرنسوں کے لئے ایک عظیم الشان کمپلیکس تعمیر کیا گیا ہے جس کا نام ''انٹرنیشنل کنونشن سنٹر'' ہے، اور جسے آسانی کے لئے عموماً آئی سی سی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مجمع الفقہ الاسلامی کے تمام اجلاسات اسی عمارت میں طے پائے تھے۔

اسی عمارت کے مرکزی ہال میں افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ سلطان حسن بلقیا جن کا سرکاری لقب ''معزالدین والدولہ'' ہے، اپنے ولی عہد بیٹے اور بھائی کے ساتھ اجلاس میں شریک ہوئے وہ ایک چھریرے بدن کے نوجوان آدمی ہیں، اور اس وقت ذاتی حیثیت میں غالباً دنیا کے دولت مند ترین شخص ہیں۔ ابھی تک ان کی سلطنت میں روایتی شاہی آداب کا پورا اہتمام پایا جاتا ہے، تقریر و تحریر میں جب بھی ان کا نام لیا جاتا ہے تو تمام القاب و آداب کے ساتھ لیا جاتا ہے مثلاً عربی میں انہیں اس طرح یاد کیا جاتا ہے۔ ''جلالة الملک الواثق باللّٰه السلطان الحاج حسن البلقية معزالدين والدولة ابن المرحوم السلطان الحاج عمر علی سیف الدين سعد الخير والدين، سلطان سلطنة برونائی دارالسلام'' یہاں تک کہ بار بار ان تمام القاب کے تکرار سے بعض اوقات گرانی ہونے لگتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ رسم بھی یہاں ابھی تک جاری ہے کہ سلطان سے ملاقات کرنے والا ان کے سامنے اس طرح جھکتا ہے کہ اس کا سر سلطان کے سینے کے سامنے آجائے۔ اس طرح جھکنے کی یہ رسم سراسر غیر اسلامی تو ہے ہی، طبع سلیم پر بھی ناگوار ہوتی ہے، اور حیرت ہے کہ اس نوجوان بادشاہ نے، جو اپنے ملک میں اسلامی اقدار کے فروغ اور اس کی معاشرتی ترقی کے لئے کوشاں ہے، ان جیسی بے معنی رسموں کو ابھی تک کیوں اور کس طرح باقی رکھا ہوا ہے؟

لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ برونائی کے عوام اپنے بادشاہ سے محبت رکھتے ہیں اور بحیثیت مجموعی ان کی کارکردگی سے مطمئن اور خوش ہیں۔ سلطان حسن البلقیہ کی صدارتی اور افتتاحی تقریر بہترین اسلامی جذبات کی آئینہ دار تھی، انہوں نے عالم اسلام کے جن مسائل کا ذکر کیا ان میں کشمیری مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا بطور خاص تذکرہ کیا، اور یہ بات اس لحاظ سے بڑی قابل قدر ہے کہ ہندوستان کے ساتھ سیاسی اور تجارتی تعلقات کی موجودگی میں

بعض ممالک کشمیر کا نام لیتے ہوئے بھی ہچکچاتے ہیں، لیکن سلطان بلقیہ نے کشمیر کے مسئلے کو پورے عالم اسلام کا بلکہ حق وانصاف کا مسئلہ قرار دیا، اوران مسائل میں اس کا ذکر کیا جن کا حل پوری امت مسلمہ کے ذمہ واجب ہے۔

اجلاس کے بعد سلطان نے کانفرنس کے تمام مندوبین سے فرداً فرداً ملاقات کی، اور دوپہر کو ان کے اعزاز میں ظہرانہ دیا۔

مجمع الفقہ الاسلامی کے جلسات عمل اتوار ۲۲/جون کی صبح سے شروع ہوئے، اور حسب معمول صبح نو بجے سے ڈیڑھ بجے دوپہر تک اور شام پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک روزانہ دو اجلاس ہوتے رہے۔ درمیانی وقفوں میں لجان الصیاغۃ (مجالس تسوید) کی نشستیں ہوتی رہیں، اور پہلے کی طرح اس بار بھی جمعرات تک مسلسل مصروفیت رہی۔ اجلاس کے ایجنڈے میں تنظیمی معاملات کے علاوہ تیرہ علمی موضوعات شامل تھے جن پر اہل علم نے تحقیقی مقالے پیش کئے اور ہر موضوع پر مفید، دلچسپ اور علمی مباحثہ ہوتا رہا۔ اور بالآخر متعدد قراردادیں منظور کی گئیں۔ ان میں سے اہم قراردادوں کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ فقہی مذاہب کی سہولتوں سے استفادہ

یہ مسئلہ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں شدت کے ساتھ اٹھایا جارہا ہے کہ مختلف فقہاء مجتہدین کے مذاہب چونکہ سب اپنی اپنی جگہ معتبر ہیں۔ اس لئے ہر انسان کو ہر مسئلے میں آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے لئے جس مذہب میں آسانی سمجھے، اسے اختیار کرلے۔ چونکہ یہ سوچ کسی قید وشرط کی پابندی کے بغیر عالم اسلام میں رواج پارہی ہے۔ اس لئے مجمع الفقہ الاسلامی سے مطالبہ تھا کہ وہ اس موضوع پر صحیح راہ عمل کا تعین کرے چنانچہ اہل علم [illegible] مقالے لکھوائے گئے، اور اس موضوع پر پیش ہونے والے مقالات کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم (صدر دارالعلوم کراچی) کا مقالہ بھی اسی موضوع پر تھا۔ اور ہندوستان سے جناب مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے بھی اسی پر مقالہ تحریر فرمایا تھا۔

مقالوں کا خلاصہ اجلاس میں پیش ہونے کے بعد اس پر مفصل بحث ہوتی رہی۔ اور بالآخر لجنة الصياغة کی تیار کردہ جو قرارداد اجلاس کے آخر میں منظور کی گئی، اس کے اہم حصوں کا خلاصہ یہ ہے:۔

فقرہ نمبر ۴۔ فقہی مذاہب کی سہولتوں کو محض خواہش نفسانی کی خاطر اختیار کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس کا نتیجہ شرعی احکام کی پابندی سے آزادی ہے۔ البتہ مندرجہ ذیل ضوابط کی رعایت رکھتے ہوئے کسی فقہی مذہب میں دی گئی سہولت کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

(الف) جن فقہاء کا قول اختیار کیا جا رہا ہے وہ قول معتبر ہو اور اقوال شاذہ میں سے نہ ہو۔

(ب) اس قول کو اختیار کرنا کسی حقیقی مشقت کو دور کرنے کے لئے واقعۃً ضروری ہو گیا ہو، خواہ یہ ضرورت معاشرے کی حاجت عامہ یا خاصہ کی شکل میں ہو یا انفرادی ضرورت کی صورت میں۔

(ج) ایسے قول کو اختیار کرنے والا ایسے اہل علم میں سے ہو جو اقوال فقہاء میں انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہو، یا ایسا شخص ہو جو کسی ایسے اہل شخص پر اعتماد کر رہا ہو۔

(د) سہولت پر مبنی قول کو اختیار کرنے سے وہ تلفیق لازم نہ آئے جو ممنوع ہے اور جس کا ذکر فقرہ نمبر ۶ میں آ رہا ہے۔

(ہ) سہولت پر مبنی قول کو اختیار کرنے سے کوئی غیر مشروع مقصد پورا کرنا مطلوب نہ ہو۔

(و) اس سہولت کو اختیار کرنے پر متعلقہ شخص کا ضمیر مطمئن ہو۔

فقرہ نمبر ۶۔ تلفیق (ایک ہی مسئلے کے دو جزئیات میں الگ الگ فقہاء کے اقوال کو اختیار کرنا مندرجہ ذیل حالات میں ممنوع ہے:۔

(ا) جب اس کا نتیجہ محض خواہش نفسانی کی خاطر سہولت حاصل کرنا ہو یا فقرہ نمبر ۴ میں بیان کردہ ضوابط میں سے کسی ضابطے کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

(ب) جب اس سے کسی قاضی کے فیصلے کو مسترد کرنا لازم آئے۔

(ج) جب کسی معاملے میں کسی مجتہد کی تقلید کرتے ہوئے ایک عمل کر چکا ہو اور اب

دوسرے مجتہد کا قول لے کر اسے توڑنا چاہتا ہو۔

(د) جب تلفیق کے نتیجے میں اجماع کی مخالفت کی جائے، یا کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو اجماع کی مخالفت کو مستلزم ہو۔

(ہ) جب تلفیق کے نتیجے میں کوئی ایسی مرکب حالت وجود میں آ جائے جو مجتہدین میں سے کسی کے نزدیک بھی معتبر نہ ہو۔

ٹریفک کے حادثات اور ان کے احکام

اجلاس کا دوسرا اہم موضوع ''ٹریفک کے حادثات'' اور ان سے پیدا ہونے والے فقہی مسائل تھے، اس موضوع پر بھی متعدد مقالات لکھے گئے، احقر کا مقالہ بھی اسی موضوع پر تھا، اور احقر کے علاوہ جن حضرات نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا تھا، ان میں قطر کے محکمہ عالیہ کے قاضی شیخ عبدالقادر العماری، کویت کے قاضی شیخ حسن، سوڈان کے معروف عالم شیخ عطاء السید بطور خاص قابل ذکر ہیں اس موضوع پر بھی مفصل مناقشہ ہوا اور بالآخر جو قرارداد منظور ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱۔**الف**) ٹریفک کے وہ قواعد جو احکام شریعت کے خلاف نہ ہوں، ان کی پابندی شرعاً بھی واجب ہے، کیونکہ انتظامی معاملات میں ولی الامر کی اطاعت شرعاً بھی ضروری ہے۔

(ب) مصلحت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کے لئے مناسب انسدادی قوانین بنائے جائیں جن میں خلاف ورزی پر ممکنہ سزائیں، بشمول جرمانہ تجویز کی جاسکتی ہیں۔

(۲) سڑکوں پر گاڑیاں چلانے سے جو حادثات رونما ہوتے ہیں، ان پر شریعت کے ''جنایات'' کے احکام لاگو ہوتے ہیں۔ اور ڈرائیور نے کسی دوسرے شخص کے جسم یا مال کو جو نقصان پہنچایا ہو، وہ اس نقصان کا ضامن ہے اور اس کو اس ذمہ داری سے مندرجہ ذیل صورتوں کے سوا معاف نہیں کیا جاسکتا:۔

(الف) جب حادثہ کسی ایسی قوت قاہرہ کا نتیجہ ہو جسے دفع کرنا اس کی قدرت سے باہر تھا اور اس سے احتراز اس کے لئے ناممکن تھا۔ اور یہ اس صورت میں ہوگا جب انسان کے اختیار سے باہر کوئی خارجی عارض پیش آ گیا ہو۔

(ب) جب حادثے سے متاثر شخص نے خود کوئی ایسا فعل کیا ہو جو حادثے کا زیادہ موثر سبب بنا۔

(ج) جب حادثہ کسی تیسرے شخص کے فعل یا زیادتی سے وقوع پذیر ہوا ہو، اس صورت میں وہ تیسرا شخص حادثے کا ذمہ دار ہوگا۔

(۳) جانوروں کے سڑکوں پر آ جانے سے راستوں پر جو حادثات ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری جانوروں کے مالکوں پر ہوگی جبکہ حادثہ ان جانوروں کے کسی فعل سے واقع ہوا ہو، اور ان کے مالکان نے ان جانوروں کو قابو کرنے میں کوتاہی سے کام لیا ہو۔ ان دونوں شرطوں کے پائے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ قاضی کرے گا۔

(٤) اگر ڈرائیور اور متاثر شخص دونوں کے مشترک عمل سے حادثہ پیش آیا ہو تو ان میں سے ہر ایک پر دوسرے کے جانی یا مالی نقصان کا تاوان آئے گا۔

(٥۔الف) مذکورہ ذیل تفصیل کے تابع، اصل قاعدہ یہ ہے کہ مباشر ہر صورت میں نقصان کا ضامن ہے، خواہ اس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، لیکن متسبب صرف اس صورت میں نقصان کا ضامن ہے جب اس کی طرف سے کوئی کوتاہی یا زیادتی پائی گئی ہو،

(ب) جب کوئی نقصان مباشر اور متسبب دونوں کے عمل سے وقوع پذیر ہوا ہو تو تاوان کی ذمہ داری متسبب پر نہیں بلکہ مباشر پر ہوگی، الّا یہ کہ متسبب کی طرف سے زیادتی ہوئی ہو اور مباشر کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو۔

(ج) اگر دو متسبب جمع ہو جائیں اور ان میں سے ہر ایک کا فعل نقصان کا سبب بنا ہو تو ان میں ہر ایک اپنی تاثیر کے بقدر نقصان کا ذمہ دار ہوگا، اگر دونوں کی تاثیر برابر ہو، یا ان میں سے ہر ایک کی تاثیر کی نسبت علیحدہ معلوم نہ ہو سکے تو دونوں پر تاوان برابر ہوگا۔

ان قواعد کی مزید تفصیلات اور مثالوں سے ان کی وضاحت ان مقالات میں موجود ہے جو اجلاس میں پیش کئے گئے۔ اور جو اکیڈمی کے مجلے میں شائع ہورہے ہیں۔ احقر کا مقالہ "حوادث السیر" بھی ان نکات کی مفصل وضاحت اور ان کے دلائل پر مشتمل ہے۔

نیلام اور ٹینڈر طلب کرنے کے قواعد

نیلام تو تجارت کا ایک قدیم طریقہ ہے لیکن موجودہ دور میں اس کی شکلیں کافی متنوع ہو گئی ہیں۔ اور ٹینڈر طلب کرنے کے ذریعے بھی بہت سی اشیاء وخدمات کا نیلام کیا جاتا ہے لہٰذا اس طریق کار کے بعض امور بھی فقہی اعتبار سے قابل غور تھے۔ اور ان پر بھی تحقیقی مقالات لکھوائے گئے، اور بالآخر جو قرارداد منظور ہوئی اس کے اہم نکات کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) عقد المزایدۃ (نیلام) بیع اور اجارہ دونوں پر واقع ہوسکتا ہے۔

(۲) نیلام کے لئے جو طریق کار، ضوابط اور شرائط وضع کئے جاتے ہیں وہ شریعت کے کسی حکم سے متعارض نہ ہونے چاہئیں۔

(۳) نیلام میں شریک ہونے کے لئے (ٹینڈر دینے والے یا بولی لگانے والے سے) بطور ضمانت رقم طلب کی جاسکتی ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ جس کا ٹینڈر منظور نہ ہو، اسے زرِ ضمانت واپس کیا جائے، اور جس کا ٹینڈر منظور ہوجائے، زرِ ضمانت کو اس کے زرِ ثمن میں محسوب کیا جائے۔

(۴) نیلام یا ٹینڈر داخل کرنے کے لئے اتنی فیس مقرر کی جاسکتی ہے جو ان متعلقہ کاغذات وغیرہ کی حقیقی قیمت کے برابر ہو۔

(۵) ایک اسلامی بنک یا کسی اور ادارے کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے نفع بخش منصوبوں میں سرمایہ کاری کے لیے لوگوں سے ٹینڈر طلب کرے، تاکہ وہ اپنے نفع کا زیادہ تناسب حاصل کرسکے۔

(۶) ہر وہ طریقہ جس کے ذریعے خریداروں کو دھوکا دے کر قابل فروخت سامان کی قیمت

زیادہ ظاہر کی گئی ہو، وہ ''بخس'' میں داخل اور حرام ہے۔

کرنسی کے مسائل

کرنسی کی قوت خرید میں کمی واقع ہونے سے جو مسائل کھڑے ہوتے ہیں، اُن میں سے بعض کے بارے میں مجمع الفقہ الاسلامی اپنی رائے پہلے ظاہر کر چکی ہے، مثلاً یہ قرار دے چکی ہے کہ قرضوں اور دیون کو قیمتوں کے اشاریہ (PRICE INDEX) سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا اور ایسی وابستگی ''ربا'' کے حکم میں آتی ہے۔ لیکن اس سلسلے کے بعض مسائل موجودہ اجلاس میں طے کیے گئے۔ مثلاً:

۱...... اجرتوں کے تعین کو قیمتوں کے اشاریہ (PRICE INDEX) سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی آجر اور ملازم کے درمیان یہ معاہدہ ہوسکتا ہے کہ ہر سال ملازم کی اجرت میں اُتنا فی صد اضافہ کیا جائے گا جتنا فی صد اضافہ اُس سال قیمتوں کے اشاریہ میں ہوا ہو۔ البتہ جب پچھلی اجرتیں واجب الاداء ہو جائیں تو ان کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ واجب الاداء ہونے کے بعد اجرتیں آجر کے ذمّے دین ہو جاتی ہیں، اور دین کو اشاریہ سے وابستہ کرنا شرعاً جائز نہیں۔

۲...... جس روز مدیون دائن کو ادائیگی کر رہا ہو، اُس دن باہمی رضامندی سے یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ دین کی ادائیگی کسی اور کرنسی میں کی جائے گی، لیکن اوّل تو ادائیگی کے دن سے پہلے ایسا طے کرنا جائز نہیں، دوسرے ادائیگی کے دن طے کرنا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ دین کی دوسری کرنسی میں تبدیلی اُس روز کے کرنسی کے بازاری بھاؤ کے مطابق ہو۔

۳...... بیع یا اجارہ منعقد کرتے وقت فریقین ثمن موجل یا اجرتِ موجلہ کا تعین کسی ایک کرنسی، یا ایک سے زائد کرنسیوں یا سونے کی کسی معین مقدار کی صورت میں کر سکتے ہیں۔

۴...... یہ بات جائز نہیں ہے کہ جو دین کسی ایک کرنسی میں واجب ہوا ہو اس کی ادائیگی کسی اور کرنسی میں کرنے کی پیشگی شرط عائد کر دی جائے (مثلاً روپیہ قرض لیتے وقت یہ کہا جائے کہ اس کی ادائیگی ڈالر میں ہوگی)

اس مسئلے پر بھی اجلاس میں طویل بحث ہوئی کہ کیا کسی فرضی کرنسی، مثلاً اسلامک ڈیولپمنٹ بنک کے دینار اسلامی یا عالمی مالیاتی فنڈ کے حقوق السحب الخاصة Special drawing Rights کو قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ یا کیا کوئی ایسی مالی دستاویز وضع کی جاسکتی ہے جو قرضوں کی فراہمی اور ادائیگی میں کرنسی کی طرح استعمال ہو، لیکن افراط زر کے اثرات سے متاثر نہ ہو؟ اسی طرح یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا کہ جن ملکوں میں کرنسی کی قیمتیں انتہائی تیزی سے گری ہیں، مثلاً لبنان، سوریا اور وسطی ایشیائی ریاستیں، کیا اس انقلابی تبدیلی کو ''کساد'' کے حکم میں قرار دیکر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب سابق قرضوں کی ادائیگی کرنسی کی موجودہ قیمت کے اعتبار سے ہوگی؟ لیکن ان موضوعات پر اجلاس کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا، اور یہ طے کیا گیا کہ ان موضوعات پر مزید غور و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور ان مسائل کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جن کا احاطہ مقالات یا مباحث میں نہیں کیا جاسکا، لہٰذا ان پر مزید مقالات لکھوانے کی ضرورت ہے، چنانچہ یہ موضوعات آئندہ اجلاس تک ملتوی کردیئے گئے۔

بیع العربون

''بیع العربون'' بیع کی وہ صورت ہے جس میں خریدار بیعانے کی رقم اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ اگر اس نے چیز خرید لی تو یہ رقم قیمت کا حصہ ہوگی، اور باقی قیمت وہ ادا کرے گا، لیکن اگر اس نے وہ چیز نہ خریدی تو وہ بیعانے کی رقم واپس لینے کا حق دار نہیں ہوگا، بلکہ وہ بائع کی ہوگی۔

بیعانے کی رقم اس طرح ضبط کرنا حنفی، شافعی اور مالکی مذہب میں جائز نہیں ہے، لیکن حنبلی مسلک میں جائز ہے۔ یہ موضوع بھی مجمع الفقہ الاسلامی کے حالیہ اجلاس میں زیر بحث آیا، اور ارکان کی اکثریت نے اس مسئلے میں حنبلی مسلک کے مطابق رائے ظاہر کی جس کی بنیاد پر ''بیع العربون'' کے جواز کی قرارداد اکثریت سے منظور ہوئی، البتہ بعض ارکان نے اس کی مخالفت کی جن میں احقر کے علاوہ سوڈان کے شیخ صدیق الضریر، قطر کے شیخ علی احمد السالوس، ہندوستان

کے مولانا مجاہد الاسلام قاسمی اور بعض دوسرے حضرات شامل ہیں۔

بعض طبی مسائل

بہت سے طبی مسائل بھی حالیہ اجلاس کے ایجنڈے میں شامل تھے۔ اور "المنظمة الاسلامية للعلوم الطبية بالكويت" جو مسلمان اطباء کا ایک عالمی ادارہ ہے اس کے نمائندے بھی اپنے بہت سے مسائل لے کر اجلاس میں حاضر تھے، لیکن ان مسائل پر ابتدائی گفتگو کے بعد انہیں مزید تحقیق کے لئے موخر کر دیا گیا۔ البتہ تین موضوعات پر قرار دادیں منظور ہوئیں۔ ایک قرار داد طبی رازوں کے تحفظ اور اس کے ضوابط" سے متعلق تھی ایک "ایڈز" کی حفاظتی تدابیر سے متعلق۔ اور ایک "خواتین کے علاج" سے متعلق۔ پہلے دو موضوعات کی قرار دادیں بہت طویل بھی ہیں اور ان میں فقہی مسائل کم اور انتظامی سفارشات زیادہ ہیں، اس لئے ان کو یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ "خواتین کے علاج" کے بارے میں جو قرار داد منظور ہوئی، اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

> "اصل شرعی قاعدہ یہ ہے کہ مریض خاتون کے علاج کے لئے اگر کوئی مسلمان خاتون معالج میسر ہو تو مریضہ کے جسم کے کسی حصے کو کھولنے کے لئے اسی کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر مسلمان طبیبہ میسر نہ ہو تو غیر مسلم طبیبہ سے علاج کرایا جائے، اگر وہ بھی میسر نہ ہو تو کسی مسلمان طبیب کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت ہے اگر مسلمان طبیب بھی میسر نہ ہو تو غیر مسلم طبیب سے علاج کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن مرد سے علاج کرانے میں یہ شرط ہے کہ وہ مریضہ کے جسم کا صرف اتنا حصہ دیکھے جو مرض کی تشخیص اور علاج کے لئے ناگزیر ہو، اور اس سے آگے نہ بڑھے، نیز بقدر استطاعت غض بصر سے کام لے، علاج کے دوران مریضہ کا کوئی محرم، شوہر یا کوئی قابل اعتماد خاتون موجود رہے تاکہ خلوت لازم نہ آئے۔"

مجمع نے مسلمان ملکوں کی حکومتوں سے یہ بھی سفارش کی ہے کہ وہ اپنے اپنے ممالک میں

خواتین ڈاکٹروں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیں تاکہ خواتین کے علاج کے لئے استثنائی صورتوں پر عمل نہ کرنا پڑے۔

اس وقت اجلاس میں منظور شدہ تمام قراردادوں کا مکمل متن یا ترجمہ دینا پیش نظر نہیں ہے، صرف چند اہم قراردادوں کا خلاصہ عرض کیا گیا ہے۔ اجلاس کی مکمل کارروائی انشاء اللہ ''مجلّہ'' کی صورت میں مستقل شائع ہوگی جو ''مجمع الفقہ الاسلامی۔ جدہ'' کے پتے سے طلب کی جاسکتی ہے۔

''مجمع الفقہ الاسلامی'' کے اجلاس کی وجہ سے تقریباً نو دن برونائی میں قیام رہا۔ اگرچہ یہ دن زیادہ تر اپنی قیام گاہ اور کانفرنس ہال کے درمیان صرف ہوئے، لیکن درمیانی وقفوں میں متعدد دعوتیں ہوئیں، اور یہاں کی اہم شخصیات سے تبادلہ خیال بھی ہوا۔ پاکستان کے اساتذہ کی خاصی بڑی تعداد یہاں آباد ہے، ان سے بھی ملاقاتیں رہیں اور ان کے ایک اجتماع سے خطاب کا بھی موقع ملا۔

برونائی ایک خوش حال ملک ہے اور فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا کا امیر ترین ملک۔ یہاں کے باشندوں کے لئے تعلیم، علاج وغیرہ سب مفت ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں جس کے پاس کار نہ ہو، چنانچہ پبلک ٹرانسپورٹ مثلاً بسیں یہاں مفقود ہیں، یہاں تک کہ اس پورے عرصے میں ہمیں کوئی ٹیکسی بھی نظر نہیں آئی۔ پورے خطے میں نظم وضبط مثالی ہے، امن وامان قابل رشک ہے، اور جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس ملک کی ایک روایتی خصوصیت یہ ہے کہ قدیم زمانے سے لوگ یہاں دریاؤں کے اندر مکان بنا کر رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ ایسی بستیوں کو ''واٹر ولیج'' کہا جاتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے اپنے مکانات تک پہنچنے کے لئے کشتیاں استعمال کرتے ہیں۔ بعض جگہ مکانات کے ایک طرف دریا ہے اور ایک طرف خشکی۔ خشکی کی طرف یہاں کے باشندوں کی کاریں کھڑی رہتی ہیں اور دریا کی طرف کشتیاں۔ لوگوں کے مزاج میں عموماً سادگی ہے، مال ودولت کی فراوانی کے باوجود ٹیپ ٹاپ زیادہ نہیں ہے۔ عمارتیں بھی زیادہ تر سادہ ہیں۔ اور طرز بود وماند بھی سادہ۔

اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو تیل کی دولت سے نوازا ہے، پورا ملک سبزہ اور جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے، اور اس لحاظ سے اس کے وسائل آبادی کے مقابلے میں زائد ہیں، اور اسی تناسب سے مسائل بہت کم، عوام میں اسلامی سوچ اور اسلامی طرزِ عمل سے محبت نمایاں ہے، مسجدیں انتہائی عالی شان ہیں، لیکن دینی مدرسے نایاب ہیں۔ اور یہاں کے علماء زیادہ تر ازھر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اب بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ حکومت نے حفظ قرآن کی ہمت افزائی کے لئے حفاظ کا خصوصی وظیفہ مقرر کیا ہے۔ تقریباً تمام مسلمان باشندے شافعی المسلک ہیں، اور اس پر بہت پختہ ہیں۔ سب پکے سنی ہیں، اور شیعیت سے نفور اور بیزار ہیں۔

حکومت میں بادشاہت کی روایتی رسوم ضرور کھلتی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی حکمرانوں کا رجحان اہل دین کے ساتھ معاندانہ نہیں، بلکہ ہمدردانہ ہے۔ اس لحاظ سے اس ملک میں ایک نمونے کا اسلامی ملک بننے کی بڑی صلاحیت موجود ہے۔ اس چھوٹے سے ملک کو، جو وسائل سے مالا مال ہے۔ مکمل طور پر اسلامی سانچے میں ڈھالنا کچھ مشکل نہیں، حکومت اس طرف متوجہ تو ہوئی ہے، اور اس کے نتیجے میں بعض قوانین تبدیل کئے گئے ہیں، ایک غیر سودی بنک قائم کیا گیا ہے، خواتین کے لباس میں حیاء وحجاب کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن جس رفتار اور جوش وخروش سے یہاں نفاذ اسلام کا کام ہوسکتا ہے، ابھی اس میں کافی کمی ہے۔ تاہم دوسرے بہت سے مسلمان ملکوں سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو یہ چھوٹا سا ملک اس دور میں بسا غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے قائم رکھے اور اس کی حکومت اور عوام کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ترکی میں چند روز



۲۲ صفر ۱۴۱۵ھ
یکم اگست ۱۹۹۴ء

ترکی میں چندروز

میرے پچھلے چندروز ترکی کے شہر استنبول میں گذرے، چونکہ ترکی صدیوں تک پورے عالمِ اسلام کا مرکز اور مسلمانوں کی قوت وشوکت کا نشان رہا ہے، اور سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے وہ بڑی رنگارنگ تاریخ کا حامل ہے، اس لئے مجھ جیسے طالب علم کے لئے اس ملک سے قلبی وابستگی ایک فطری امر ہے، میں پہلے بھی ترکی جاچکا ہوں، (اور اسکا سفرنامہ بھی میری کتاب ,,جہانِ دیدہ،، میں شائع ہوچکا ہے) لیکن وہ اُن گنے چُنے ملکوں میں سے ہے جہاں مجھ جیسا طالب علم کسی اکتاہٹ کے بغیر بار بار جاسکتا ہے۔

''استنبول'' دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے، وہ اپنے جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے بھی منفرد حیثیت کا حامل ہے، کیونکہ اس کا ایک حصہ ایشیا اور ایک حصہ یورپ میں ہے، اور اپنی تہہ در تہہ تاریخ کے لحاظ سے بھی اسے جو اہمیت حاصل رہی ہے کہا جاتا ہے کہ روم اور ایتھنز کے سوا کوئی دوسرا شہر اس میں اسکی ہمسری نہیں کرسکتا، تاریخ کے مختلف زمانوں میں اس شہر کے نام بھی اتنے مختلف رہے ہیں کہ شاید دنیا کے کسی اور شہر کے اتنے نام نہ رہے ہوں، اس شہر کا قدیم ترین نام غالباً ''زارغراذ'' تھا، اس کے بعد اسی کو میکلا غارد (Myclagard) کہا گیا، یونانی اور رومی دور کی ابتدا میں اس کا نام بیزنطہ (Byzantia) رکھا گیا، پھر جب تیسری صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین (Constantine) نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اس کا نام قسطنطنیہ (Constantinople) رکھدیا، اسی کو ,,روم جدید،، بھی کہتے تھے، بازنطینی لوگ اسے ھی پولس (He polis) کے نام سے پکارتے تھے، جس کے معنی شہر کے ہیں، غالباً اسی کا ترجمہ عربوں نے ,,مدینة الروم،، سے کیا، چنانچہ قدیم عربی تواریخ میں اسے ,,مدینة

الروم،، کہا گیا ہے، جب یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو بعض لوگ اسے ,,استانبول،، کہنے لگے، جسے بعد میں بدل کر ,,اسلامبول،، بنا دیا گیا، خلافتِ عثمانیہ کے بعض سرکاری کاغذات میں اسے ,,اسلامبول،، ہی لکھا گیا ہے، لیکن اسکا باقاعدہ سرکاری نام قسطنطنیہ ہی رہا، خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں اسے ,,آستانہ دار السعادۃ،، اور ,,الباب العالی،، کے نام بھی دیئے گئے، یہاں تک کہ جب خلافتِ عثمانیہ ختم ہوئی تو ۱۹۳۰ء سے اس کا باقاعدہ سرکاری نام ,,استنبول،، چلا آتا ہے، اور اب یہ اسی نام سے مشہور ہے۔

یہ شہر گیارہ سو سال تک سلطنت روما کا پایۂ تخت رہا ہے، جو اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی، عیسائیوں کے مشرقی کلیسا کا مرکزی شہر بھی یہی تھا جس کے سربراہ کو بطریرک (Patriarch) کہا جاتا تھا، اور مغربی کلیسا کے مقابلے میں اسے ,,دی ہولی آرتھوڈوکس چرچ،، کہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس شہر کے فتح کرنے والے مسلمان کو بشارت دی تھی، اس لئے مسلمان ہر دور میں اسے فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے، صحابہ وتابعین کا جو پہلا لشکر قسطنطنیہ کی مہم پر گیا، اس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جنکی وہیں پر وفات ہوئی، اور آج ان کا مزار استنبول ہی میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے، متعدد مسلمان سلاطین کے حملوں کے بعد بالآخر قسطنطنیہ فتح کرنے کی سعادت خاندانِ آل عثمان کے ساتویں نوجوان خلیفہ سلطان محمد فاتح کے حصے میں آئی جس نے خشکی پر جہاز چلانے کا تاریخی کارنامہ انجام دے کر یہ شہر فتح کیا، اور اس کے بعد یہ خلافتِ عثمانیہ کا دار الحکومت قرار پایا، اور تقریباً پانچ سو سال تک اسے پورے عالم اسلام میں مرکزیت کا مقام حاصل رہا، انہی خصوصیات کی بنا پر اقبال مرحوم نے اس شہر کا ذکر اس طرح کیا ہے

خطۂ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار
مہدیٔ امت کی سطوت کا نشان پائیدار

صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے

نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اسکی ہوا
تربت ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا

اے مسلمان! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

پھر بالآخر مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آغاز بھی یہیں سے ہوا، اور الغاءِ خلافت کی صورت میں عالمِ اسلام کے اتحاد پر سب سے کاری ضرب بھی یہیں لگائی گئی، جس کے بارے میں شاعرِ مشرق نے کہا ہے کہ ؂

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

ترکی اور استنبول کے مآثر کا مفصل تذکرہ میں اپنے سفرناموں کے مجموعے ،، جہانِ دیدہ ،، میں کر چکا ہوں، لیکن اس وقت ترکی کے اس تازہ سفر کے چند تأثرات پیش خدمت ہیں:

(۱) کمال اتاترک کے زمانے سے یہاں سیکولر نظام حکومت کا راج ہے، لیکن اپنی ابتدا میں یہ عجیب وغریب سیکولر نظام تھا جس میں مسلمانوں کے خالص دینی شعائر پر بھی نہایت پر تشدد پابندیاں عائد کی گئی تھیں، لوگ اذانوں تک کو ترس گئے تھے، عربی زبان میں اسلامی علوم کی تعلیم کو جرم قرار دیدیا گیا تھا، لوگوں کو زبردستی ٹوپی کی جگہ ھیٹ پہنانے کے لئے باقاعدہ خونریزی کی گئی تھی، غرض لادینیت کے وہ جنونی (Fanatic) مظاہرے یہاں دیکھنے میں آئے تھے جو شاید عالمِ اسلام کے کسی اور حصے میں نہیں دیکھے گئے، بعد میں رفتہ رفتہ اس قسم کی پابندیاں تو اٹھ گئیں، لیکن ملک کا سیاسی ڈھانچہ علی الاعلان سیکولر ہی رہا، اور دینی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کی پالیسی عرصہ دراز تک برقرار رہی، اب بفضلہٖ تعالیٰ اس صورتِ حال میں ایک خوشگوار تبدیلی آرہی ہے۔

دینی سرگرمیوں پر جکڑ بند کے صبر آزما حالات میں بھی دینی حلقے ہمت ہار کر نہیں بیٹھے،

بلکہ انہوں نے مختلف جہتوں سے اپنا کام جاری رکھا۔اس سلسلے میں تین حلقوں کی کوششیں بہت نمایاں ہیں،اول تو وہ علماء تھے جو ظاہری منظر سے ہٹنے کے باوجود اسلامی تعلیمات کے تحفظ کا فریضہ جان پر کھیل کر انجام دیتے رہے،دوسرے علامہ بدیع الزمان نورسی (رحمۃ اللہ علیہ) کی وہ غیر سیاسی تحریک تھی جس نے دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کے راستے سے نوجوانوں کی دینی تربیت اور ان میں اسلامی روح پھونکنے کا کارنامہ حیرت انگیز طریقے پر انجام دیا۔یہاں تک کہ شاید زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس میں نورسی تحریک سے متأثر افراد کی ایک بڑی تعداد موجود نہ ہو،تیسرے نجم الدین اربکان صاحب کی وہ رفاہ پارٹی ہے جو سیاسی محاذ پر اسلام کی عملداری واپس لانے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتی رہی،اب کچھ عرصے سے ان تینوں حلقوں کے ساتھ تبلیغی جماعت کی مؤثر کوششیں بھی شامل ہوگئی ہیں جو اپنے مخصوص ٹھیٹھ تبلیغی اور قطعی غیر سیاسی انداز میں کام کررہی ہے،لیکن اس کا حلقہ اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔

(۲) حالات کے اس پس منظر میں جس واقعے سے وہاں کے دینی حلقے پر امید اور مسرور نظر آئے،وہ یہ واقعہ ہے کہ چند ماہ قبل ترکی میں بلدیاتی اداروں کے جو انتخابات ہوئے،ان میں نجم الدین اربکان صاحب کی رفاہ پارٹی نے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی،اور اب ملک کے بہت سے اہم بلدیاتی اداروں پر اسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہے،اور میئر بھی انہی کے منتخب ہوئے ہیں،جس روز میں استنبول پہنچا،اس سے ذرا پہلے بعض بلدیاتی اداروں کے ضمنی انتخابات ہوئے تھے،جن کے نتائج سے اخبارات بھرے ہوئے تھے،ان نتائج کے مطابق بھی زیادہ حلقوں میں رفاہ پارٹی کے ارکان کامیاب ہوئے تھے۔ترکی کے جن دینی حلقوں کا اوپر ذکر ہوا،ان کے درمیان نظریات اور طریق کار کے اختلافات وہاں بھی یقیناً موجود ہیں،لیکن جہاں تک سیاسی محاذ کا تعلق ہے،اس پر کام کرنے کے لئے ان میں سے ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کے بجائے اپنی طاقت کو مجتمع کرکے صرف ایک رفاہ پارٹی کی حمایت کی،اور اس کا نتیجہ سب کی کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوا،ابھی عام انتخابات میں کافی دیر ہے،لیکن یہ حضرات بہت پر امید ہیں کہ ان کے منتخب نمائندے اپنی حسنِ کارکردگی کی بنا پر تیزی سے عام مقبولیت حاصل کررہے ہیں،اور اگر کسی قسم کے بیرونی غیر معمولی عوامل بیچ میں حائل نہ

ہوئے تو آئندہ عام انتخابات میں بھی انشاء اللہ رفاہ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوگی۔

(۳) چونکہ بلدیاتی انتخابات کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، اور کچھ ضمنی انتخابات ٹھیک اسی روز پایۂ تکمیل کو پہنچے تھے، جس روز میں استنبول کے ایئر پورٹ پر اترا، اس لئے فضا انتخابی گہما گہمی کے اثرات سے متأثر نظر آئی، لیکن ایک بات ایسی تھی جسے ہمارے ملک کا کوئی بھی شخص محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، اور وہ یہ کہ اس انتخابی گہما گہمی میں نہ قتل و غارت گری یا عداوت و دشمنی کے آثار تھے، نہ شہر کی دیواریں سیاسی نعروں اور امیدواروں کے اشتہارات سے سیاہ نظر آئیں، نہ جابجا ان پر اشتہار چپکے ہوئے محسوس ہوئے، ایسا لگتا تھا کہ شہر کے مختلف حصوں پر انتخابی اشتہارات لگانے کے لئے جگہیں مخصوص ہیں، صرف انہی جگہوں پر اشتہارات چپکے یا لٹکے ہوئے تھے، اور وہ بھی قرینے اور تہذیب کے ساتھ، جس میں نہ کوئی بدنظمی تھی، نہ بدنمائی، لوگوں نے بتایا کہ دیواروں پر ہاتھ سے لکھنا یا اسٹینسل کے ذریعے کوئی عبارت چھاپنا تو کلی طور پر ممنوع ہے، اور یہ ممانعت صرف قانون ہی کی زینت نہیں ہے، بلکہ اسکی سختی سے پابندی کرائی جاتی ہے، مخصوص مقامات اور دیواروں پر اشتہارات چسپاں کئے جاسکتے ہیں، یا رسی میں پرو کر لٹکائے جاسکتے ہیں، لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جس شخص یا جماعت نے جو اشتہار لگایا ہے، ایک محدود مدت کے بعد وہی اسکو اتارنے یا مٹانے کی پابند ہے، اور اس مدت کے گذرنے کے بعد اگر اشتہار وہاں لگا رہے تو متعلقہ فرد یا جماعت قانونی طور پر جواب دہ ہوتی ہے۔ کاش کہ ہمارے ملک میں بھی لوگوں کا اظہارِ جذبات کسی نظم و ضبط اور تہذیب و شائستگی کا پابند ہو سکے۔

مغرب میں دو ہفتے



۱ تا ۳ رمضان ۱۴۱۵ھ
۲ تا ۴ فروری ۱۹۹۵ء

مغرب میں دو ہفتے

اور

مغربی ممالک میں اشاعت اسلام

پچھلے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے دوران ذکر وفکر سے غیر حاضری رہی، اس کا سبب یہ تھا کہ اس مدت کا بیشتر حصہ میں ملک سے باہر رہا، بہت سے احباب کے مختلف تقاضے جمع ہو گئے تھے، جنہیں میں نے اس دوران پورا کرنے کی کوشش کی اور مجموعی طور پر تقریباً ۳۵ دن میں نو دور دراز کے ملکوں کا سفر کیا، جن میں قطر، ہالینڈ، کینڈا، امریکہ، ویسٹ انڈیز، سعودی عرب، کینیا، ری یونین اور جنوبی افریقہ شامل ہیں۔ ان سفروں کے بعض تاثرات اور ان ملکوں کے بارے میں معلومات امید ہے کہ انشاء اللہ قارئین کے لئے دلچسپی اور افادیت کی حامل ہوں گی۔ اس لئے اپنی سابقہ ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کی تلافی ان تاثرات کے ذریعہ کر رہا ہوں جو شاید ایک سے زائد قسطوں پر مشتمل ہوں گی۔

دسمبر کے دوسرے ہفتے میں دو روز قطر میں گزارنے کے بعد مجھے کینڈا اور امریکہ جانا تھا۔ طویل سفر کی تھکن اور مشقت سے بچنے کے لئے بیچ میں ایک دن ہالینڈ کے مشہور شہر ایمسٹرڈم میں بھی قیام رہا۔ جس میں دنیا کے اس منفرد شہر کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جسے نہروں اور پلوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا یہ ایک ایسا شہر جس کے اندرونی علاقوں کی سیر کشتی میں بیٹھ کر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ پورے شہر میں دریائے ایمسٹر سے نکلنے والی نہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جو شہر کے گنجان محلوں، بلکہ گلیوں تک بھی پہنچی ہوئی ہیں، یہاں کے باشندوں کی ایک

بہت بڑی تعداد مستقل طور پر کشتیوں ہی میں قیام پذیر ہے جو نہروں میں کھڑی نظر آتی ہیں۔

بہرکیف، تقریباً ۳۲ گھنٹے ایمسٹرڈم کے خوشگوار قیام کے بعد جو ایک جملہ معترضہ کے طور پر تھا میں نے شمالی امریکہ کا سفر کیا، جس کے دوران کینیڈا کے سب سے بڑے شہر ٹورنٹو اور امریکہ کے سب سے بڑے شہر نیویارک میں تقریباً ایک ہفتہ گزارنے کا موقع ملا، میں اس سے پہلے بھی بارہا امریکہ جاچکا ہوں، اور ۱۹۷۸ء سے لے کر آج تک جب کبھی امریکہ جانا ہوا تو وہاں کے مسلمانوں کے حالات اور اسلامی سرگرمیوں میں پہلے کی بہ نسبت نمایاں ترقی کا احساس ہوا۔ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد، ان کی دینی سرگرمیاں اور نئے نئے قائم ہونے والے ادارے روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ جس روز میں کینیڈا پہنچا، اس سے صرف دو روز پہلے (یعنی ۱۰/ دسمبر ۱۹۹۴ء کو) کیلیفورنیا کے مشہور اخبار ,,لاس اینجلس ٹائمز،، نے مغرب میں مسلمانوں کے حالات پر ایک مفصل سروے رپورٹ شائع کی تھی، جس کی سرخی میں یہ کہا گیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں دین اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیل رہا ہے، اب تک امریکہ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے بارے میں لوگ مختلف اندازے لگاتے رہے ہیں، اور مسلمانوں کی تعداد عموماً چھ سے آٹھ ملین تک بتائی جاتی ہے، لیکن ,,لاس اینجلس ٹائمز،، کا کہنا ہے کہ یہ اندازے کسی سائنٹفک سروے پر مبنی نہیں تھے، اس سروے کے مطابق امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ صرف پانچ لاکھ بیان کی گئی ہے، لیکن سروے میں صراحت کی گئی ہے کہ یہ صرف ان مسلمانوں کی تعداد ہے جو امریکی مسجدوں میں پابندی سے نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، سروے کرنے والوں نے امریکہ کی ایک ہزار چھیالیس مسجدوں کے منتظمین سے مسجد میں پابندی سے آنے والوں کی تعداد معلوم کی، اور ان کو جمع کیا، اس حساب کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ ہر مسجد میں باقاعدہ نماز ادا کرنے والوں کی تعداد اوسطاً فی مسجد ۴۶۵ ہے، ساتھ ہی سروے میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا صرف دس فیصد حصہ باقاعدگی سے مسجدوں میں نماز ادا کرتا ہے، لہذا مسلمانوں کی حقیقی تعداد پانچ ملین یعنی پچاس لاکھ سے کم نہیں ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا

بھی درست نہیں ہوگا کہ جو نوے فیصد مسلمان باقاعدگی سے مسجدوں میں نہیں جاتے وہ نماز سے بالکلیہ محروم ہیں، اس لئے کہ امریکہ میں مسجدیں بہت طویل فاصلوں پر بنی ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے ہر آدمی کے لئے باقاعدگی سے مسجد میں پہنچنا دشوار رہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان یا تو گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں یا انہوں نے مختلف محلوں میں ایسی نماز گاہیں بنا رکھی ہیں جو باقاعدہ مسجد نہیں ہیں لیکن محلے کے لوگ وہاں جمع ہو کر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔

,,لاس اینجلس ٹائمنر،، کے اس سروے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں ہر سال کم از کم ایک لاکھ پچیس ہزار مسلمانوں کا اضافہ ہو رہا ہے، جن میں دوسرے ملکوں سے آ کر آباد ہونے والے مسلمان بھی شامل ہیں اور وہ امریکی باشندے بھی جو اسلام قبول کر رہے ہیں، اخبار کا کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کی رفتار یہی رہی تو آئندہ صدی کے آغاز تک امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد امریکی یہودیوں سے بڑھ جائے گی، اور عیسائیت کے بعد اسلام امریکہ کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہوگا۔

امریکہ کے بعض مسلم حلقوں نے لاس اینجلس ٹائمنر میں شائع ہونے والے اس سروے کی صحت پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے اور یہ دعوی کیا ہے کہ اس سروے میں مسلمانوں کی تعداد حقیقت سے کم دکھائی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی حقیقی تعداد اس وقت بھی یہودیوں سے زیادہ ہے، لیکن اگر لاس اینجلس ٹائمنر کی اس رپورٹ ہی کو درست سمجھا جائے تب بھی یہ بات واضح ہے کہ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کی ترقی جس رفتار سے ہو رہی ہے، وہ مغربی صحافت کو چونکا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں امریکہ کے تقریباً ہر خطے میں شاندار مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں بچوں کی دینی تعلیم کے مراکز قائم ہوئے ہیں اور مختلف اسلامی اداروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ ایک مؤقر امریکی جریدے کی رپورٹ تھی، اتفاق سے اس رپورٹ کی اشاعت سے ٹھیک ایک سال پہلے لندن کے مشہور روزنامے ,,ٹائمنر،، نے اپنی ۹ نومبر ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں برطانیہ میں اشاعت اسلام کے بارے میں ایک بہت مفصل مضمون شائع کیا تھا، جس کا

عنوان تھا ,,برطانوی خواتین اسلام کیوں قبول کررہی ہیں؟،،اس مضمون پر یہ سرخی بھی لگائی گئی تھی کہ ,,مغربی میڈیا کی معاندانہ روش کے باوجود اسلام مغربی دلوں کو فتح کررہا ہے،، اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ جس بھاری تعداد میں برطانوی باشندے آج کل اسلام قبول کررہے ہیں،اس کی کوئی نظیر ماضی میں نہیں ملتی،اگرچہ برطانیہ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے وطنوں کو چھوڑ کر برطانیہ میں آباد ہوگئے ہیں،لیکن اب اس تعداد میں خود برطانوی نژاد نومسلموں کا بھاری تعداد میں اضافہ ہورہا ہے،اور اندازہ یہ ہے کہ آئندہ بیس سال کے دوران برطانوی نومسلموں کی تعداد ان تارکین وطن کے مقابلے میں بڑھ جائے گی جو آبائی طور پر مسلمان تھے۔اور ترک وطن کرکے برطانیہ میں آباد ہوگئے۔

,,لندن ٹائمز،، نے لکھا ہے کہ اگرچہ مغربی پریس اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہمیشہ منفی تصویر پیش کرتا رہتا ہے اس کے باوجود برطانوی باشندوں میں اسلام قبول کرنے کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے،اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان برطانوی نومسلموں میں بھاری اکثریت خواتین کی ہے،اخبار کی اطلاع کے مطابق امریکی نومسلموں میں بھی خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں چار گنا زیادہ ہے،اور برطانیہ میں بھی نومسلموں میں بھاری اکثریت انہی کی ہے،اخبار لکھتا ہے کہ

"It is even more ironic that most British converts should be women, given the despread view in the West that Islam treats women poorly"

''یہ اور بھی ستم ظریفی کی بات ہے کہ اکثر برطانوی نومسلم عورتیں ہیں، حالانکہ مغرب میں یہ نظریہ بہت پھیلا ہوا ہے کہ اسلام عورتوں سے گھٹیا سلوک کرتا ہے''

مغرب میں اسلام پھیلنے کی اس تیز رفتاری کی وجوہات پر بھی اخبار نے مختلف رائیں

ظاہر کی ہیں۔اس کا کہنا ہے کہ جب سے سلمان رشدی کے معاملے نے شہرت پائی اس وقت سے لوگوں میں اسلام کا مطالعہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔دوسری طرف خلیج کی جنگ اور بوسنیا میں مسلمانوں کی حالت زار بھی اسلام سے ہمدردی کا سبب بنی نیز مغربی تعلیمی اداروں میں تقابل ادیان کے موضوع پر تعلیم میں بھی اضافہ ہوا ہے،اس کے نتیجے میں بھی بہت سے لوگ مسلمان ہوئے،اس کے علاوہ برطانوی میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو بے تکان پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے اور اس نے ہر اسلامی چیز کو برا کہنے کی جو پالیسی اختیار کی ہوئی ہے اس کا بھی بہت سے لوگوں پر الٹا اثر ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے ہیں،آخر میں اخبار لکھتا ہے کہ

> "Westerners despairing of their own society- rising crime, family breakdown, drugs and alcoholism- have come to admire the discipline and security of Islam"
>
> ''مغرب کے لوگ خود اپنی سوسائٹی سے مایوس ہو رہے ہیں جس میں بڑھتے ہوئے جرائم،خاندانی نظام کی تباہی،منشیات اور شراب نوشی کا دور دورہ ہے،بالآخر وہ اسلام کے دیئے ہوئے نظم وضبط اور تحفظ کی تعریف کرتے ہیں''

بہت سے نومسلم پہلے عیسائی تھے وہ چرچ کی غیر یقینی کیفیت سے برگشتہ اور عقیدۂ تثلیث وغیرہ سے غیر مطمئن تھے۔بہت سے وہ لوگ ہیں جو بذات خود مذہب پر یقین نہیں رکھتے تھے لیکن انہیں اس تصوف نے اپیل کیا جسے وہ ''اسلام کے بم کے خول میں چھپے ہوئے ہیرے'' سے تعبیر کرتے ہیں،اخبار نے یہ بھی لکھا ہے کہ نام نہاد آزادی فکر کے اس دور میں بھی اسلام قبول کرنے والوں کو برطانیہ میں اپنی برادری اور اپنے معاشرے کی طرف سے سخت مشکلات کا

سامنا کرنا پڑتا ہے اور خواتین کی مدد کے لئے جو ادارہ قائم ہے، اس کو ٹیلیفون کرکے فریاد کرنے والی خواتین میں تقریباً ایک چوتھائی خواتین نومسلم ہوتی ہیں۔

اس کے بعد لندن ٹائمز نے ایسی بہت سی خواتین کے انٹرویو بھی شائع کئے ہیں، جو برطانوی نژاد ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، اور انہوں نے پوری طرح بصیرت کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے، ایک انتالیس سالہ خاتون جس نے اپنا اسلامی نام میمونہ رکھا ہے، شروع میں عیسائی تھی، پھر اس نے عیسائیت کے تمام فرقوں پر ریسرچ کی اور پھر اس نے یہودیت، بدھ مت، اور ہری کشنا کا گہرا مطالعہ کیا بالآخر اس نے اسلام کو منتخب کیا، متعدد نومسلم خواتین نے بتایا کہ ہم کلیسا کی رسمی درجہ بندیوں کے خلاف ہیں اور اسلام کی یہ ادا ہمیں پسند آئی ہے کہ ہر مسلمان براہ راست اپنے خدا سے رشتہ قائم کرسکتا ہے، ایک اٹھائیس سالہ برطانوی خاتون جو ہدیٰ خطوب کے اسلامی نام سے مشہور ہے اور اس نے مسلم خواتین کے لئے ایک کتاب بھی لکھی ہے، دس سال پہلے مسلمان ہوئی تھی، اسلام اور عیسائیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> ''عیسائیت ہر وقت بدلتی رہتی ہے، مثلاً اب بعض عیسائیوں نے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ شادی سے پہلے ہی جنسی تعلقات قائم کرنے میں کچھ حرج نہیں بشرطیکہ یہ اس شخص کے ساتھ ہوں، جس سے شادی کرنے کا ارادہ ہو، یہ بڑا ڈھیلا ڈھالا مذہب ہے۔ اس کے برعکس جنسی تعلقات کے بارے میں اسلام کی تعلیمات ہمیشہ یکساں رہی ہیں اسی طرح دن میں پانچ وقت کی نمازوں کے احکام میں تسلسل ہے، نماز کے ذریعہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس دل میں رکھتا ہے، اور اس طرح آپ کے پاس ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی ایک بنیاد موجود رہتی ہے''

اگرچہ عام تاثر یہ ہے کہ مغربی خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کو پسند کرتی ہیں اور اپنی اس خواہش سے دست بردار ہونا ان کے لئے بہت مشکل ہے، لیکن برطانیہ کی جن

نومسلم خواتین سے لندن ٹائمز نے گفتگو کی اس میں ان خواتین نے بتایا کہ ہمارے لئے اسلام میں کشش کا سبب ہی یہ ہوا کہ اسلام مرد اور عورت دونوں کے لئے الگ الگ دائرۂ کار تجویز کرتا ہے، جو دونوں کی جسمانی اور حیاتیاتی سانچوں کے عین مطابق ہے، ان کے نزدیک مغرب کی تحریک نسائیت (Feminism) درحقیقت عورت کے ساتھ بغاوت تھی۔ ''تحریک آزادیٔ نسواں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خواتین نے کہا کہ اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ

"Women copying men, an exercise in which wcmanhood has no intrinsic value"

''عورتیں مردوں کی نقالی کریں، اور یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نسوانیت کی اپنی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی''

اسکاٹ لینڈ کی ایک چھتیس سالہ خاتون کو ۱۹۷۲ء میں قرآن کریم کی بعض آیات (العیاذ باللہ) ایک ردی کی ٹوکری میں پڑی ہوئی ملیں، جنہیں اس نے اٹھایا اور انہیں پڑھ کر اس کے دل میں اسلام کا داعیہ پیدا ہوا، وہ مسلمان ہوئی، اور اس نے اپنا اسلامی نام ''نوریہ'' رکھا۔ ایک گفتگو کے دوران نوریہ نے مغربی خواتین کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ

"Most of the women in this country are traitors to their sex. It's almost as if we have been defeminised"

''اس ملک میں بیشتر خواتین اپنی صنف کے خلاف بغاوت کر رہی ہیں، اور یہ طرزِ عمل تقریباً ایسا ہے جیسے ہم سے ہماری نسوانیت چھین لی گئی ہے''

نوریہ ہی کی ایک سہیلی جس نے اپنا نام ''حسانہ'' رکھا ہے ۱۹۸۸ء میں مسلمان ہوئی،

حجاب کے احکام کی پابند ہے اور کہتی ہے کہ

,,کم از کم میں اپنی صنف کی باغی نہیں ہوں،،

پردہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ

''اس سے ہمیں تحفظ کا احساس ہوتا ہے اور ہماری خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے''

نوریہ نے کہا کہ ابھی تک مغرب میں یہ بحث جاری ہے کہ شادی کے موقع پر اور اس کے بعد بھی عورت کا نام تک مرد کے تابع ہوتا ہے، حالانکہ ہمیں اسلام میں مردوں سے بالکل الگ حقوق عطا کئے گئے ہیں، اس ضمن میں اس نے جائیداد وراثت، بچوں کی تحویل وغیرہ کے بارے میں اسلامی احکام کا تذکرہ کیا، اور کہا کہ حالات جس طرح جا رہے ہیں مجھے اس ملک (برطانیہ) میں عورت کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا، انجام آخر عورت ہی کے حق میں برا ہوتا ہے۔

"Scratch any new man and you find an old man trying to get out; men will always be the same. Women are changing much faster, but they are not trying to get what they want, Every thing the feminist movement is aiming for, except abortion and lesbianism, we've got"

''کسی بھی نئے مرد کو کھرچ کر دیکھئے اندر سے ایک پرانا مرد برآمد ہوتا نظر آئے گا، مرد ہمیشہ ایک جیسے ہی رہیں گے، عورتیں کہیں زیادہ تیز رفتاری سے بدل رہی ہیں لیکن جو کچھ وہ حاصل کرنا چاہتی ہیں اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر رہی ہیں نسائیت (Feminism) کی تحریک جن مقاصد کے لئے جدوجہد کر رہی ہے، ان میں سے اسقاط

حمل اور ہم جنس پرستی کے سوا سب چیزیں ہم پہلے ہی اسلام میں حاصل
کر چکی ہیں''

لندن ٹائمز لکھتا ہے کہ بہت سی نومسلم خواتین نے اسلام اور مغرب کا تقابل کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا کہ اسلامی تعلیمات میں عورت کو زیادہ تقدس اور عظمت حاصل ہے، جو مغرب میں عورت کو حاصل نہیں، اور ان کے نزدیک مغرب کی ,,تحریک آزادیٔ نسواں،، کا اس کے سوا نتیجہ نہیں ہوا کہ عورت دوہرے بوجھ تلے دب گئی ہے، اخبار کے الفاظ یہ ہیں کہ

"Many muslims contrast the status of women in Islam with what they see as the disma plight of women in the West. They note that here women work full-time out of financial necessity, remaining lumbered with the housework and children care. It is a puzzling version of emancipation.

''بہت سے مسلمان اسلام میں عورت کے رتبے کا مقابلہ مغرب میں نظر آنے والی عورت کی افسوسناک حالت زار سے کرتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں (مغرب میں) عورتیں اپنی معاشی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہمہ وقتی معاشی پیشے اختیار کرتی ہیں اس کے باوجود خانہ داری اور بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں کے بوجھ میں بدستور دبی ہوئی ہیں، یہ تحریک آزادیٔ نسواں کا ناقابل فہم رخ ہے''

لندن ٹائمز نے اس طرح کے متعدد انٹرویو اپنی اس اشاعت میں شائع کئے ہیں، جن میں برطانوی نومسلم خواتین نے مغربی زندگی سے اکتاہٹ اور اس کے مقابلے میں اسلام کے

اطمینان وسکون کا اعتراف کیا ہے، ان کے تمام اقتباسات پیش کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں لیکن اس مضمون کے ساتھ لندن ٹائمز نے ایک اداریہ بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے ,,اسلام کا انتخاب،، اس اداریہ کے چند اقتباسات میں طوالت کے خوف کے باوجود اخبار کے اپنے الفاظ میں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

ٹائمز لکھتا ہے:

"As the investigation in the Times on women and Islam has shown, the intellectual clarity and moral certainty of this 1400 years-old faith are proving attractive to many Western women disillusioned with the moral relationism of their own culture. Though some are converting to Islam after marrying Pakistani or Bangladeshi men, others are making the leap of faith as an independent act of spiritual self-improvement.

In spite of the outrageous indignities which many women suffer in Muslim countries, the principles outlined in the Quran are generally sympathetic to their interests, promising them "rights over men similar to those of men over

women".

...The separate spheres marked out for the two sexes by Islam certainly bear little relationship to the notions of gender which have been ushered in by the faminist revolution. But what matters is that many of the women in the West who have taken this unexpected path have done so out of choice rather than familial duty or historic obligation. They have been positively attracted by the sense of sisterhood and community they discover in Islam.

This tentative process of spiritual change suggests that increasing numbers of people are questioning the value system of their own culture. It raises important questions about the state of the Western moral tradition and how it might be fortified. Yet the effect of this (still modest) phenomenon is likely to be positive. The presence of Muslim

converts in British Society- many of them highly educated can only assist the process of mutual understanding between the two cultures which the Prince of Wales celebrated last month. Only those who have crossed the divide can truly understand what lies on either side"

''ٹائمز نے عورت اور اسلام کے موضوع پر جو تحقیق کی ہے، جیسا کہ اس کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے، اس چودہ سو سال پرانے دین کا فکری طور پر واضح ہونا اور اخلاقی طور پر حتمی ہونا بہت سی مغربی خواتین کے لئے پرکشش ثابت ہو رہا ہے، یہ وہ خواتین ہیں جو خود اپنے کلچر کی اخلاقی اضافیت کے فریب سے آزاد ہو چکی ہیں، (اخلاقی اضافیت سے ادار یہ نگار کا مقصد یہ ہے کہ مغرب میں کوئی اخلاقی قدر ابدیت کی حامل نہیں بلکہ زمان و مکان کے تقاضوں سے بدلتی رہتی ہے) اگر چہ کچھ خواتین پاکستانی یا بنگلہ دیشی مردوں سے شادی کرنے کے بعد اسلام قبول کر رہی ہیں لیکن دوسری خواتین اس لئے اسلام کی طرف چھلانگ لگا کر جا رہی ہیں کہ وہ ان کی طرف سے روحانی طور پر اصلاح ذات کا ایک آزادانہ عمل ہے۔

اگر چہ مسلمان ملکوں میں بہت سی عورتیں توہین آمیز عدم تقدس کا شکار ہیں لیکن جہاں تک قرآن کے بیان کئے ہوئے اصولوں کا تعلق ہے، وہ عام طور پر خواتین کے مفاد کے لئے ہمدردانہ ہیں اور یہ وعدہ کرتے ہیں

کہ عورتوں کے مردوں پر بھی اس جیسے حقوق ہیں جیسے کہ مردوں کے عورتوں پر۔

اسلام میں مرد وعورت کی دو صنفوں کے لئے جو مختلف دائرہٗ کار تجویز کئے ہیں وہ یقیناً ان منفی معیارات سے مطابقت نہیں رکھتے جو نسائیت کے انقلاب نے متعارف کرائے ہیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ مغرب کی بہت سی وہ خواتین جنہوں نے یہ غیر متوقع راستہ اختیار کیا ہے، انہوں نے اپنی آزاد مرضی سے ایسا کیا، کسی خاندانی دباؤ یا کسی تاریخی فریضے کی ادائیگی کے لئے نہیں وہ دراصل مثبت طور پر اس اخوت اور معاشرت کے شعور سے متاثر ہوئیں جو انہوں نے اسلام میں دریافت کیا۔

روحانی تبدیلی کا یہ عبوری عمل ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد خود اپنے کلچر کے نظام اقدار کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے، اس صورت حال سے مغرب کی اخلاقی روایت کی موجودہ حالت کے بارے میں اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں، اور یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس صورت حال کو کس طرح مستحکم بنایا جائے؟ تاہم (قبول اسلام کی) یہ صورتحال (جو ابھی تک اعتدال کی حدود میں ہے) بظاہر مثبت ثابت ہوگی، برطانوی سوسائٹی میں نو مسلموں کی موجودگی سے جن میں سے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، یہی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ دونوں ثقافتوں کے درمیان باہمی مفاہمت کے عمل میں مدد ملے جس پر گذشتہ ماہ پرنس آف ویلز نے زور دیا ہے۔ جو لوگ تفرقہ کی سرحد پار کر چکے ہوں، صرف وہی لوگ یہ بات ٹھیک ٹھاک سمجھ سکتے ہیں کہ دوسری طرف حقیقت کیا ہے؟''

یورپ اور امریکہ کے دو موقر جریدوں کی رپورٹ اور ان کے تاثرات آپ نے دیکھے۔

اگر چہ مسلمانوں کی طرف سے غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کا کوئی منظّم کام نہیں ہو رہا ہے بلکہ مسلمانوں کی مجموعی دینی اور اخلاقی حالت اسلام کی طرف ان کی کشش کا ذریعہ بننے کے بجائے واقعہ یہ ہے کہ رکاوٹ بن رہی ہے اور تیسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی ذرائع ابلاغ کی مہم زوروں پر ہے لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود مغرب میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار خود اہل مغرب کو چونکا رہی ہے، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی ممالک میں مخلصانہ دینی کام کا کتنا بڑا امیدان موجود ہے، اور اگر مسلمان اپنے قول وفعل کے ذریعہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام منظّم طور پر انجام دیں تو نتائج کس قدر بہتر ہو سکتے ہیں؟

مغرب میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد جہاں خوش آئند ہے وہاں مسلمانوں کو بہت سے کٹھن مسائل کا بھی سامنا ہے، یہ بات تو ٹائمنر کے الفاظ میں آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ جو لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں انہیں خود اپنی برادری اور ماحول کی طرف سے سخت مشکلات برداشت کرنی پڑتی ہیں، مغرب میں آزادیٔ فکر اور آزادیٔ رائے کا خواہ کتنا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہو، لیکن عملاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادیٔ فکر ورائے کے یہ خوبصورت اصول مسلمانوں کے لئے وضع نہیں ہوئے، دوسری طرف مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت ہے، عام تعلیمی اداروں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے، اور جس ماحول میں وہاں بچے تعلیم پاتے ہیں اس میں نہ صرف یہ کہ اسلام کی اخلاقی اقدار، بلکہ خود ایمان کو محفوظ رکھنا بھی کارے دارد ہے، لہذا مغرب میں رہنے والا ہر حساس مسلمان اس بات کے لئے فکر مند ہے کہ وہ کس طرح اپنی اولاد کو مسلمان برقرار رکھے؟

اس مسئلے کا اصل حل تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے الگ ہوں جہاں مسلمان بچے اسلامی ماحول میں پرورش پا سکیں اور اس سمت میں بعض کوششیں شروع بھی ہوئی ہیں، مختلف مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے اپنے تعلیمی ادارے قائم ہو رہے ہیں جن میں سے بعض مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ان اداروں میں بچوں کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ نہ صرف مناسب مقدار میں دینی معلومات فراہم کی جا رہی ہیں، بلکہ ان اداروں کا

مجموعی ماحول ان کی دینی اور اخلاقی تربیت میں مفید کردار ادا کر رہا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان تعلیمی اداروں کی تعداد بہت کم ہے، اور وہ تمام مسلمانوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں، لہذا زیادہ تر مسلمان اپنے بچوں کو دین سے آگاہ کرنے اور اسلامی تعلیمات سے ان کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے جو طریقے اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تقریباً ہر مسجد میں اور ہر اسلامی مرکز میں چھوٹے چھوٹے مکاتب اور مدارس قائم ہیں، ان میں سے بعض مدارس روزانہ شام کے وقت میں دو گھنٹے سے تین گھنٹے تک بچوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی خدمت انجام دیتے ہیں اور بعض مدرسے ہفتہ وار ہیں جہاں اتوار کے دن صبح سے دوپہر تک یہ خدمت انجام دی جاتی ہے، اور انہیں ,,سنڈے اسکول،، کہا جاتا ہے۔ بچوں کے والدین اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ عام اسکولوں سے چھٹی کے بعد شام کے وقت بچوں کو ان مدارس میں بھیجیں اس کے لئے والدین بڑی محنت برداشت کرتے ہیں، اس قسم کے مدرسے چونکہ دور دراز کے فاصلوں پر واقع ہیں اس لئے والدین بچوں کو خود ہی مدرسوں تک پہنچاتے اور خود ہی واپس لاتے ہیں، روزمرہ کے معاشی مشاغل کے ساتھ بچوں کو پہنچانے اور لانے کا یہ کام وہاں کی مصروف زندگی میں بہت مشکل کام ہے، لیکن جن مسلمانوں کو اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر ہے وہ یہ مجاہدہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ وہاں کے حساس مسلمانوں کو اپنے بچوں کی تربیت کی خصوصی فکر ہے، اور وہ قدم قدم پر بچوں کی نقل و حرکت کی نگہداشت کرتے ہیں اور اپنے گھریلو ماحول میں بھی انہیں اسلامی اقدار کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ ان کا قومی اور مذہبی تشخص مغرب کے اکثریتی باشندوں سے جدا ہے، مجھے وہاں یہ منظر دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی ہے کہ وہاں کے حساس مسلم گھرانوں کے بچوں میں اسلامی شعائر کے احترام اور شب و روز کے مختلف کاموں کے مواقع پر مسنون دعائیں پڑھنے کا اہتمام اتنا ہے کہ ہمیں خود پاکستان اور مسلم ملکوں میں بھی وہ اہتمام نظر نہیں آتا، اور بچے بعض

اوقات ایسی باتیں پوچھتے ہیں جو یہاں بڑوں سے بھی سننے میں نہیں آتیں، وہاں کے ماحول میں رہتے رہتے صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بچے اپنی آبائی زبانوں مثلاً اردو، عربی وغیرہ سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں، لہٰذا ان سے بات چیت انگریزی ہی میں کی جاسکتی ہے، وہ اردو، عربی لٹریچر سے بھی کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا پاتے اس لئے انہیں انگریزی لٹریچر کی ضرورت ہے اور جب وہ انہیں میسر آجاتا ہے تو وہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، دینی تقریروں میں شرکت کا بھی وہاں اچھا خاصا ذوق ہے، اور لوگ اہتمام کے ساتھ اپنے بچوں کو ایسی تقاریر میں شرکت کے لئے دور دور سے لاتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہی دینی فکر ہے، جو انہیں مغربی ملکوں میں نئے نئے ادارے قائم کرنے پر آمادہ کر رہی ہے، بعض تعلیمی اداروں کا ذکر تو میں نے اوپر کیا، اب وہاں ایسی اعلیٰ پیمانے پر دینی درسگاہیں بھی قائم ہو رہی ہیں جو اسلامی علوم میں دسترس رکھنے والے علماء پیدا کرسکیں تاکہ یہ علماء وہاں پر مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں، اس غرض کے لئے چند سال پہلے ریاست نیویارک کے شہر ''بفلو'' میں ہمارے محترم دوست ڈاکٹر اسماعیل صاحب نے ایک بڑا دارالعلوم قائم کیا ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لئے حلال گوشت کی بے شمار دکانیں جگہ جگہ قائم کی ہیں، حلال غذاؤں پر مشتمل ریسٹورنٹ بھی بڑی تعداد میں قائم ہوئے ہیں، اور بعض شہروں اور محلوں میں جاکر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم کسی مسلمان ملک میں کھڑے ہوں۔

مغربی ملکوں میں رہائشی مکان کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، عام طور سے لوگ بینکوں سے قرض لے کر مکان حاصل کرتے ہیں، لیکن جو مسلمان سود سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے ادارے قائم کر رہے ہیں جہاں لوگوں کو سود کے بغیر رہائشی سہولت مہیا ہو، ایسے چھوٹے چھوٹے ادارے ٹورنٹو، ٹیکساس، لاس اینجلس وغیرہ میں پہلے سے قائم ہیں اور اب ان میں مزید اضافے کی فکر مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے، ہمارے ایک سفید فام امریکی نو مسلم دوست عبدالقادر اسٹیون (جن کا سابق نام تھامس اسٹیون تھا) خاص طور پر اس کام

میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

وہ ,,جرنل آف اسلامک فنانس،، کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکالتے ہیں جس میں اسلام کے معاشی اور مالیاتی پہلوؤں پر مضامین اور خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، انہوں نے ریاست ,,اوھایو،، کے صمد گروپ کے ساتھ مل کر امریکی مسلمانوں کے لئے ایک غیر سودی رہائشی اسکیم شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے جو بڑے پیمانے پر پورے امریکہ میں کام کرنا چاہتی ہے جدہ کے ,,البرکہ،، گروپ کا تعاون بھی اسے حاصل ہے اس اسکیم کے قانونی پہلوؤں کی دیکھ بھال کے لئے انہوں نے نیویارک کے ماہرین قانون کی ایک مشہور فرم کوڈرٹ برادرز کی خدمات حاصل کیں، اسکیم کے شرعی، قانونی اور عملی پہلوؤں پر مشورے کے لئے انہوں نے کوڈرٹ برادرز کے دفتر میں ایک ملاقات رکھی تھی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا، جس میں کوڈرٹ برادرز کی طرف سے مسٹر پیٹر اپنے دو معاونین کے ساتھ موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے دوست عبدالقادر اسٹیون، البرکہ کی طرف سے ڈاکٹر صالح ملائکہ اور صمد گروپ کی طرف سے جناب بشیر احمد بھی شریک گفتگو تھے۔ یہ گفتگو کئی گھنٹے جاری رہی، اور اس کے بعد مسٹر پیٹر نے اپنے دفتر ہی میں جو مشہور زمانہ امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے سامنے ایک سر بفلک عمارت میں واقع ہے، دو پہر کے کھانے کا بھی اہتمام کیا تھا جس میں فرم کے دوسرے ممتاز ماہرین قانون کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اگر چہ اس کھانے میں اکثریت غیر مسلم حضرات کی تھی، لیکن ہم مسلمانوں کی رعایت سے مسٹر پیٹر نے کھانے میں صرف مچھلی اور سبزیوں پر اکتفا کیا تھا۔ مشروبات کو بھی صرف پھلوں کے رس اور پیپسی کولا کی حد تک محدود رکھا گیا تھا، کھانے پر بیٹھتے ہوئے مسٹر پیٹر نے میرے مختصر تعارف کے بعد دوسرے غیر مسلم حاضرین سے کہا کہ آپ لوگوں کے ذہن میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات اٹھتے رہتے ہیں، اگر آپ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کچھ سوالات کرنا چاہیں تو اس کے لئے یہ ایک مناسب موقع ہے، بس پھر کیا تھا...... چاروں طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور یہ کھانے کی محفل ایک دلچسپ محفل مذاکرہ میں تبدیل ہو گئی۔ بعض حاضرین کے سوالات قدرے جارحانہ بھی تھے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تھا کہ میں اطمینان سے ان کا جواب دیتا رہا۔ ایک مرحلے

پر سوالات کا مجموعی رخ دیکھتے ہوئے میں نے ایک اصولی بات کرنا مناسب سمجھا، میں نے عرض کیا کہ چونکہ سیکولر نظریۂ حیات مغرب کا سکہ رائج الوقت ہے اس لئے بنیادی طور پر یہ بات بسا اوقات مغربی ذہن کی سمجھ میں نہیں آتی کہ زندگی کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کو دین و مذہب کی جکڑ بند میں مقید کیوں کیا جائے؟ نیز یہ کہ تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے کی تعلیمات بیسویں اور اکیسویں صدی میں کیونکر کار آمد ہوسکتی ہیں؟ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوے میں نے مختصراً یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ زندگی کے تمام مسائل کو ٹھیک حل کرنے کے لئے تنہا عقل انسانی کس طرح ناکافی ہوتی ہے؟ اور اسے وحی الٰہی کی کیوں ضرورت ہے؟ پھر میں نے یہ بھی عرض کیا کہ آج مغربی دنیا سوویت یونین کی شکست وریخت اور سوشلزم کی ناکامی پر خوشیاں منا رہی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ سوشلزم سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کے ردعمل کے طور پر ابھرا تھا کیا وہ خرابیاں سرمایہ دار ممالک سے دور ہوگئیں؟ اگر نہیں تو سوویت یونین کے زوال کو سوشلزم کی شکست تو کہا جا سکتا ہے، سرمایہ داری کی فتح نہیں۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام اپنی وہ خرابیاں دور کرنے پر تیار نہ ہو تو کل کوئی اور ردعمل ظاہر ہوسکتا ہے، حاضرین کے سوالات کے جواب میں میں نے اسلام کی بعض معاشی تعلیمات کی تشریح کی اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی کہ جب کبھی کہیں ان تعلیمات پر عمل کی دعوت ابھرتی ہے تو مغرب میں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے یہ شور مچنا شروع ہو جاتا ہے کہ یہ بنیاد پرستی ہے، یہ رجعت پسندی ہے اور ان تعلیمات کے داعی گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، اور اس شور وغل کے نتیجے میں مفاہمت کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، حاضرین نے کھلے دل سے یہ گذارشات سنیں اور بعض اسلامی تعلیمات کی تشریح میں جو باتیں کہی گئی تھیں انہیں تخلیقی (Creative) قرار دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آج کی اس نشست کا یہی فائدہ ہو سکے کہ ہم محض نعروں اور پروپیگنڈوں سے متاثر ہوئے بغیر حقائق کا مطالعہ کرنے کا ارادہ کرلیں تو بھی یہ مجلس فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔ محفل برخاست ہونے کے بعد اگلے دن مسٹر تھامس اسٹیون ہوٹل میں میرے پاس ملنے کے لئے آئے اور مجھے مبارک باد دیتے ہوئے بتایا کہ کل کی گفتگو کا حاضرین پر اچھا اثر ہوا اور اس محفل کی باتیں بعد میں بھی

موضوع گفتگو بنی رہیں۔

امریکہ کے بعد میں نے چند روز کے لئے ویسٹ انڈیز کے مشہور جزیرے ,,بار بے ڈوس (Barbados)،،کا سفر کیا اس سے پہلے جب کبھی میں امریکہ یا کینڈا گیا بار بے ڈوس کے بعض احباب نے بڑی محبت سے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، مگر میں وقت کی کمی کی وجہ سے یہ فرمائش پوری نہ کر سکا، اس مرتبہ میں نے ان حضرات سے وعدہ کیا ہوا تھا جس کا ایفاء ضروری تھا اس لئے نیویارک سے فارغ ہو کر میں اس خوبصورت جزیرے میں چند روز قیام پذیر رہا۔

بار بے ڈوس ان جزیروں میں سے ایک جزیرہ ہے جنہیں انگریزی میں ,,ویسٹ انڈیز،، اور اردو میں ,,جزائر غرب الہند،، کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ جب کولمبس ان جزیروں کے پاس پہنچا تو اس نے یہ سمجھا کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا ہے، بعد میں یہ غلط فہمی تو دور ہو گئی، لیکن ان جزائر کا نام ,,غرب الہند،، ہی مشہور ہو گیا، یہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان ہلالی شکل میں پھیلے ہوئے بہت سے جزیرے ہیں جن میں کیوبا، جمیکا، ہیٹی، ٹرینڈاڈ، بہاماس، طوبیگو اور بار بے ڈوس وغیرہ شامل ہیں۔ کسی زمانے میں یہ تمام جزائر کسی نہ کسی یورپی طاقت کے زیر تسلط تھے، لیکن اب یہ سب آزاد ہو گئے ہیں، اور ان میں سے ہر جزیرہ اب ایک مستقل ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔

بار بے ڈوس اگر چہ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بہت چھوٹا سا جزیرہ ہے، لیکن اپنے قدرتی حسن اور ترقی یافتہ ہونے کے لحاظ سے ویسٹ انڈیز کے تمام دوسرے جزیروں پر فوقیت رکھتا ہے، جزیرے کا کل رقبہ صرف ایک سو چھیاسٹھ مربع میل ہے، شمال سے جنوب تک اسکی کل لمبائی اکیس میل اور مشرق سے مغرب تک اس کی کل چوڑائی صرف پندرہ میل ہے، بڑا شہر حقیقت میں ایک ہی ہے جسے برج ٹاؤن کہتے ہیں، باقی چھوٹی چھوٹی آبادیاں اطراف میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پورے جزیرے کی مجموعی آبادی صرف ڈھائی لاکھ کے قریب ہے، اور یہ تمام تر آبادی باہر سے آ کر بسنے والوں کی ہے ورنہ یہاں کی اصل آبادی جوار اداک قبائل پر مشتمل

تھی اب اس کا ایک متنفس بھی موجود نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یورپی آبادکاروں نے ان قبائل کا بیج ہی ماردیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ قبائل آدم خور تھے، اب معلوم نہیں کہ یہ بات سامراجی ظلم وستم پر پردہ ڈالنے کے لئے کہی گئی ہے، یا واقعی وہ لوگ آدم خور تھے؟ بہرکیف اب آبادی کا بیشتر حصہ ان سیاہ فام لوگوں پر مشتمل ہے جو جنوبی امریکہ یا افریقہ کے بعض خطوں سے غلام بنا کر یہاں لائے گئے تھے، تقریباً دس فی صد آبادی سفید فام لوگوں کی بھی ہے جو اس جزیرے کے فرنگی فاتحین کی یادگار ہے ۱۹۵۸ء تک یہ جزیرہ برطانوی حکمرانوں کے زیر تسلط تھا، ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک جزائر غرب الہند کے وفاق میں شامل رہا، اور ۱۹۶۶ء میں مکمل طور پر آزاد ہوگیا، اب یہ مستقل ملک ہے جو اتنے چھوٹے رقبے اور آبادی کے باوجود دو ایوانی مقنّنہ رکھتا ہے، اور دولت مشترکہ کا رکن ہے، جزیرہ اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے سیاحوں کی آماجگاہ ہے اور چونکہ یہ خط استواء کے قریب واقع ہے اس لئے اس میں سردی نہیں پڑتی، اور موسم عام طور سے معتدل رہتا ہے، چنانچہ یورپ اور امریکہ کی شدید سردی سے گھبرائے ہوئے لوگ موسم سرما میں عموماً چھٹیاں یہاں آکر گذارتے ہیں اور گنے کے علاوہ اس ملک کا دوسرا بڑا ذریعہ آمدنی سیاحت ہے۔

جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی تو وہ بعض ہندوستانی باشندوں کو ملازمت کے لئے یہاں لے آئے تھے، اس طرح یہاں بہت سے ہندوستانی نسل کے لوگ بھی آباد ہوگئے۔ بعض ہندوستانی تاجر یہاں تجارتی مقصد سے بھی آبسے، اس طرح یہاں ہندوستانیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے، جن میں سے مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، اگرچہ مسلمانوں کی یہ تعداد جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں بہت تھوڑی سی ہے لیکن یہ لوگ قابل صد تبریک وستائش ہیں کہ انہوں نے اپنا اسلامی تشخص پورے اہتمام کے ساتھ اس طرح باقی رکھا ہے کہ ان کا دینی جذبہ بہت سے مسلم ملکوں کے باشندوں سے بھی کہیں زائد ہے، برج ٹاؤن کے چھوٹے سے شہر میں دو شاندار مسجدیں ہیں جن میں باقاعدہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے، دونوں مسجدوں میں بچوں کی دینی تعلیم کے لئے مدرسے قائم ہیں، ہر مسلمان بچہ اسکول کی چھٹی

کے بعد لازماً دو گھنٹے ان مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے جہاں اسے بنیادی اسلامی تعلیمات فراہم کی جاتی ہیں، حافظ بچوں کی تعداد بھی کافی ہے، بار بے ڈوس کا کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو بچپن میں ان مدرسوں میں نہ پڑھا ہو، یہیں سے وہ پختہ اسلامی عقائد واعمال سیکھ کر ایک مسلمان کی طرح اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے، ایک مدرسے میں میرا خود جانا ہوا جہاں اس وقت تقریباً اسی نوے بچے زیر تعلیم تھے، بچوں نے دلکش آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کی، میرے سوال کرنے پر مختلف اوقات میں پڑھی جانے والی مسنون دعائیں سنائیں، قرآنی آیات اور احادیث کا انگریزی میں ترجمہ سنایا، اور حد تو یہ ہے کہ اردو میں نظمیں سنائیں، ان کے انگریزی لب ولہجے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں یہ اردو الفاظ یاد کرنے میں کتنی دقت ہوئی ہوگی؟ لیکن اساتذہ کا کہنا تھا کہ انہیں ہم ابتدائی اردو ضرور پڑھاتے ہیں تاکہ اردو لٹریچر سے ان کا رشتہ برقرار رہے۔

وہاں کے مسلمانوں کی فرمائش پر میرے قیام کے دوران متعدد دینی مجلسیں بھی رکھی گئیں۔ اگرچہ کرسمس کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کی تجارتی مصروفیات بہت بڑھی ہوئی تھیں، لیکن ان دینی مجلسوں میں حاضری پھر بھی اتنی زیادہ تھی کہ اس سے یہاں کے مسلمانوں کے دینی ذوق وشوق کا اندازہ ہوتا تھا، دو مجلسیں خواتین کے لئے بھی رکھی گئیں اور خواتین پردے کے مکمل اہتمام کے ساتھ ان میں بڑی تعداد میں شریک ہوئیں۔

میں بار بے ڈوس میں پانچ دن رہا اور ہر روز یہاں کے مسلمانوں کی دینی سرگرمیوں کے بارے میں بڑی خوشگوار معلومات حاصل ہوتی رہیں، اور یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اس دور افتادہ جزیرے میں جو مغربی سیاحت کے تمام فتنوں میں گھرا ہوا ہے، اور جس کے بارے میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ یہاں شادی کا زیادہ رواج نہیں بلکہ مرد وعورت کسی باقاعدہ شادی کے بندھن سے وابستہ ہوئے بغیر ایک ساتھ رہنا شروع کر دیتے ہیں، اور اس طرح تقریباً ستر فیصد غیر مسلم آبادی بغیر شادی کے پیدا ہوئی ہے، ایک ایسے ماحول میں مسلمانوں کا دینی شعور کتنا پختہ اور ان کے عقائد واعمال کتنے راسخ ہیں؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ دارالعلوم دیوبند کے فیض

یافتہ بعض علماء نے یہاں انتھک کام کر کے مسلمان آبادی کو دینی شعور سے بہرہ اندوز کیا ہے، اب بھی دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل اور ہندوستان اور پاکستان کے دینی مدارس کے متعدد فارغ التحصیل علماء یہاں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اور ان کی مخلصانہ خدمات کی برکت کھلی آنکھوں نظر آتی ہے۔

میرے میز بانوں نے جزیرے کی سیر بھی خوب کرائی۔ بار بے ڈوس کے ساحل بہت خوب صورت ہیں، یہاں سمندر کا پانی نہایت شفاف اور ریت مٹی سے پاک ہے، اسی سمندر کے پانی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ساری مغربی دنیا سے سیاح یہاں آتے ہیں، ساحلوں پر شاندار ہوٹلوں کی ریل پیل ہے، یہاں کے بعض ہوٹل دنیا کے سب سے مہنگے ہوٹل شمار ہوتے ہیں، ان میں سے بعض کا یومیہ کرایہ دو ہزار ڈالر تک ہے، بار بے ڈوس کے قیام میں ایک نیا تجربہ آبدوز کشتی کے سفر کا ہوا، یہاں سیاحوں کو آبدوز کشتی میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا دلچسپ سفر کرایا جاتا ہے، میرے میز بانوں نے بتایا کہ یہ انتظام دنیا میں صرف چند جگہوں پر ہے اس لئے اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے، چنانچہ ایک دن ہم اس یادگار تجربے سے بھی لطف اندوز ہوئے، یہ ایک چھوٹی سی آبدوز ہے جس میں اٹھائیس افراد بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں، یہ سطح سمندر سے ۱۵۰ فٹ گہرائی تک لے جاتی ہے، اور سمندر کی اندرونی دنیا کا نظارہ کراتی ہے، جونہی آبدوز سمندر کے اندر گئی تو وہاں سمندر کے نیچے ایک عجیب وغریب کائنات نظر آئی، بیشتر مچھلیوں اور سمندری جانورں کے علاوہ یہاں پورے پورے جنگل ہیں جن میں عجیب وغریب درخت اور پودے دعوت نظارہ دیتے ہیں، سرسبز اور شاداب پہاڑ ہیں جن کے حسن و جمال کی تعریف کرنا مشکل ہے، ان پہاڑوں کی سطح پر پڑے ہوئے پتھروں کے بارے میں گائیڈ نے بتایا کہ یہ جاندار پتھر ہیں، یعنی ایک مخصوص مدت میں ان کے سائز میں اضافہ ہوجاتا ہے، پھر آبدوز کا پائلٹ ہمیں ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں سمندر کے نیچے دور دور تک لق ودق صحرا اور ریگستان نظر آتا ہے، اس نے پچیس سال پہلے ڈوبے ہوئے ایک بحری جہاز کا نظارہ کرایا جو سمندر کی تہہ میں بیٹھا ہوا ہے، اور اس کے کیبنوں میں مچھلیوں اور دوسرے جانوروں

نے اپنے آشیانے بنالئے ہیں، اوراس کے عرشے پر سمندری پودے اُگ آئے ہیں، غرض یہ تقریبا ڈیڑھ گھنٹے کا زیر سمندر سفر بڑا منفرد یادگار اور دلچسپ تھا، سمندر کے نیچے حیوانات، جمادات اور نباتات کا جو جہان آباد ہے اسے دیکھ کر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ تبارک اللہ أحسن الخالقین.

بار بے ڈوس کی ایک اور یادگار یہاں کا ایک غار ہے جسے ہیریسن غار (Harison Cave) کہتے ہیں، یہ ایک بلند پہاڑ کی جڑ میں ایک میل لمبا غار ہے، جو بتدریج زمین کے نیچے تک چلا گیا ہے، اوراس کا آخری سرا اس کے دہانے سے ۱۸۰ فٹ نیچے ہے، اس غار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی چھت اور دیواروں سے مسلسل پانی ٹپکتا رہتا ہے، پانی کے ٹپکنے سے یہاں لاتعداد سفید برفانی پتھر (Stalactites) چھتوں سے لٹکے نظر آتے ہیں، اور نشیبی دیواروں پر انہی جیسے (Stalagmites) کی بھی بہت بڑی تعداد ہے، یہ سفید برفانی پتھر مرورایام سے بڑھتے رہتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ دس سال بعد ان میں ایک سینٹی میٹر کا اضافہ ہوتا ہے۔ سیاحوں کی سہولت کے لئے غار کے دھانے سے ایک چھوٹی سی ٹرین چلائی گئی ہے، اور لوگ اس ٹرین میں بیٹھ کر اس غار کے عجائب قدرت کا نظارہ کرتے ہیں، یہ ٹرین ایک میل تک جاتی ہے، اور قدم قدم پر زیر زمین پائی جانے والی عجیب وغریب مخلوقات کے نت نئے نظارے دکھاتی ہے۔ فتبارک اللہ أحسن الخالقین.

ری یونین کے جزیرہ میں



۱۱ رمضان ۱۴۱۵ھ
۱۲ فروری ۱۹۹۵ء

ری یونین کے جزیرے میں

امریکہ کے بعد میرے سفروں کا دوسرا سلسلہ افریقہ کی طرف تھا، بیچ میں اللہ تعالی نے چندروز حرمین شریفین میں گذارنے کی بھی سعادت عطا فرمائی، اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یہ حقیقت کھلی آنکھوں مشاہدے میں آئی کہ دنیا کے حسین ترین خطوں کے مناظر ایک طرف رکھدیئے جائیں تو اس بے آب وگیاہ وادی کا حسن و جمال ان سب پر بھاری ہے۔

اگر جنت بریں روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

حرمین شریفین کی پر بہار آغوش میں چھ دن گذارنے کے بعد مجھے براعظم افریقہ کے ایک چھوٹے سے جزیرے ,,ری یونین،، جانا تھا، وہاں جانے کے لئے پرواز چونکہ نیروبی سے ملتی تھی، اس لئے ایک رات کینیا کے اس دارالحکومت میں بھی قیام رہا، اور اگلے روز نیروبی ائیر ماریشس کے طیارے کے ذریعہ روانگی ہوئی اس طیارے نے جزائر القمر کے خوبصورت دار الحکومت مورونی میں مختصر قیام سمیت پانچ گھنٹے میں ری یونین پہنچادیا، دنیا کے نقشے پر براعظم افریقہ کو دیکھیں تو اس براعظم کے جنوب مشرق میں مڈغاسکر اور ماریشس کے درمیان ایک چھوٹا سا نقطہ نظر آتا ہے، یہی چھوٹا سا نقطہ جزیرۂ ری یونین ہے، اس جزیرے پر فرانس کی حکمرانی ہے، اور اگرچہ یہ پیرس سے ہزاروں میل دور واقع ہے، اور براعظم بھی مختلف ہے، لیکن فرانس ہی کا ایک صوبہ شمار ہوتا ہے، کسی زمانے میں یہ فرانس کی کالونی تھی، لیکن اب انتظامی طور پر اسے فرانس ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے، یہاں کے شہریوں کو فرنچ نیشنلٹی حاصل ہے، اور

یہاں کی زبان سے لے کر کرنسی تک ہر چیز فرنچ ہے، کہا جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے آغاز تک یہ جزیرہ غیر آباد تھا، شروع میں کچھ پرتگیزی ملاح یہاں آ کر اترے، اس کے بعد جب فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے تجارتی روابط قائم کئے تو اسکے جہاز افریقہ کے جنوبی سرے (راس امید) سے گھوم کر بحر ہند میں داخل ہوتے تھے، اور راس امید سے انڈیا کے طویل سفر کے دوران اس جزیرے کو ایک درمیانی منزل قرار دے کر یہاں لنگر انداز ہوتے تھے، یہ جزیرہ اپنے قدرتی مناظر، اپنے وسائل اور موسم کے لحاظ سے ان فرانسیسی تاجروں کو پسند آ گیا، اورانہوں نے یہاں آباد ہونا شروع کر دیا، اور اس طرح یہ جزیرہ دنیا کی آباد برادری میں شامل ہو گیا، اس وقت سے یہاں کی اصل آبادی سفید فام فرانسیسیوں کی ہے، لیکن یہ لوگ مختلف کاموں کے لئے بعض سیاہ فام افریقیوں کو غلام بنا کر لائے اور اس طرح یہاں افریقی نسل کے کچھ لوگ بھی آباد ہو گئے، غلامی کے خاتمے کے بعد ایشیا، بالخصوص ہندوستان سے بہت سے لوگ مزدوروں اور ملازمین کے طور پر یہاں لائے گئے، بعض ہندوستانیوں نے تجارت کے لئے بھی یہاں کا رخ کیا، اور اس طرح ہندوستانی نسل کے بہت سے لوگ بھی ری یونین میں آباد ہو گئے، مگر اس طرح کہ اب ان کی نئی نسلیں اپنی مادری زبانیں بھول چکی ہیں، اور فرنچ ہی نے ان کی مادری زبان کی صورت اختیار کر لی ہے، انہی ہندوستانی اور افریقی نسل کے باشندوں میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے۔

یہ چھوٹا سا جزیرہ صرف چالیس میل لمبا اور تیس میل چوڑا ہے، اور اسکا مجموعی رقبہ کل نو سو ستر مربع میل ہے، اور اسکی آبادی تقریبا ساڑھے پانچ لاکھ افراد پر مشتمل ہے، ان میں مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہوگی، لیکن وہ بڑے منظم اور باشعور مسلمان ہیں، جزیرے کے تقریبا ہر شہر میں شاندار مسجدیں ہیں، بچوں کی تعلیم کے مراکز ہیں، اور پورے علاقے میں مسلمانوں کی دینی ضروریات کی دیکھ بھال کے لئے مسلمانوں نے ایک ادارہ ,,المرکز الاسلامی،، قائم کیا ہوا ہے، جس کا فرنچ نام ,,سنٹر دی اسلامک،، ہے۔ اس مرکز کا صدر دفتر ,,سینٹ پیٹرس،، نامی شہر میں ہے، اور اسکی طرف سے فرانسیسی زبان میں ایک ماہانہ دینی

رسالہ بھی شائع ہوتا ہے، مرکز نے بہت سی دینی کتابوں کا فرنچ ترجمہ بہت دلکش انداز میں شائع کیا ہے، اور بہت سی کتابیں خود فرنچ زبان میں تیار کرائی ہیں، اور مرکز کی طرف سے فرانسیسی زبان کا یہ لٹریچر صرف ری یونین ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کے ان تمام ممالک میں تقسیم کیا جاتا ہے جہاں فرنچ بولنے والے مسلمان آباد ہیں، اس کے علاوہ مختلف افریقی ممالک کے لئے بھی یہ مرکز دینی کتب کی فراہمی کا گرانقدر کام انجام دے رہا ہے۔ اسی مرکز کی طرف سے ملک بھر کی مساجد اور مدارس کا عمومی انتظام ہوتا ہے، مساجد کے لئے ائمہ وخطباء متعین کئے جاتے ہیں، ہر مسجد کے ساتھ ملحق مدرسے کی دیکھ بھال بھی یہی مرکز کرتا ہے، مرکز ہی کی تحریک پر بہت سے نوجوانوں کو ہندوستان اور پاکستان کے دینی مدارس میں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا جو یہاں سے اسلامی علوم کی تکمیل کرنے کے بعد اپنے وطن پہنچے ہیں۔ یہ نوجوان علماء فرانسیسی زبان میں تحریر وتقریر کے ذریعے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، اور عام مسلمانوں پر ان کی خدمت کے اثرات اتنے نمایاں ہیں کہ ہر شخص انہیں کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے۔

,,المرکز الاسلامی،، کے صدر مولانا سعید انگار اور ناظم اعلیٰ مولانا محمد اسحاق گنگات ماشاء اللہ بڑے فعال اور ہر دلعزیز شخصیت کے حامل ہیں، انہوں نے اپنی مخلصانہ جدوجہد سے علاقے کے تمام علماء اور دینی حلقوں کو اس طرح جوڑا ہوا ہے کہ وہ سب ایک مشترک دھن کے ساتھ شیر وشکر ہو کر کام میں لگے ہوئے ہیں، مولانا مفتی محمد درگئی صاحب مرکز کے نائب صدر ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، اور انہوں نے وہیں پر فتوی کی تربیت بھی حاصل کی ہے، اور اب ری یونین میں مفتی کی حیثیت میں خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ سب حضرات پشتوں سے ری یونین ہی کے باشندے ہیں، فرنچ انکی مادری زبان ہے، لیکن انہوں نے برصغیر کے مختلف دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے اردو سیکھی، اب وہ خاصی روانی سے اردو بولتے ہیں اور ان کے ذریعے ری یونین کے باشندوں کا رابطہ عربی اور اردو لٹریچر سے قائم ہے۔

جزیرۂ ری یونین میں فرانسیسی تہذیب اپنی پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ چھائی ہوئی ہے، اور سیاحت کا ایک بڑا مرکز ہونے کی وجہ سے جدید مغربی تہذیب کے تمام لوازم یہاں موجود ہیں، لیکن اس ماحول میں مسلمان اپنا دینی تشخص اس طرح قائم کئے ہوئے ہیں کہ بہت سے مسلم ملکوں میں بھی دینی غیرت وحمیت اور اسلامی شعائر کی پابندی کے وہ مناظر نظر نہیں آتے جو یہاں نظر آتے ہیں، اسکی بنیادی وجہ انہی علماء کرام کی مخلصانہ جدو جہد ہے، یہ دیکھ کر خاص طور پر بڑی مسرت ہوئی کہ یہاں کے تمام دینی حلقوں میں مکمل اتحاد واتفاق اور یگانگت ہے، فرقہ واریت اور دھڑے بندیوں کا گذر نہیں، اور اسی کی برکت ہے کہ دینی کام نہایت مؤثر اور مفید ثابت ہو رہا ہے، کوئی مسلم گھرانہ ایسا نہیں ہے جو اپنے بچوں کو کسی اور کام میں لگانے سے پہلے مسجد سے ملحق مکاتب میں ابتدائی دینی تعلیم نہ دلواتا ہو، چنانچہ تمام مسلمان جو بچپن میں ان مکاتب سے گذر کر زندگی میں داخل ہوئے ہیں، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آراستہ ہیں، جو ان کے روزمرہ معمولات میں واضح طور پر جھلکتی ہیں۔

مسجدیں بڑی خوبصورت، شاندار، صاف ستھری اور انتہائی منظّم ہیں، اور مسلمانوں کے لئے مثالی مرکزیت کی حامل ہیں، پنج وقتہ نمازوں میں بھی نمازیوں کی تعداد بہت بڑی ہوتی ہے، مسلمانوں کی اکثریت نماز کی پابند ہے، اور دینی تقریروں میں شرکت کا خاص ذوق رکھتی ہے، اکثر مسلمان تجارت پیشہ ہیں، اور مالی اعتبار سے مستحکم، لیکن دولت کی فراوانی نے ان میں غرور پیدا نہیں کیا۔

مجھے یہاں کے ,,المرکز الاسلامی،، نے بعض اجتماعی اور بعض فقہی مسائل میں مشورے کے لئے مدعو کیا تھا، اس کے لئے مرکز کی طرف سے اہل علم کے ساتھ متعدد نشستیں ہوئیں، سوالات کی ایک طویل فہرست پہلے سے تیار تھی، اور ان پر گفتگو چار طویل مجلسوں میں مکمل ہوئی، ان سوالات ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ مرکز کو عام مسلمانوں کے مسائل سے کس قدر دلچسپی ہے، اور وہ ان مسائل کے بارے میں دنیائے اسلام کے اہل علم کی تازہ ترین تحقیقات جاننے کے لئے کتنے بیتاب ہیں۔

اپنے پانچ روزہ قیام کے دوران میں نے ری یونین کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کے دینی مراکز دیکھے، اہل علم کے ساتھ مذکورہ بالا نشستوں میں مصروفیت رہی، دو جگہ عام مسلمانوں سے بھی خطاب ہوا جس کا ترجمہ مقامی حضرات نے کیا، اور اس کے ساتھ ہی ری یونین کے قدرتی حسن و جمال سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، اس چھوٹے سے جزیرے کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت مناظر فطرت سے مالا مال کیا ہوا ہے، جزیرے کے چاروں طرف ساحل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہیں اور ہر شہر کے ایک طرف ساحل سمندر اور دوسری طرف اونچے اونچے سرسبز و شاداب پہاڑ دعوتِ نظارہ دیتے ہیں، اور اس محل وقوع کے نتیجے میں اس جزیرے کو یہ منفرد خصوصیت حاصل ہے کہ کسی شخص کو جس قسم کے موسم کی ضرورت ہو، وہ اسے ایک آدھ گھنٹے کی کار کی مسافت پر میسر آ سکتا ہے، اگر ساحلی شہر میں گرمی ہو تو شہر کے دوسری جانب پہاڑ پر صرف آدھے گھنٹے کی ڈرائیو اسے ٹھنڈے موسم میں پہنچا سکتی ہے، چونکہ ری یونین خط استوا کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے دسمبر اور جنوری یہاں گرمی کے مہینے شمار ہوتے ہیں، چنانچہ آج کل ساحلی شہروں میں موسم گرم تھا، لیکن رات گذارنے کے لئے ہم کسی قریبی پہاڑ پر چلے جاتے اور وہاں کمبل اوڑھنا پڑتا تھا۔

اگرچہ ری یونین کی سب سے اہم پیداوار گنا ہے، لیکن ہر قسم کے اعلیٰ پھل بھی یہاں پیدا ہوتے ہیں، آج کل چونکہ یہاں گرمی کا موسم تھا، اس لئے بہت نفیس آم اور نہایت شاداب لیچیاں ہر دسترخوان پر موجود تھیں، اسکے علاوہ برصغیر کے گرمی کے معروف پھلوں میں سے تقریباً ہر پھل فراوانی سے دستیاب تھا۔

جزیرے کی ایک اہم خصوصیت یہاں کا آتش فشاں پہاڑ ہے، جو دنیا کے بڑے آتش فشاں پہاڑوں میں شمار ہوتا ہے، ہر چند سال کے بعد اس پہاڑ سے لاوا ابلتا ہے، اور بہتی ہوئی سرخ آگ کی شکل میں سمندر تک اپنا راستہ بنالیتا ہے، سمندر کے ساحل تک پہنچ کر جب یہ لاوا ٹھنڈا ہوتا ہے تو جم کر سیاہ پتھروں کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو جزیرے کے ساحل پر دور دور تک پھیلے نظر آتے ہیں، سیاح اس آتش فشاں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے ہیں، لیکن آتش

فشاں کی بھٹی تک پہنچنے کے لئے راستہ بڑا دشوار گزار اور پر خطر ہے، کیونکہ چلتے چلتے بعض جگہ زمین اچانک اتنی نرم ہو جاتی ہے کہ انسان اس میں دھنس کر رہ جاتا ہے، اور اس طرح یہ زمین کئی سیاحوں کو نگل چکی ہے۔ ہمارے میزبانوں نے ہمیں اس عجوبۂ قدرت کا نظارہ کرانے کیلئے ہیلی کاپٹر کا ذریعہ استعمال کیا، یہ ہیلی کاپٹر ہمیں آتش فشاں کے عین دہانے کے اوپر لے گیا، یہ ایک سر بفلک پہاڑ کی چوٹی ہے، جس کے اوپر تقریباً چار پانچ مربع کیلومیٹر کا ایک قدرتی حوض جیسا بنا ہوا ہے، اس حوض کے کناروں اور فرش پر جگہ جگہ تنور کی سی بھٹیاں نظر آتی ہیں ان بھٹیوں کے دہانے سرخ ہیں، اور یہیں سے لاوا ابلتا ہے، اگر لاوا کم ہو تو وہ اس حوض کی حد تک محدود رہتا ہے، اور اگر زیادہ ہو تو وہ سینکڑوں فٹ کی بلندی تک اچھلتا ہے، اور پھر پہاڑ کی کسی بیرونی سطح پر گر کر آبشار کی سی صورت میں سطح سمندر کی طرف رواں ہو جاتا ہے، یہاں کے باشندوں کا بیان ہے کہ جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو فضا میں دور دور تک سرخی بکھر جاتی ہے، اور پورے جزیرے میں شدید تپش محسوس ہوتی ہے، ایک عینی شاہد نے بتایا کہ آخری بار جب ۱۹۹۲ء میں آتش فشاں پھٹا تو وہ اسے دیکھنے کے لئے تقریباً دو میل قریب تک گئے گرمی کی شدید تپش سے ان کی جلد سیاہی مائل ہو گئی، اور سیاہی کی یہ تہہ کافی عرصے کے بعد ان کے جسم سے جدا ہوئی، عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ پہاڑوں کی سطح سے پھسلتی ہوئی یہ سیال آگ جتنی ہولناک اور تباہ کن ہوتی ہے، اتنی ہی خوش منظر بھی ہوتی ہے، چنانچہ ری یونین کے تعارفی کتابچے اس آتشِ سیال کے مختلف مناظر کی تصویروں سے بھرے ہوئے ہیں اس لحاظ سے حقیقت شناس نگاہ ہو تو یہ آتش فشاں دنیا میں جہنم کی معنوی تصویر ہے، جس کا ظاہری رخ (یعنی گناہوں کے اعمال) بظاہر خوبصورت ہیں، لیکن ان کے اندر ہولناک آگ بھری ہوئی ہے۔

ہیلی کاپٹر نے اس کوہِ آتش فشاں کے نظارے کے علاوہ ہمیں پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گلی کی بھی سیر کرائی جو بہت سے آبشاروں سے بھری ہوئی ہے، ان میں سے ایک آبشار چھ سو میٹر کی بلندی سے گر رہا ہے، اور اسکے حسن و رعنائی کا صحیح نظارہ ہیلی کاپٹر کے بغیر ممکن نہیں۔

جنوبی افریقہ میں



۱۸ رمضان ۱۴۱۵ھ
۱۹ فروری ۱۹۹۵ء

جنوبی افریقہ میں

ری یونین کے بعد میری اگلی منزل جنوبی افریقہ تھی، چنانچہ جنوری کا تیسرا ہفتہ وہاں گذرا میں پہلے بھی بارہا جنوبی افریقہ جا چکا ہوں، لیکن اس ملک کے آزاد ہونے کے بعد یہ میرا پہلا سفر تھا، اور توقع کے مطابق اس مرتبہ وہاں دنیا بدلی ہوئی دیکھی، دنیا کے انقلابات سے سبق لینے والوں کے لئے جنوبی افریقہ کی تاریخ میں عبرت وموعظت کے بڑے سامان ہیں، اس لئے آج تھوڑا سا تذکرہ اسی ملک کا ہو جائے۔

جنوبی افریقہ اس ملک کا نام ہے جو افریقی براعظم کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے، اور اسکے بڑے شہروں جوہانسبرگ، پریٹوریا، ڈربن اور کیپ ٹاؤن کو یورپ اور امریکہ کے جدید ترقی یافتہ شہروں کے مقابلے میں بلاخوف تردید پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن اس ملک کی بدقسمتی یہ رہی کہ چند سال پہلے تک یہاں نسل پرستی کا عفریت اپنی بدترین صورت میں مسلط تھا، اور یہاں کی نوے فیصد اصل سیاہ فام آبادی دس فی صد گوروں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تاریخ کے بدترین ظلم وستم کا سامنا کر رہی تھی۔

افریقی براعظم کے دوسرے بیشتر ملکوں کی طرح اس ملک کی اصل آبادی سیاہ فام قبائل پر مشتمل تھی، جو اس علاقے کے اصل باشندے تھے، لیکن ان پر گوروں کے تسلط کا آغاز اس طرح ہوا کہ پندرھویں صدی عیسوی میں مغربی ممالک ہندوستان میں اپنی تجارت اور اس کے پردے میں اپنی سامراجی سیاست کو فروغ دینے کے لئے مدت سے کسی ایسے راستے کی تلاش

میں تھے جو مسلمانوں کی تگ وتاز سے مامون ہو، اس غرض کے لئے انہوں مختلف بحری مہمات روانہ کیں، یہاں تک کہ جب ۱۴۸۷ء میں برتلمائی ڈائز افریقہ کے جنوبی سرے تک پہنچ کر واپس آیا تو پرتگال کے بادشاہ جان دوم نے افریقہ کے اس جنوبی سرے کی دریافت کو آئندہ مہمات کے لئے امید افزا سمجھ کر اس کو ,,راس امید،، (Cape of good Hope) کا نام دیا، اور دس سال بعد اسی راس امید کے راستے سے واسکوڈی گاما ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوا، اسی وجہ سے ابتک جنوبی افریقہ کا یہ خطہ ''راس امید'' کے نام سے موسوم چلا آتا ہے جسکا دارالحکومت ''کیپ ٹاؤن'' ہے۔

چونکہ بعد میں راس امید مغربی ممالک کے تجارتی سفروں کے لئے اہم ترین منزل بن چکا تھا، اس لئے وہ اس علاقے پر مدت سے دانت لگائے بیٹھے تھے، یہاں تک کہ ہالینڈ کی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۵۲ء میں اس علاقے پر قبضہ جمالیا، چونکہ ان گوروں کی تعداد بہت کم تھی، اور مقامی سیاہ فام آبادی پر مستقل غلبہ پانے کے لئے زیادہ بڑی تعداد درکار تھی، اس لئے انہوں نے یہاں سفید فام آبادی بڑھانے کی تدبیریں شروع کیں، اور ہالینڈ کے باشندوں کو یہاں آباد کرنے کے لئے مہم چلائی، ہالینڈ کے باشندے یہاں آنے کو تیار نہ تھے، لیکن ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا شوق استعمار پورا کرنے کے لئے ہالینڈ کے یتیم خانوں سے یتیم لڑکیاں اکٹھی کرکے یہاں بھیجیں، نیز جلاوطنی کے سزایاب لوگ زبردستی یہاں دھکیلے گئے، اس طرح رفتہ رفتہ یہاں سفید فام افراد کی تعداد بڑھی، اور ان کی نسل پھیل کر علاقے کی ایک قابل لحاظ آبادی بن گئی۔

ڈچ قوم کے جن افراد نے جنوبی افریقہ میں اپنی حکومت قائم کی، ان کا صرف عمل ہی نہیں، باقاعدہ عقیدہ اور فلسفہ یہ تھا کہ گوری نسل کے لوگ کالوں پر حکومت کرنے کا پیدائشی حق رکھتے ہیں، اور کالوں کا مقصد تخلیق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ گوروں کی غلامی کریں، اور ان کی خدمت انجام دیں، ان کے نزدیک سیاہ فام انسان (بلکہ تمام وہ انسان جو گوری نسل کے نہ ہوں) کسی انسانی عزت واحترام کے مستحق نہیں تھے، چنانچہ اسی عقیدے اور فلسفے کی بنیاد پر انہوں نے جنوبی افریقہ میں جو سیاسی اور سماجی نظام جاری کیا، اس میں ملک کی نوے فی صد سیاہ

فام آبادی کو اچھوت سے بدتر رتبہ دیا گیا، کالوں کی ہر چیز گوروں سے الگ رکھی گئی، وہ گوروں کی آبادیوں میں رہائش کے مستحق نہ تھے، ان کی آبادیاں، ان کے ریستوران، ان کی تفریح گاہیں، ان کی ٹرینیں غرض ہر چیز جدا تھی، گوروں کی آبادیوں اور دوسرے مقامات پر کتا داخل ہوسکتا تھا، مگر کالے افراد کے داخلے پر پابندی تھی، ایک دور ایسا بھی گذرا کہ اونچی عمارتوں میں لفٹ کا استعمال صرف گورا کرسکتا تھا، کالوں کو لفٹ استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی، ہر دفتر میں کالوں کے کاؤنٹر الگ تھے، گوروں کے الگ۔

جنوبی افریقہ کے زرق برق شہر تمامتر گوروں کے لئے مخصوص تھے، جوہانسبرگ ہو یا پری ٹوریا، ڈربن ہو یا کیپ ٹاؤن دن کے وقت ہر شہر کی دوکانوں، کارخانوں اور مکانات میں کالے مزدوری کرتے تھے، اور یہ شہر انہی کی محنت کے دم سے آباد تھے، لیکن کسی کالے کو نہ صرف یہ کہ وہاں مکان بنانے کی اجازت نہ تھی، بلکہ سورج غروب ہونے کے بعد کوئی سیاہ فام شخص ان شہروں میں ٹھہر نہیں سکتا تھا، ان شہروں کو بجلی کے قمقموں سے جگمگانے کے بعد یہ ہزارہا کالے افراد بسوں میں سوار ہوکر اپنی تنگ و تاریک بستیوں میں جانے پر مجبور تھے، جو ان شہروں سے میلوں دور واقع تھیں۔ شروع میں تو کسی کالے کی مجال نہ تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرسکے، بعد میں تعلیم کی اجازت ہوئی تو ان کی تعلیم گاہیں الگ رکھی گئیں جہاں تعلیم ایک خاص حد تک ہی دی جاسکتی تھی۔ اور جب عام شہری حقوق میں کالوں کے ساتھ برتاؤ یہ تھا تو سیاست میں کسی کالے کے عمل دخل کا سوال ہی کیا ہے؟ پارلیمنٹ تمام تر صرف دس فیصد سفید فام افراد کے لئے مخصوص تھی، کالے کو نہ ووٹ کا حق تھا، نہ پارلیمنٹ کی رکنیت کا۔

دوسری طرف جنوبی افریقہ میں چونکہ سونے اور پلاٹینم کی کانیں تھیں، اس لئے وہ گوروں کے لئے واقعی سونے کی چڑیا کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ یہاں کے قدرتی وسائل کو استعمال کرکے ملک کا شمار امیر ملکوں میں ہونے لگا، اور یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک نے اسکے ساتھ نہ صرف دوستانہ تعلقات قائم رکھے، بلکہ اسکی کھلم کھلا انسانیت سوز اندھیر گردی کے باوجود اسکی پشت پناہی کرتے رہے، البتہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک نے جنوبی افریقہ کی

نسل پرستی کے خلاف احتجاج کے طور پر اس سے اپنے تعلقات منقطع رکھے، اور عرصۂ دراز تک جنوبی افریقہ تیسری دنیا کے ملکوں سے مکمل طور پر کٹا رہا۔

شروع میں تو چونکہ ملک کی سیاہ فام آبادی تعلیم سے محروم تھی، اس لئے اس ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا شعور ہی اس میں پیدا نہ ہو سکا، لیکن رفتہ رفتہ جب کچھ افراد تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، اور انہوں نے اپنی قوم کی حالت زار کے خلاف آواز اٹھانی چاہی تو انہیں شدید اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا، ایسے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے لاپتہ ہو جاتے، اور ان کی باقی زندگی عقوبت خانوں کی نذر ہو جاتی۔

یہ حالات تھے جن میں نیلسن منڈیلا نے اپنی قوم کی آزادی کی جدوجہد شروع کی اور اسکی پاداش میں اپنی جوانی کے بہترین ستائیس سال جیل میں گذارے، اسکے جیل جاتے وقت گوروں کی حکومت اس قدر مستحکم تھی کہ بظاہر حالات اسکے اپنی جگہ سے ہلنے کا تصور مشکل تھا، لیکن منڈیلا کے جیل جانے کے بعد آزادی کی تحریک دبنے کے بجائے رفتہ رفتہ قوت حاصل کرتی گئی، نسل پرست حکومت کے خلاف نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا، اور دوسری طرف چونکہ حکومت اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھی، اس لئے ملک میں ایک خوفناک خونی انقلاب کا خطرہ سالہا سال یہاں کی فضا پر منڈلاتا رہا، یہ بات تو طے تھی کہ جبر واستبداد کا یہ تسلط ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گا، لیکن اندیشہ یہ تھا کہ بعض دوسرے افریقی ممالک کی طرح یہاں بھی یہ انقلاب خونریزی کے ذریعہ آئیگا، اور اس خوبصورت ملک میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ملک کو اس خوفناک خونریزی سے بچانے کا سہرا جہاں نیلسن منڈیلا کے صبر وتحمل کے سر ہے وہاں اسکا کریڈٹ آخری دور کی سفید فام حکومت کو بھی جاتا ہے، کہ اس نے بالآخر نوشتۂ دیوار پڑھا، اور پر امن انتقال اقتدار پر اصولی طور سے راضی ہوگئی، ورنہ طاقت کے نشے میں چور ظالموں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انکی آنکھیں اسی وقت کھلتی ہیں جب انکی فرعونیت کسی ,,بحر احمر،، میں غرق ہو چکی ہوتی ہے، لیکن جنوبی افریقہ کی آخری دور کی حکومت نے اولاً تو نسل پرستانہ قوانین کو منسوخ کیا، پھر منڈیلا کو رہائی دے کر اسکے ساتھ

مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا۔

دوسری طرف نیلسن منڈیلا نے بھی جوش انتقام سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنی قوم کو پرامن انقلاب کا تحفہ پیش کرنے کو ترجیح دی۔ عمر کے بہترین ستائیس سال قید و بند کی صعوبتوں میں گذارنے کے باوجود اسکی سیاسی پالیسیوں میں ذاتی دشمنی اور انتقام کی کوئی جھلک نہیں آنے پائی، جن لوگوں نے اسکی ذاتی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، وہ انہی کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھا، پھر ایک عبوری مدت تک انہیں اقتدار میں اپنا شریک قرار دینے پر راضی ہوگیا، اور بالآخر اپنی قوم کی آزادی کے لئے ایک ایسا فارمولا دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کے ذریعے کسی کی نکسیر پھوٹے بغیر قوم کو آزادی مل گئی۔

اس فارمولے کے تحت جب پہلی بار ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے تو منڈیلا کی پارٹی افریقن نیشنل کانگریس بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی، اور نیلسن منڈیلا کو آزاد جنوبی افریقہ کا پہلا صدر منتخب کیا گیا، اس عظیم الشان کامیابی کے موقع پر منڈیلا نے ریڈیو اور ٹی وی پر جو پہلی تقریر کی، وہ بھی اس کے تدبر کی دلیل تھی، اس نے قوم کو اس سیاسی فتح پر مبارکباد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس خطرے کو محسوس کیا کہ اس فتح کی خوشی میں ملک کی سیاہ فام آبادی انتقامی کارروائیاں کرسکتی ہے، اور ملک کی پرامن فضا ان سے متاثر ہوسکتی ہے، لہذا اس نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ اس عظیم کامیابی پر عوامی سطح پر کوئی جشن مسرت نہیں منایا جائیگا، کل سے ملک کا ہر فرد اپنے نئے ملک کی تعمیر کے لئے اپنے اپنے کام پر جائے، اور پہلے سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ کام کرے۔ یہی ہمارا جشن مسرت ہے۔

آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لئے نیلسن منڈیلا کو جن طویل اور صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑا ان کی داستان اس نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں بیان کی ہے جس کا نام ہے "The long walk to Freedom" یعنی ,,آزادی کا طویل سفر،،۔ یہ کتاب شائع ہونے کے بعد جب بک اسٹالوں پر آئی تو چند روز میں اسکے تمام نسخے فروخت ہوگئے۔

منڈیلا نے اپنے قوم کو آزادی دلانے کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اسے اپنی قوم کا ہیرو

بنانے کے لئے کافی ہے، لیکن اپنی اس کامیابی پر اچھلنے کے بجائے اسکی تمامتر توجہ اس وقت ملک کی تعمیر نو کی طرف ہے، ابھی تک اپنے آپ کو قومی نجات دھندہ قرار دے کر اپنی پرستش کرانے کا کوئی بھوت اسکے سر پر سوار معلوم نہیں ہوتا، جنوبی افریقہ میں اپنے حالیہ قیام کے دوران میں نے کسی بھی جگہ منڈیلا کی کوئی نمایاں تصویر نہیں دیکھی، اس نے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنی اور اپنے رفقاء کی سرکاری مراعات میں نمایاں تخفیف کی ہے، اور یہ احساس اس کی پالیسیوں میں جھلکتا نظر آتا ہے کہ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر کا مرحلہ آزادی حاصل کرنے سے زیادہ کٹھن اور صبر آزما ہے، اس کا واسطہ ایک ایسی قوم سے ہے جسے صدیوں کی گھٹن کے بعد پہلی بار آزاد فضا میسر آئی ہے، دوسری طرف تعلیم کی کمی نے اسے نظم وضبط اور اعلی انسانی اخلاق سے دور رکھا ہے، چنانچہ آزادی کے فوراً بعد دیہات کی آبادیاں جوق در جوق شہروں میں منتقل ہو رہی ہیں، اور بڑے بڑے شہروں میں ان لوگوں کی جھونپڑیاں دور تک پھیلی نظر آتی ہیں جو ان شہروں کے مجموعی مزاج سے کسی طرح میل نہیں کھاتیں، دوسری طرف غیر تعلیم یافتہ کالے افراد مناسب تعلیم وتربیت سے محروم ہونے کی بنا پر بہت سے جرائم کے خوگر ہیں، اور اس وجہ سے آزادی کے بعد شہروں میں چوری، ڈکیتی وغیرہ کے جرائم خاصی رفتار سے بڑھے ہیں، اور نئی آزاد حکومت کا امتحان یہ ہے کہ وہ ان نت نئے مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہے، اور امیر وغریب کے درمیان اس وقت جو بے انتہا فاصلہ ہے، اسے کس حسن تدبیر سے کم کر کے ملک کو ایک متوازن فضا فراہم کرتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے، اور اس علاقے میں مسلمانوں کی آمد کی بھی ایک عجیب اور عبرتناک تاریخ ہے جو آزاد فضا میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کو ضرور معلوم ہونی چاہئے، لیکن اسکی تفصیل انشاء اللہ آگے ذکر کروں گا۔

جنوبی افریقہ میں مسلمان



۲۵ رمضان ۱۴۱۵ھ
۲۶ فروری ۱۹۹۵ء

جنوبی افریقہ میں مسلمان

جنوبی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کے داخلے کی داستان بھی بڑی پر اثر ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اسلاف نے ہر خطے میں اسلام کی اشاعت اور تحفظ و بقا کے لئے کیسی عظیم قربانیاں دی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، جنوبی افریقہ کی اصل آبادی سیاہ فام قبائل پر مشتمل تھی، سترھویں صدی عیسوی میں ہالینڈ کی ڈچ قوم نے ایک طرف تو جنوبی افریقہ پر اپنا تسلط جمایا، اور دوسری طرف اسی زمانے میں ملایا اور اس کے قرب وجوار کے جزیروں کو بھی اپنے استعمار کے شکنجے میں کس لیا، ملایا اور اس کے قریبی جزیروں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اور وہاں بار بار مسلمانوں کی طرف سے جہاد آزادی کی تحریکیں اٹھتی رہتی تھیں، ان تحریکوں کو ڈچ قوم نے ہمیشہ اپنی عادت کے مطابق جبر وتشدد کے ذریعے دبایا، اور وہاں کے بہت سے مسلمان مجاہدین کو گرفتار کر کے غلام بنالیا۔ غلام بنانے کے باوجود ڈچ حکمرانوں کو یہ خطرہ تھا کہ یہ لوگ کسی بھی وقت بغاوت پر آمادہ ہو سکتے ہیں اس لئے ڈچ حکومت نے ان کو جلاوطن کر کے کیپ ٹاؤن بھیج دیا، تاکہ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور رہ کر یہ لوگ بالکل بے دست و پا ہو جائیں، چنانچہ ملایا اور اس کے آس پاس کے تقریباً تین سو مجاہدین غلام بنا کر پابہ زنجیر کیپ ٹاؤن لائے گئے۔

کیپ ٹاؤن میں ملایا کے ان مسلمانوں سے بڑی پر مشقت خدمتیں لی جاتیں، اور چونکہ

ڈچ حکمرانوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کا جذبۂ حریت دراصل ان کے سینے میں جلنے والی مشعلِ ایمان کا مرہونِ منت ہے، اس لئے انہیں اپنے دین سے منحرف کرنے اور ان کی نسلوں کو ایمان کے نور سے محروم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، نماز پڑھنا تو کجا ان ڈچ آقاؤں کی طرف سے انہیں کلمہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، ان بے بس مسلمانوں سے دن بھر سخت مشقت لی جاتی، اور اگر کوئی شخص نماز پڑھنے یا کسی اور عبادت میں مشغول ہونے کی جسارت کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

لیکن اس جبر وتشدد کے ذریعے ان غریب الوطن اور بے آسرا مسلمانوں کے دل سے ایمان کی شمع بجھائی نہ جاسکی، ظلم واستبداد کی چکی میں پسنے کے باوجود انہوں نے اپنے دین کو سینے سے لگائے رکھا، اور شدید مجبوری کی اس حالت میں بھی انہوں نے نماز تک کو نہیں چھوڑا، دن بھر محنت ومشقت کے کام کرنے کے بعد یہ اولوالعزم مجاہدین جب رات کو اپنی قیام گاہوں پر پہنچتے تو تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنے نگرانوں کے سونے کا انتظار کرتے رہتے، اور جب وہ سو جاتے تو رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر اپنی قیام گاہوں سے نکلتے، اور ایک پہاڑی پر چڑھ کر وہاں دن بھر کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتے تھے، آج کیپ ٹاؤن کا ہر مسلمان باشندہ وہ جگہ جانتا ہے جہاں یہ مغلوب ومقہور مسلمان رات کے سناٹے میں اپنے مالک کے حضور سر بسجود ہوتے تھے، میں نے بھی یہ جگہ دیکھی ہے، یہ قدیم شہر سے خاصے فاصلے پر ایک پہاڑی ہے، جس کے درمیان ایک کشادہ جگہ کو انہوں نے محفوظ سمجھ کر اپنے پروردگار کے سامنے سجدۂ نیاز گذارنے کیلئے منتخب کیا تھا، دن بھر شدید محنت کی تھکن سے چور ان مسلمانوں کا روزانہ یہاں آکر نماز پڑھنا ایک ایسا مجاہدہ ہے جس کا تصور ہی آنکھوں کو پرنم کردیتا ہے، اور یہاں کی فضا میں ان خدامست مجاہدین کے ذکر وتکبیر کی مہک آج بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

تقریباً اسی سال اللہ کے یہ بندے غلامی کی زنجیروں میں اسی طرح جکڑے رہے، اس پورے عرصے میں انہیں مسجد بنانا تو کجا، انفرادی طور پر نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی،

بالآخر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ برطانیہ کے گوروں نے کیپ ٹاؤن پر حملہ کر کے یہ علاقہ ڈچ قوم سے چھیننا چاہا، اور وہ ایک زبردست فوج لے کر راس امید کے ساحل تک پہنچ گئے، گویا چور کے گھر چکار آ گیا، اب ڈچ حکمرانوں کو ان انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسے جانباز سپاہیوں کی ضرورت تھی جو اپنی جان پر کھیل کر ان کا راستہ روک سکیں، اور جان کی قربانی دینے کے لئے ان غریب الوطن مسلمانوں سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا، چنانچہ ڈچ حکومت نے ان مجبور ومقہور مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس جنگ میں ڈچ حکومت کا نہ صرف ساتھ دیں، بلکہ انگریزوں کے مقابلے میں اس کے ہراول دستے کا کردار ادا کریں۔

اس مرحلے پر ان مسلمانوں کو پہلی بار موقع ملا کہ وہ ڈچ حکومت سے کوئی مراعات حاصل کرسکیں، لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہوں نے نہ کسی روپے پیسے کا مطالبہ کیا، نہ اپنے لئے کوئی اور راحت طلب کی، اسکے بجائے انہوں نے ڈچ آقاؤں سے کہا کہ اگرچہ ہمارے لئے انگریزوں اور ڈچ حکمرانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، لیکن ہم آپ کی خاطر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ ایک صورت میں پیش کر سکتے ہیں، اور وہ یہ کہ اس جنگ کے اختتام پر ہمیں کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد تعمیر کرنے اور اسمیں باجماعت نماز ادا کرنے کی اجازت دی جائے، ڈچ حکمرانوں نے یہ شرط منظور کرلی، اور اس طرح بیسیوں مسلمانوں نے اپنی جان دے کر یہاں ایک مسجد بنانے کی اجازت حاصل کرلی، یہ جنوبی افریقہ میں پہلی مسجد تھی جو ان مجبور ومقہور ملائی مسلمانوں نے تعمیر کی۔

میں نے یہ تاریخی مسجد دیکھی ہے۔ کم وبیش تین سو سال پہلے بنی ہوئی یہ مسجد آج بھی اسی ڈھانچے پر برقرار ہے جس پر اسکے سرفروش بانیوں نے اسے تعمیر کیا تھا، محراب ابھی تک جوں کی توں ہے، اور اس کے درودیوار سے اسکے بنانے والوں کے جذبۂ اخلاص کی شہادت ملتی ہے، اتفاق سے کیپ ٹاؤن تمدنی ترقی میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا، لیکن یہ مسجد اپنی اسی سادگی پر برقرار ہے، اور یہاں کے ائمۂ مساجد آج بھی اسی خاندان سے مقرر ہوتے ہیں جسے ابتدائی تعمیر کے وقت امام بنایا گیا تھا، صرف ایک فرق واقع ہوا ہے اور وہ یہ کہ جن بے سروسامان مسلمانوں نے

یہ مسجد بنائی تھی، ان کے پاس قبلے کی صحیح سمت معلوم کرنے کے لئے مناسب آلات نہیں تھے، اس لئے شاید انہوں نے اندازے سے قبلے کا رخ متعین کر کے اس پر محراب بنادی تھی، اب آلات کی مدد سے پتہ چلا کہ محراب قبلے کے صحیح رخ سے کافی ہٹی ہوئی ہے۔ چنانچہ اب صفیں محراب کے رخ پر بچھانے کے بجائے ترچھی کر کے قبلے کے صحیح رخ پر بچھائی جاتی ہیں۔

اسی مسجد کے صحن میں ایک کھجور کا درخت ہے، چونکہ کیپ ٹاؤن میں آس پاس کہیں کھجور کے درخت نظر نہیں آتے، اس لئے اسے دیکھ کر مجھے اچنبھا سا ہوا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مسجد کے کوئی امام صاحب حج کے لئے گئے تو واپسی پر مدینہ طیبہ کی کھجوریں لائے تھے، انہوں ایک گٹھلی یہاں بودی تھی جس سے یہ درخت نکل کر تناور ہو گیا۔

یہ تھا جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کے داخلے کا آغاز! شروع میں یہاں ملایا کے مسلمان آباد ہوئے تھے جو زیادہ تر صوبہ کیپ ہی میں مقیم رہے، ملک کے شمالی صوبوں ٹرانسوال اور نٹال میں انکی تعداد بہت کم تھی، لیکن بعد میں ہندوستان، خاص طور سے سورت اور گجرات کے مسلمان تجارت کی غرض سے یہاں آئے، اور ٹرانسوال اور نٹال میں مستقل طور پر آباد ہو گئے، اور اس طرح مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پورے جنوبی افریقہ میں پھیل گئی، اسکے باوجود ملک کی کل آبادی میں مسلمانوں کا تناسب بمشکل چار پانچ فیصد ہے، لیکن اتنی معمولی اقلیت میں ہونے کے باوجود جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اپنا دینی تشخص جس باریک بینی سے محفوظ رکھا، وہ قابل صد تعریف ہے، مجھے ایسے بہت سے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، لیکن جنوبی افریقہ کے مسلمان دینی اعتبار سے دوسرے تمام ممالک کے مقابلے میں زیادہ منظم، پر جوش اور حساس نظر آئے۔ انہوں نے ملک کے طول وعرض میں شاندار مسجدیں تعمیر کیں، ایسی مسجدیں کہ ان میں داخل ہونے کے بعد کوئی بھی شخص اعلی درجے کی صفائی ستھرائی اور خوش سلیقگی کا تأثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا، ہر مسجد کے ساتھ بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ایک معیاری مرکز قائم کیا جہاں مسلمان بچے روزانہ شام کے وقت بنیادی دینی تعلیمات سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اور مسلمان گھرانوں کا شاید کوئی بچہ ایسا نہ ہو جو زندگی کے کارزار میں داخل ہونے سے پہلے

ان تعلیمی مراکز کی تربیت سے نہ گذرا ہو۔ اس کے علاوہ ان مسلمانوں نے اپنے بہت سے نوجوانوں کو اعلیٰ اسلامی علوم کی تحصیل کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے بڑے دینی مدارس میں بھیجا جو یہاں سے اسلامی علوم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن میں پہنچے، اور اب انکی ایک بڑی کھیپ وہاں قابل قدر دینی خدمات انجام دے رہی ہے، اور اب خود جنوبی افریقہ میں کئی معیاری دارالعلوم قائم ہیں جہاں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔

جنوبی افریقہ کے ہندوستانی نژاد مسلمان چونکہ مالی اعتبار سے عموماً خوشحال ہیں، اور ملکی تجارت میں ان کا قابل لحاظ حصہ ہے، اس لئے یہ حضرات اس ظلم وستم کا شکار تو نہیں ہوئے جو وہاں کی سیاہ فام آبادی کو بھگتنا پڑا، لیکن نسلی امتیاز کی پالیسی کی وجہ سے وہ بھی ملک کے دوسرے درجے کے شہری بنے رہے، اور نسلی امتیاز کی فہرست میں ان کا شمار بھی کالوں ہی میں ہوتا رہا، بالآخر جب سیاہ فام آبادی کی طرف سے آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو بہت سے مسلمانوں نے عملاً اس تحریک میں حصہ لیا، اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، بہت سے مسلمان براہ راست نیلسن منڈیلا کی سیاسی جماعت افریقن نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے آزادی کی جدوجہد کرتے رہے، چنانچہ جب ملک کو آزادی ملی اور ملک میں پہلی بار عام انتخابات منعقد ہوئے تو بہت سے مسلمان بھی اے این سی کی ٹکٹ پر کامیاب ہوکر پارلیمنٹ میں پہنچے۔ اور اب پندرہ بیس کے لگ بھگ مسلمان نئی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ بلکہ تین مسلمان منڈیلا کی کابینہ کے بھی رکن ہیں۔ اور ان کے اثر ونفوذ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت وزارت قانون جیسا حساس قلمدان ایک مسلمان وزیر مسٹر عبداللہ کے پاس ہے۔

منڈیلا کے برسر اقتدار آنے کے بعد جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے نئی حکومت سے یہ فرمائش کی کہ آزادی کے فوائد میں مسلمانوں کو حصہ دار بنانے کے لئے مسلمانوں کے شخصی قوانین جو نکاح، طلاق اور وصیت ووراثت وغیرہ سے متعلق ہیں، سرکاری سطح پر منظور ہونے چاہییں، اور مسلمانوں کے عائلی مقدمات کا فیصلہ اسلامی قوانین کے مطابق ہونا چاہئے۔ منڈیلا کی حکومت نے اصولی طور پر یہ مطالبہ منظور کرلیا ہے، اور مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ایک مسودۂ قانون تیار کر کے دیں جسے پارلیمنٹ سے منظور کرانے کے بعد نافذ کر دیا

جائیگا۔ اب مسلمانوں کی مختلف تنظیموں نے مل کر پورے ملک کی سطح پر ایک "مسلم پرسنل لا بورڈ"، قائم کیا ہے، جو یہ مسودۂ قانون تیار کررہا ہے۔ کیپ ٹاؤن کی مسلم جوڈیشل کونسل کے صدر شیخ نظیم اس بورڈ کے چیئر مین ہیں، اور جناب شعیب عمر ایڈوکیٹ (جنہوں نے دارالعلوم کراچی میں فقہ کی تعلیم حاصل کی ہے) اسکے سیکریٹری جنرل ہیں، اس مسودۂ قانون کی تیاری میں بہت سے آئینی اور عملی مسائل سے نمٹنا ہوگا، اور مجھے بورڈ کے بعض عہدہ داروں نے انہی مسائل پر نجی مشورے کے لئے مدعو کیا تھا۔ اس مرتبہ میرا زیادہ تر قیام ڈربن میں رہا، اور بیشتر وقت اسی موضوع پر نجی ملاقاتوں میں گذرا۔ البتہ مختصر وقت کے لئے جوہانسبرگ اور پریٹوریا بھی جانا ہوا، جہاں ملک کے مسلمان وزیر قانون مسٹر عبداللہ، پالیمنٹ کے بعض ارکان اور بعض دوسرے حضرات سے بھی نجی ملاقاتیں ہوئیں، اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بفضلہٖ تعالی مسلمانوں کے لئے اس مسودۂ قانون کی تیاری میں ہر مکتب خیال کے لوگ مناسب دلچسپی لے رہے ہیں، اور ایک عبوری مسودہ تیار کیا جاچکا ہے۔ وزیر قانون بذاتِ خود اس مسودے کو بہ عجلت ممکنہ پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور اس غرض کے لئے مختلف مسلم حلقوں کا اتفاق رائے حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

سلطان محمد فاتح کے شہر میں



۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ
۲۰ اگست ۱۹۹۵ء

سلطان محمد فاتح کے شہر میں

استنبول خلافتِ عثمانیہ کا پایۂ تخت ہونے کی حیثیت سے تقریباً پانچ صدیوں تک پورے عالم اسلام پر حکومت کرتا رہا، اس نے یورپ کی سمت سے اٹھنے والی بہت سی آندھیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور علمی وفکری میدان میں بھی بہت سی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں، اسلامی علوم کے بیشمار نامور فضلا کے علاوہ فنِ تعمیر کے زینان جیسے ماہرین نے یہیں پر اپنے جوہر دکھلائے، جسکی تین سو ساٹھ یادگاریں آج بھی ترکی میں موجود ہیں پریس کا پہلا موجد ابراہیم متفرقہ یہیں پیدا ہوا، اور اسکی بدولت دنیا پہلی بار مطبوعہ کتابوں سے روشناس ہوئی، (میں نے دنیا کے اس پہلے پریس کی چھپی ہوئی کتابیں میکگل یونیورسٹی مانٹریال کے کتب خانے میں دیکھی ہیں) فضا میں اڑنے کا سب سے پہلا کامیاب تجربہ بھی استنبول ہی کے ایک باشندے خدافین احمد نے (سترھویں صدی کے آغاز میں) کیا تھا، اس کے بنائے ہوئے چمڑے کے پر آج بھی استنبول کے مشہور برج غلاطہ میں لٹکے ہوئے ہیں جن کے ذریعے اس نے تاریخ میں پہلی بار آٹھ میل تک پرواز کی تھی۔ غرض خلافتِ عثمانیہ مدتوں سیاسی جاہ وجلال اور علمی وتہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بہت سی کمزوریاں آنی شروع ہوئیں، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں جب وہ نیم جان ہوکر رہ گئی تو اس وقت وہ مغربی تہذیب اس کے مقابل آئی جو تازہ دم ولولوں سے معمور تھی، اس کے ساتھ جو صنعتی اور فکری طاقت تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی خود اعتمادی انتہائی متوازن فکر اور فکری وعملی جرأت درکار تھی، جو اس وقت میسر نہ آسکی جس کے نتیجے میں ترکی کی قیادت افراط وتفریط کی دو انتہاؤں میں ڈھلک گئی۔

لیکن اس آخری دور میں بھی خلافتِ عثمانیہ اپنی ہزار کمزوریوں کے باوجود عالم اسلام کے لئے ایک مرکز کا کام دے رہی تھی، اور اس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح ایک لڑی میں پرویا ہوا تھا، اس نظام میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ضرورت اس بات کی تھی کہ انہیں ختم کر کے اس مرکزیت کو باقی رکھا جائے، اور اسے نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے موثر طور پر استعمال کیا جائے، لیکن مغربی تہذیب سے بری طرح مرعوب ذہنوں نے ان خرابیوں کے ازالے کے بجائے خلافتِ عثمانیہ پر ہی ہاتھ صاف کرنا ضروری سمجھا، یہاں تک کہ کمال اتاترک نے خلافت کو ختم کر کے ملک کو ایک لادینی ریاست میں تبدیل کر دیا، اور یہی وہ واقعہ ہے جس پر اقبال مرحوم نے اس طرح تبصرہ کیا ہے

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

کمال اتاترک کے انقلاب کے بعد اسلامی قانون اور شریعت کو ملک سے بے دخل کر کے وہاں سوئٹزرلینڈ کا دیوانی، اٹلی کا فوجداری اور جرمنی کا تجارتی قانون نافذ کر دیا گیا، دینی تعلیم ممنوع قرار دیدی گئی، پردے کو خلافِ قانون قرار دیا گیا، درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا، عربی رسم الخط کے بجائے ترکی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط کو لازمی قرار دیا گیا، عربی میں اذان دینے پر پابندی لگادی گئی، قوم کا لباس تبدیل کر دیا گیا، ہیٹ کا استعمال لازمی کر دیا گیا (اور اس غرض کے لئے ایک خونریز جنگ لڑی گئی جس میں ترکوں کے سر پر ہیٹ رکھنے کے لئے نہ جانے کتنے سر اتارے گئے)۔

کمال اتاترک نے یہ تبدیلیاں اس خیال سے کی تھیں کہ ترک اپنے ماضی سے کلی طور پر کٹ کر اپنا رشتہ مغربی تہذیب سے جوڑ لیں، اس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ترکی معاشی اور سیاسی ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر سکے گا، آج اتاترک کے لائے ہوئے انقلاب کو ستر سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے، اور وہاں (چند مختصر وقفوں کو چھوڑ کر) وہی ذہن حکمرانی کرتا رہا ہے، جو بحیثیت مجموعی اتاترک کا ذہن ہے، اور اس نے مغربی تہذیب کے تمام اثرات کو نافذ کرنے کے لئے تعلیم اور ذرائع ابلاغ سے لے کر جبر و استبداد تک ہر طریقہ پورے جوش

وخروش سے آزمایا ہے، لیکن اگر ترکی معاشرے پر اس نقلاب کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ بڑے شہروں کی حد تک یہ انقلاب عریانی وفحاشی کو یورپ کی سطح تک لانے اور لوگوں کا لباس اور رسم الخط بدلنے میں تو بیشک کامیاب رہا، لیکن جہاں تک ملک کے حقیقی مسائل کا تعلق ہے، ان میں اتاترک ذہنیت کی یہ طویل حکمرانی اسے کوئی قابلِ ذکر فائدہ نہیں پہنچا سکی، ترکی مسلمانوں کی بھاری تعداد پہلے بھی کمال اتاترک کی اس روش کی ہم نوا نہیں تھی، جو اس نے اسلام کے بارے میں اختیار کی تھی، (کمال اتاترک کی ڈکٹیٹرشپ کے بعد ۱۹۵۰ء میں جو پہلے انتخابات ہوے، ان میں کمال اتاترک اور عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی کوشکست ہوئی تھی) لیکن اس نقلاب کے ستر سالہ نتائج کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اب وہاں بطور خاص احیاء اسلام کی تحریک زور پکڑ رہی ہے، وہاں کی سیاسی جماعتوں میں رفاہ پارٹی اسی مقصد کی لئے سرگرم عمل ہے، اور بہت سے ناخوشگوار تجربوں کے بعد ترکی کے بیشتر دینی حلقے پچھلے سال کے بلدیاتی انتخابات میں رفاہ پارٹی کی حمایت پر متفق ہو گئے تھے، چنانچہ بلدیاتی انتخابات میں رفاہ پارٹی نے زبردست کامیابی حاصل کی، اور استنبول سمیت کئی بڑے شہروں میں بلدیہ ان کے زیر انتظام آ گئی، اس وقت استنبول کا میئر بھی اسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، میں جب پچھلے سال ترکی گیا تو انتخابات کو صرف چند دن گذرے تھے اور اس تبدیلی کے اثرات دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا، لیکن اس مرتبہ ترکی جانا ہوا تو نئی بلدیاتی حکومت کو کام کرتے ہوے ایک سال گذر چکا تھا، اس لئے اس کے کچھ اثرات دیکھنے کا موقع ملا، اگرچہ تین روزہ قیام میں بہت گہرا اور ذمہ دارانہ جائزہ لینا مشکل تھا، اس دوران بعض جوشیلے لوگوں کی طرف سے ایسی باتیں بھی سننے میں آئیں جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھیں، لیکن جو باتیں ہر کس وناکس کی زبان پر تھیں اور جو خود آنکھوں سے دیکھیں وہ مختصراً یہ ہیں:

یہ بات بہت سے لوگوں نے بتائی کہ بلدیاتی اداروں میں رشوت ستانی میں کمی واقع ہوئی ہے، اور عوام کو اپنے مسائل حل کرانے میں پہلے کی بہ نسبت سہولت میسر آنے لگی ہے، استنبول میں پانی کی قلت ایک بڑا مسئلہ تھا جو ایک کروڑ سے زائد آبادی کے اس شہر میں عوام کے لئے سخت مشکلات پیدا کرتا تھا، لیکن اس سال یہ مسئلہ قریب قریب حل ہو گیا ہے، رفاہ پارٹی کے میئر

نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد ہی سب سے پہلے نماز استسقاء کا اہتمام کیا جو شاید طویل عرصے کے بعد استنبول میں پہلی نماز استسقاء تھی، (اور بعض لادینی حلقوں کی طرف سے اس کا مذاق بھی اڑایا گیا) اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اسکے بعد خوشگوار بارشیں ہوئیں، اور بلدیہ کی طرف سے پانی کی تقسیم کا نظام ایسا بنایا گیا کہ استنبول کے ہر علاقے میں پانی فروانی سے ملنے لگا، شہر میں سڑکوں کی تعمیر اور صفائی ستھرائی کا معیار بھی ان لوگوں کے بیان کے مطابق پہلے سے کافی بہتر ہوا ہے، نئی بلدیاتی حکومت نے بہت سے ایسے با قاعدہ ریسٹورنٹ قائم کئے ہیں جہاں غرباء کوئی قیمت ادا کئے بغیر کھانا کھا سکتے ہیں، اور اسکا ایسا نظام بنایا گیا ہے کہ اس سہولت کا غلط استعمال نہ ہو سکے، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مواقع پر تین تین دن تک پورے شہر میں ٹرانسپورٹ مفت رہی، یعنی ان تین دنوں میں ہر شخص شہر میں جہاں کہیں جانا چاہے، اسے بس کا کوئی کرایہ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

اس قسم کے عوامی سہولت کے اقدامات کے علاوہ بلدیہ کے زیر انتظام عوامی مقامات پر نہ صرف شراب، بلکہ تمام غیر ملکی مشروبات کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، بلدیہ کا کہنا ہے کہ ترکی کے پاس اپنے مشروبات اتنے ہیں کہ اسے غیر ملکی مشروبات کی ضرورت نہیں، جو مضر صحت بھی ہیں اور ان پر زرمبادلہ بھی خرچ ہوتا ہے۔

اتاترک ذہنیت نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا تھا کہ ترکی کو اس کے اسلامی ماضی سے کاٹ کر رکھا جائے، چنانچہ اسلامی تاریخ کے کسی واقعے کو سرکاری سطح پر اہمیت دینا قابلِ تصور نہیں تھا۔ لیکن رفاہ پارٹی کے بلدیاتی نمائندوں نے اپنی بساط کی حد تک اسلامی تاریخ کی بہت سی یادگاروں کو زندہ کیا ہے۔ ابھی ۷ رمئی کو انہوں نے استنبول میں پہلی بار سلطان محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ کی یادگار بڑے دلچسپ طریقے سے منائی، انہوں نے باسفورس کے مغربی ساحل کے اس مقام سے جو دولما باچا کہلاتا ہے، ستر کشتیوں کا ایک جلوس نکالا، جو محمد فاتح کی کشتیوں کی طرح خشکی پر چلائی گئیں، ان کشتیوں کو چلانے والے عثمانی فوج کی وردی میں ملبوس تھے، اور ان کی قیادت ایک ایسے صاحب کر رہے تھے جو شکل وصورت میں محمد فاتح کے مشابہ تھے، اور انہوں نے عثمانی خلیفہ جیسا لباس پہنا ہوا تھا۔ کشتیوں کا یہ جلوس دولما باچا سے شروع

ہوا، اور وسط شہر کے مصروف ترین علاقے تقسیم وغیرہ سے گذرتا ہوا قاسم پاشا کے اس مقام پر ختم ہوا جہاں سے سلطان محمد فاتح نے اپنی کشتیاں گولڈن ہارن کے پانی میں ڈالی تھیں۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ عوام نے اس جلوس کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا، اور اس سے لوگوں میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔

احیاء اسلام کی تحریک میں ملک کے ہر طبقۂ خیال کے لوگ، خاص طور پر نوجوان بڑے جذبے کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں، چنانچہ نوجوان طلبہ اور طالبات میں اسلامی شعائر کا اہتمام واضح طور پر ترقی کر رہا ہے، جہاں اتاترک نے (العیاذ باللہ) قرآن کریم کا نسخہ شیخ الاسلام کے سر پر دے مارا تھا، وہاں قرآن کریم کی تعلیم کے سینکڑوں ادارے قائم ہو چکے ہیں جہاں عربی میں اذان پر پابندی لگائی گئی تھی، وہاں پورا شہر نہ صرف اذانوں سے گونج رہا ہے بلکہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہیں، جہاں خواتین کے لئے پردہ جرم قرار دیدیا گیا تھا، وہاں نوجوان طالبات پردے کا اہتمام کر رہی ہیں، ترکی کے ایک شہر سیواس کی ایک میڈیکل یونیورسٹی میں اس سال پہلی پوزیشن جس طالبہ نے حاصل کی، وہ پردے کی پابند ہے، میرے ترکی پہنچنے سے چند روز پہلے اس یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد (Convocation) منعقد ہوا تھا یونیورسٹی کی روایت کے مطابق پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ کو اس اجتماع سے خطاب کرنا چاہیے تھا لیکن یونیورسٹی کے سربراہ نے اس طالبہ کو پردے کی وجہ سے کنووکیشن میں مدعو نہیں کیا، اسکے باوجود وہ لڑکی پردے کی حالت میں از خود اسٹیج تک پہنچ گئی، اور مطالبہ کیا کہ اسے روایت کے مطابق خطاب کا موقع دیا جائے، اس پر یونیورسٹی کے سربراہ نے غصے میں آ کر اس کے سر سے وہ مخصوص سرپوش اتار دیا جو اس موقع پر پہنا جاتا ہے، اتفاق سے یہ منظر ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا، اور اسے دیکھ کر پورے ترکی میں آگ لگ گئی، ہر طرف سے مطالبہ شروع ہوا کہ یونیورسٹی کے اس سربراہ کو معزول کیا جائے، چنانچہ اس واقعے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ معزول ہو چکا تھا، اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ ازمیر میں بھی پیش آیا۔

میرے ایک ترکی دوست خیری دیمر جی ایک شام مجھے ایک تفریح گاہ پر لے گئے یہ ایک پہاڑ ہے جو باسفورس کے ایشیائی ساحل پر واقع ہے، اور اس پر کچھ اس قسم کی تفریح گاہ بنی ہوئی

ہے جیسے اسلام آباد میں دامن کوہ، یہاں مغرب میں باسفورس اور اسکے پیچھے پھیلے ہوئے یورپی استنبول مشرق میں ایشیائی استنبول اور جنوب میں بحیرۂ مرمرہ کا نظارہ اتنا حسین ہے کہ اسے الفاظ میں تعبیر کرنا مشکل ہے، مغرب کا وقت ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک نماز گاہ حال ہی میں بنائی گئی ہے، وہاں جا کر دیکھا تو جماعت ہو رہی تھی، اور اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ انتظار میں کھڑے تھے، انتظار کرنے والوں میں ہر عمر کی خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جن میں سے اکثر باپردہ یا کم از کم ساتر لباس پہنے ہوئی تھیں، اور اس نماز گاہ میں دیر تک یکے بعد دیگرے پہلے مردوں، پھر عورتوں کے نماز پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا۔

ترکی کی کسی شہری تفریح گاہ میں نماز پڑھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد کا پہلے عموماً تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نماز گاہ سے باہر بھی تقریباً اسی فی صد لوگ ایسے نظر آئے جن کے انداز و ادا میں اسلامی شعائر کی جھلک موجود تھی، میرے دوست نے بتایا کہ پہلے یہ تفریح گاہ آوارگی اور شراب نوشی کا مرکز سمجھی جاتی تھی، اور اگر کوئی باعمل مسلمان یہاں آنکلے تو اس پر آوازے کسے جاتے تھے، لیکن اس روز اس خوبصورت تفریح گاہ پر ایک پاکیزگی کی فضا چھائی ہوئی نظر آئی، اور یہاں بنے ہوئے ریستورانوں کو دیکھ کر واقعی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ یہاں شراب تو درکنار کوکا کولا اور پیپسی کولا کا بھی گذر نہیں، تمام تر دیسی مشروبات استعمال ہو رہے تھے، اور لوگوں کے چہروں پر مسرت وطمانیت نمایاں تھی۔

آئندہ سال ترکی میں عام انتخابات ہونے والے ہیں، اور احیاء اسلام کے حامی حلقے پر امید ہیں کہ اگر ہوا کا رخ یہی رہا تو انشاء اللہ انہیں ان انتخابات میں نمایاں کامیابی ہوگی، استنبول میں یہ خوش آئند تبدیلیاں دیکھ کر بیساختہ یہ شعر زبان پر آگیا

اللہ خبر بجلی کو نہ ہو، گلچیں کی نگاہ بد نہ پڑے
جس شاخ پہ تنکے رکھے ہیں وہ پھولتی پھلتی جاتی ہے

دنیا کے گرد ایک سفر



جولائی ۱۹۹۷ء

دنیا کے گرد ایک سفر

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب ہمیں یہ سمجھایا جاتا تھا کہ دنیا گول ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر یہ حقیقت بھی بیان کی جاتی تھی کہ اگر تم کسی بھی ایک سمت میں مسلسل چوبیس ہزار آٹھ سو میل چلتے چلے جاؤ تو دوبارہ وہیں پہنچ جاؤ گے جہاں سے چلے تھے۔ بچپن میں یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ اس بات کی سچائی کا عملی امتحان تقریباً ناممکن ہے۔ یہ ہمارے بس میں کہاں ہے کہ ہم چوبیس ہزار آٹھ سو میل چلتے چلے جائیں۔ اس وقت یہ تصور بھی نہیں تھا کہ بڑے ہو کر یہ تجربہ ہمیں بھی کرنے کی نوبت آئے گی، لیکن چند روز پہلے یہ نوبت آ ہی گئی، حالات ایسے پیدا ہوئے کہ مجھے تیرہ دن واقعۃً زمین کے گرد اس طرح سفر کرنا پڑا کہ تقریباً ایک ہی سمت، یعنی مغرب میں مسلسل سفر کرتے ہوئے دوبارہ وہیں پہنچ گیا جہاں سے چلا تھا۔ کراچی سے یکم جون کو مغرب کی سمت سفر شروع کیا۔ فرینکفرٹ سے ہوتا ہوا کینیڈا کے سب سے بڑے شہر ٹورنٹو پہنچا، وہاں سے پھر مغرب میں سفر کرتا ہوا منیا پولس کے راستے سان فرانسسکو اور پھر لاس اینجلز پہنچا۔ وہاں سے پھر مغرب میں سفر کرتے ہوئے جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو، اور وہاں سے ۱۲ جون کی رات کو دوبارہ کراچی پہنچ گیا، اور اس طرح کرۂ زمین کے گرد واقعی ایک دورہ مکمل ہو گیا۔

جغرافیائی اعتبار سے تو یہ سفر ایک دلچسپ اور منفرد تجربہ تھا ہی، اس سفر میں جو دوسرے تجربات حاصل ہوئے اور جو نئی معلومات بہم پہنچیں، دل چاہتا ہے کہ قارئین کو بھی ان میں شریک کروں، لہٰذا یہ مختصر سفرنامہ حاضر ہے۔

دراصل ٹورنٹو (کینیڈا) میں مقیم میرے بعض دوستوں نے وہاں اسلامی بینکنگ پر ایک دو روزہ سیمینار منعقد کیا تھا، سیمینار کا انتظام کرنے والوں میں کینیڈین مسلمانوں کی قدیم ہر دلعزیز شخصیت جناب سعید الظفر صاحب، جناب عبدالحی پٹیل اور ہمارے سفید فام امریکی نو مسلم دوست جناب تھامس اسٹیون جن کا اسلامی نام عبدالقادر تھامس ہے، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مجھے اس سفر کی دعوت انہی حضرات نے سیمینار میں شرکت کے لئے دی تھی۔ ادھر امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے بعض احباب کا مدت سے اصرار چل رہا تھا کہ میں چند روز ان کے ساتھ گزاروں، اس سے قبل جتنی مرتبہ امریکہ جانا ہوا، میں وقت کی کمی کی وجہ سے ان کی فرمائش پوری کرنے سے قاصر رہا۔ اور پچھلے سال امریکہ سے واپسی کے وقت میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ آئندہ جب بھی شمالی امریکہ کا سفر ہوا تو ان کی فرمائش پوری کروں گا۔ اس لئے میں نے ٹورنٹو سے کیلی فورنیا کا پروگرام بھی بنالیا۔ اور جب کیلی فورنیا، یعنی مغرب میں دنیا کے آخری سرے تک پہنچنا طے ہوگیا تو پھر اسی وجہ سے مناسب یہی تھا کہ میں اٹلانٹک کے بجائے بحرالکاہل کے راستے واپس آؤں، اس لئے بیچ میں ایک منزل ٹوکیو (جاپان) بھی ہوگئی جہاں میں اس سے پہلے نہیں گیا تھا۔

یکم جون کی صبح آٹھ بجے لفٹ ہنسا کے طیارے کے ذریعہ روانہ ہوا، تھوڑی دیر کے لئے دوبئی رکا، پھر سات گھنٹے کی پرواز کے بعد جرمنی کے شہر فرینکفرٹ پہنچا۔ یہاں دوسرے جہاز کے انتظار میں تقریباً تین گھنٹے ٹھہرنا ہوا۔ عصر کی نماز پڑھ کر وہاں سے لفٹ ہنسا ہی کے دوسرے جہاز میں شام 5 بجے ٹورنٹو کے لئے روانگی ہوئی، یہ آٹھ گھنٹے کی پرواز بحراوقیانوس (اٹلانٹک) پر ہوئی، چونکہ جہاز سورج کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف محوِ سفر تھا، اس لئے پورے آٹھ گھنٹے تک عصر کا وقت چلتا رہا، اور جب ٹورنٹو کے وقت کے مطابق میں سات بجے شام ایئرپورٹ پر اترا تو ابھی مغرب میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے، کیونکہ مغرب وہاں شام کو نو بجے ہورہی تھی، ایئرپورٹ پر احباب کی ایک بڑی جماعت استقبال کے لئے موجود تھی۔ ایئرپورٹ کے قریب ہی ریگل کانسٹی لیشن ہوٹل میں قیام ہوا، ہوٹل پہنچنے تک آٹھ بج گئے، پاکستان سے روانہ ہوئے

اکیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ (اور کراچی میں صبح کے پانچ بج رہے تھے) بستر سے زیادہ لذیذ اس وقت کوئی اور چیز نہ تھی۔ مگر مغرب میں ایک گھنٹہ اور عشاء میں ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ اس دوران ہوٹل میں دوستوں سے ملاقات رہی، ہوٹل ہی میں دوستوں نے ایک ہال مندوبین کی نماز با جماعت کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا۔ ساڑھے دس بجے شب عشاء کی نماز وہاں با جماعت پڑھی۔ اس کے بعد سونے کی نوبت آئی۔

ٹورنٹو کانفرنس

اگلے ہی دن، یعنی ۲ر جون کو صبح ساڑھے آٹھ بجے سے سیمینار شروع ہونا تھا، سیمینار کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں شمالی امریکہ کے مختلف علاقوں سے نہ صرف مسلمانوں کی خاصی تعداد بطور سامع حصہ لے رہی تھی، بلکہ بہت سے غیر مسلم اور کینیڈا کی حکومت کے بعض اہم ذمہ دار افراد بھی شریک تھے۔ مثلاً کینیڈا کی پارلیمنٹ کے ایک اہم ممبر مسٹر ڈیریک لی (Derek Lee) جو پارلیمنٹ میں نیشنل سیکیورٹی کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں (اور یہ عہدہ وہاں کے حکومتی نظام میں بڑی حساس اہمیت کا حامل ہے) نیز صوبہ انٹاریو کی وزارت خزانہ کی پارلیمنٹری سیکریٹری مسز ازابیل بسیٹ (Isable Bassett) بینکوں اور مالیاتی امور کے سابق سیکریٹری خزانہ مسٹر ڈان بلینکرن (DonBlankeron) بھی شامل تھے۔ اور سیمینار میں ان کو مدعو کرنے سے منتظمین کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کینیڈا کو یہ معلوم ہو کہ اسلامی مالیاتی اداروں کا قیام مسلمانوں کے لئے کیوں ضروری ہے؟ اور حکومت کو اس معاملے میں ان سے کیوں تعاون کرنا چاہئے؟

سیمینار کا پہلا اجلاس مسٹر ڈان بلینکرن کی صدارت میں رکھا گیا تھا۔ میں ان سے پہلے بھی ٹورنٹو ہی میں مل چکا تھا، دو سال پہلے جناب سعید الظفر صاحب نے ایک ناشتے پر ہمیں جمع کر کے ان سے یہاں اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام کی بات چلائی تھی۔ سیمینار کی ابتداء میں انہوں نے مختصراً میرا تعارف کرانے کے بعد پہلے مقرر کے طور پر مجھے خطاب کی دعوت دی۔ چونکہ شرکاء میں مقامی غیر مسلم شرکاء کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس لئے اس خطاب میں میں

نے اپنا موضوع یہ رکھا تھا۔ ''اسلام اور اسلامی شریعت بنیادی طور پر کیا ہیں؟ اور انسان کے سماجی اور معاشی (Socio - Economic) مسائل سے اسلام کا کیا تعلق ہے؟ یہ وضاحت اس لئے ضروری تھی کہ موجودہ دور میں سیکولرزم کو جدید ترین نظریہ کے طور پر اس طرح قبول کر لیا گیا ہے کہ دین و مذہب کا انسان کے اجتماعی مسائل سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ مذہب کو ایک شخصی معاملہ قرار دے کر اسے خاص طور پر معاشی اور عمرانی مسائل سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس نظریہ پر ایمان لاکر پلے بڑھے ہیں، عام طور سے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کسی دین و مذہب کا تجارت و معیشت سے تعلق کیا ہے؟ لہٰذا میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسلام محض چند عبادات و عقائد کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کے ہر اس شعبے میں ہدایت فراہم کرتا ہے جہاں عقل انسانی کے ٹھوکر کھانے کا احتمال موجود ہو۔ اسی ضمن میں میں نے عقل کی حدود (Limitations) اور وحی الٰہی کی ضرورت واہمیت پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی معاشی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا، اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ سوشلزم یا کمیونزم کی شکست کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو اب ایک حقیقت مطلقہ (Absolute Truth) کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ جیسا کہ مغرب کے بعض حلقے دنیا کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سیکولر ڈیموکریسی اور سرمایہ دارانہ معیشت پر انسانی تاریخ اپنے آخری عروج تک پہنچ گئی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے امریکی وزارت خارجہ کے ایک افسر کی مشہور کتاب The End of the History and the last Man کا حوالہ دیا جس میں تقریباً یہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سوشلزم یا کمیونزم سرمایہ دارانہ معیشت کی بعض سنگین ناانصافیوں کا ردعمل تھا۔ آج اسے اگر اپنی ذاتی خامیوں (Intrinsic faults) کی وجہ سے شکست ہوگئی ہے تو یہ سمجھنا خود فریبی ہوگی کہ سرمایہ دارانہ معیشت کی خرابیاں دور ہوگئی ہیں جب تک تقسیم دولت میں ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ اگر آج ایک کمیونزم نے شکست کھائی ہے تو کل کوئی دوسرا فتنہ کھڑا ہو جائے گا، اور انسانیت اسی افراط و تفریط کے گرداب میں مبتلا رہے گی۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی معاشی

تعلیمات موجودہ دنیا کے سامنے ایک تیسرا راستہ (Third option) پیش کرتی ہیں جو افراط و تفریط سے خالی ہے، بشرطیکہ اسے سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور موجودہ دور میں اسے روبعمل لانے کے لئے مناسب مشینری تیار کی جائے۔ آج ان تعلیمات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا صرف مسلمانوں ہی کی نہیں پوری انسانیت کی، اور خاص طور پر مغرب کی سب سے بڑی ضرورت ہے، لیکن افسوس ہے کہ مغرب، جو ان تعلیمات کا سب سے زیادہ محتاج ہے، انہیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو رہا، بلکہ جب کبھی ان تعلیمات کی بات کی جاتی ہے، تو ایسی بات کرنے والوں کے خلاف یہ پروپیگنڈہ شروع ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ گھڑی کی سوئی پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ اس تمہید کے بعد میں نے اسلام کی بنیادی معاشی تعلیمات مختصراً بیان کیں، اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ تقسیم دولت کی ناہمواریوں کو ختم یا کم کرنے میں ان سے موجودہ دور میں کس طرح مدد مل سکتی ہے۔

تقریر کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ بھی رہا جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، اور اس سے بات کی وضاحت میں مزید مدد ملی۔

جناب پرویز نسیم صاحب ٹورنٹو میں ایک ایسے ادارے کے سربراہ ہیں جو مسلمانوں کو مکانات کے حصول کے لئے اسلامی طریقے سے شرکت کی بنیاد پر سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ (اس ادارے کے طریق کار کو شرعی اصولوں کے مطابق بنانے میں تھوڑا بہت حصہ میرا بھی رہا ہے) انہوں نے اپنے ادارے کے طریق کار کو مفصل طور پر بیان کیا، اور بتایا کہ وہ کتنا کامیاب رہا ہے۔

امریکہ کی ریاست نیو جرسی میں ہمارے ایک امریکی نژاد نومسلم دوست جناب عمر فشر (Umar Fisher) ہیں، وہ عرصے سے امریکہ میں ایک انشورنس کا ادارہ اسلامی بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور اس سلسلے میں ان سے میری پہلے بھی ملاقاتیں ہو چکی ہیں اور خط و کتابت کے ذریعہ بھی رابطہ رہا ہے۔ انہوں نے سیمینار میں مروجہ انشورنس اور تکافل کے اسلامی اصولوں کا فرق واضح کیا، اور امریکہ میں اسلامی انشورنس کمپنی قائم کرنے کے لئے اپنا مفصل منصوبہ تفصیل کے ساتھ بتایا۔

ملائشیا اور ایران کے مندوبین نے اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی بینکنگ کے لئے کئے گئے اقدامات اور ان کی عملی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

دوسرے دن بھی کانفرنس جاری رہی، اور مجھے دوبارہ خطاب کی دعوت دی گئی تاکہ میں تمویل (Financing) کے اسلامی طریقوں کی وضاحت، اسلامی بینکوں کی نگرانی اور مرکزی بنک کے ساتھ ان کے رابطے کے موضوع پر اظہار خیال کروں، چنانچہ دوسرے روز بھی میں نے اس موضوع پر خطاب کیا۔

اسی روز کانفرنس کے ختم ہونے سے کچھ پہلے صوبہ انٹاریو کی پارلیمانی سیکریٹری برائے امور خزانہ مسز ازابیل بسٹ نے بھی بڑا دلچسپ اور پرمغز خطاب کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اسلامی بینکنگ اس کے عملی مسائل اور دنیا بھر میں قائم ہونے والے مالیاتی اداروں کے بارے میں اتنی معلومات ہیں کہ ہمارے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اتنی معلومات نہیں ہیں۔ ان کی تقریر میں کینیڈا میں مسلمانوں کی تاریخ اور حکومت کینیڈا سے ان کے روابط کے موضوع پر بھی بہت اچھی معلومات تھیں۔ یہ تقریر لکھی ہوئی تھی، مگر ان کے پاس ایک ہی کاپی تھی، میں نے ان سے تقریر کی کاپی کرنے کی فرمائش کی چنانچہ اپنے ایک دوست کے ذریعہ اس کی ایک کاپی میں نے حاصل کر لی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پوری تقریر پاکستان کے مسلمانوں کے لئے کئی لحاظ سے باعث دلچسپی اور معلومات آفریں ہوگی، اس لئے میں نے ان سے اس کی اشاعت کی اجازت بھی لے لی تھی۔ میں ذیل میں اس تقریر کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔

ٹورنٹو کی اسلامی بینکنگ کانفرنس میں مسز ازابیل بسٹ کی تقریر

مجھے خوشی ہے کہ میں ایک ایسے موقع پر آپ کے ساتھ شامل ہو رہی ہوں جب آپ حضرات اسلامی بینکنگ اور فائنانس کے تعلق سے دنیا بھر میں ہونے والی تبدیلیوں پر بحث کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ یہ کانفرنس صوبہ انٹاریو کے شہر ٹورنٹو میں منعقد ہو رہی ہے۔ یہ شہر، یعنی ٹورنٹو، بہت سے مذاہب، ثقافتوں اور نئے افکار کا ایک کاسموپلیٹن مرکز ہے۔

چونکہ کرہ زمین اب ایک بستی کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے، اور اب اس بستی میں جغرافیہ کی اتنی اہمیت باقی نہیں رہی، اس لئے اب کامیاب ترین بزنس وہ ہوں گے جو ایسے آلات تیار کر سکیں جو اپنا کاروبار بہت سی ثقافتوں اور بہت سے براعظموں تک وسیع کر سکتے ہوں، اور کامیاب ترین ممالک اور صوبے وہ ہوں گے جو اس قسم کے بزنس کو ترقی دے کر ان سے آخری امکانی حد تک فائدہ اٹھا سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینکنگ پر گفتگو اب صرف اسلامی دنیا یا صرف مسلم اقوام کی حد تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس کا دائرہ اب اتنا وسیع ہو رہا ہے کہ اس میں غیر مسلم ممالک اور ان کی وہ حکومتیں بھی شامل ہو رہی ہیں، جو مالیاتی معاملات کا نظم ونسق متعین کرتی ہیں۔

اسلامی بینکنگ پر بحث کینیڈا کے ان مسلمانوں کے لئے بطور خاص اہمیت رکھتی ہے، جو اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں۔ بہت سے حضرات قرآن کریم کے ان احکامات پر عمل کرنا چاہتے ہیں جو سود کے خلاف ہیں۔ اس مقدس کتاب کی دوسری سورت میں یہ کہا گیا ہے کہ "اللہ نے تجارت کی اجازت دی ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے" نیز آگے یہ بھی کہا گیا ہے کہ خدا سود کو ہر قسم کی برکت سے محروم رکھے گا۔

لہٰذا اسلامی بینکنگ اور فائنانس کا مسئلہ ان لاکھوں مسلمانوں کے لئے انتہائی دلچسپی کا حامل ہے جو گزشتہ پچیس سال کے دوران مغرب میں آکر آباد ہوئے ہیں۔ اور یورپ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یہاں کینیڈا میں معاشی طور پر کامیاب اقلیتوں کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں۔

یہاں یعنی کینیڈا میں مسلمان اس وقت سے موجود رہے ہیں جب سے کینیڈا موجود ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہاں مسلمانوں کا وجود ۱۸۷۱ء سے ثابت ہے۔ یعنی کنفیڈریشن کے قیام سے صرف چار سال بعد۔ اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد تیرہ بتائی جاتی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں یہاں مسلمانوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔ اور یہی وہ سال ہے جب ایک مسلمان کی قیادت میں جنوبی ایشیا کا ایک گروپ کینیڈا میں آکر آباد ہوا۔

آج کینیڈا کے اعلان شدہ اعداد و شمار کے مطابق یہاں کم از کم ساڑھے تین لاکھ کینیڈین مسلمان ہیں۔ (غیر سرکاری اعداد و شمار کا اندازہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ ہے) کینیڈا میں مسلمانوں کا عددی ریکارڈ بڑا دلچسپ ہے۔ وہ کینیڈا کی غیر عیسائی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں، وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے بعد یہاں کا تیسرا سب سے بڑا مذہبی گروپ ہیں۔

اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ابھی تک ان کی تعداد یہودیوں سے زیادہ نہیں ہے تو مستقبل قریب میں یقیناً ان کی آبادی یہودیوں سے زیادہ ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ آج کے مسلمان کینیڈا کی دوسری آبادی کے مقابلے میں نوعمر ترین گروپ ہیں، کیونکہ ان کی آبادی کا تقریباً ایک تہائی (۳۰ فیصد) حصہ بیس سال سے کم عمر لوگوں پر مشتمل ہے۔ ملک کی لیبر فورس میں آئندہ ان کی شمولیت کا تناسب باہر نکلنے کے مقابلے میں زیادہ ہو گا، کیونکہ ان کو یہاں ملازمتیں حاصل کرنے اور ترقی کرنے میں اپنے والدین سے کہیں کم رکاوٹوں کا سامنا ہوگا۔

ہیلی فیکس کی سینٹ میری یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اطہر اکبری نے ایک اسٹڈی کی ہے جس کے مطابق مسلمان یہاں کی اقلیتوں میں تعلیم کی سطح کے لحاظ سے صرف یہودیوں کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔ ان کی آبادی کا سترہ فیصد حصہ ایسا ہے جس نے ۱۸ سال یا اس سے زیادہ کی تعلیم مکمل کی ہوئی ہے۔

ان تمام حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان کینیڈا اور اونٹاریو کی معاشی خوشحالی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ کینیڈا میں ان کی موجودگی سے یہاں کی سیاحت کو فروغ ملا ہے کیونکہ ان کے رشتہ داران سے ملنے کے لئے کینیڈا آتے ہیں، نیز یہاں کے مسلمان تاجر بیرون ملک تجارت کے نئے مواقع ملک کو مہیا کر رہے ہیں۔

حال ہی میں مشرق بعید میں کینیڈا کی تجارت کو فروغ دینے کے لئے جو مشن گیا تھا، اس میں بعض مسلمان تاجر اس سفر میں وزیر اعظم مائیک ہیرس کے ساتھ گئے تھے۔

اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے مسلمان کینیڈا میں اپنی موجودگی کا احساس عام کر رہے ہیں، چونکہ مسلمان یہاں بڑی تعداد میں ہیں اور خوشحال ہیں، اس لئے وہ ہر بڑے شہر اور قصبے میں حکومت کی کسی مالی مدد کے بغیر مسجدیں تعمیر کر رہے ہیں، صرف ٹورنٹو کے میٹرو علاقے میں دو درجن سے زیادہ ایسی مسجدیں ہیں جو بڑی خوبصورتی سے ڈیزائن اور تعمیر کی گئی ہیں۔ شہر کے تقریباً چالیس پچاس مقامات پر جمعہ کے بڑے اجتماعات نہایت باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں، اور اب یہاں کے افسران روز بروز اپنے مسلمان ملازمین کو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے چھٹی دینے کا اہتمام زیادہ کر رہے ہیں، اور یہ رجحان بھی پیدا ہو رہا ہے کہ رمضان میں روزہ داروں کو زیادہ سے زیادہ سہولت دی جائے۔ اور اب صوبہ اونٹاریو کی حکومت اپنے غیر عیسائی ملازموں کو دو مذہبی چھٹیاں دیتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ دو چھٹیاں دو عیدوں کے موقع پر فراہم کی جاتی ہیں۔

دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہے۔ لہٰذا اس بات سے کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اسلامی بینکنگ کے فروغ میں ہر سال سترہ فیصد اضافہ ہو رہا ہے اور زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلامی بینکنگ اور فائنانس صرف مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیاء کے مسلمان ملکوں ہی میں اہمیت حاصل نہیں کر رہی، بلکہ مغربی دنیا اور بعض دوسری منڈیوں، مثلاً جنوبی افریقہ کے بنکاری کے حلقوں میں بھی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

اگرچہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اسلامی مالیاتی ادارے قائم ہو رہے ہیں، مثلاً لکسمبرگ، ڈینمارک، آسٹریلیا، لیکن ماہانہ رسالے ''امریکن بینکر'' نے اپنے جنوری ۱۹۹۷ء کے شمارے میں لکھا ہے کہ ابھی کینیڈا میں ایسے ادارے قائم نہیں ہوئے۔

چونکہ اسلامی بینکنگ روایتی بنکوں کی خالص مالیاتی سرگرمیوں سے آگے جاتی ہے، اس لئے کینیڈا کی بنکاری کی مارکیٹ میں ان اداروں کا داخلہ ضابطوں کی کچھ رکاوٹوں سے خالی نہیں ہوگا۔ مغربی دنیا کی منڈیوں میں بنکاری کے نئے تصورات متعارف کرانے کا

مطلب یہ ہوگا کہ ایسے ضابطوں کا سامنا کیا جائے جو اسلام کے مالیاتی تصورات کے مخالف بھی ہو سکتے ہیں۔

جب سے دنیا میں انٹرنیٹ بینکنگ شروع ہوئی ہے، ہم ایک عالمی معیشت کی طرف بڑھ رہے ہیں، ایک ایسی اجتماعی منڈی کی طرف جو جغرافیائی حدود سے نا آشنا ہے۔ لہٰذا مغرب کے مالیاتی اداروں کو روز بروز ایسے نئے طریقے تلاش کرنے پڑیں گے جو اسلامی بینکنگ کی ابھرتی ہوئی مارکیٹ اور اس کی ممکنہ ترقی سے ہم آہنگ ہو سکیں۔

تاہم کینیڈا میں بینکنگ کے معاملات وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہیں، اور چونکہ میرے دوست مسٹر ڈان بلینکرن ان معاملات میں ایکسپرٹ کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا میں اس موضوع کی تفصیلات ان پر چھوڑتی ہوں۔

البتہ میں یہاں یہ بات ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ بہت سے مسلمانوں نے کینیڈا کے معاشی نظام کے تحت کام کرتے ہوئے بھی ایسے جدید راستے تلاش کئے ہیں جن کے تحت وہ اسلام کے غیر سودی بنکاری کے احکام پر عمل کرتے ہوئے دوسرے طریقوں سے کاروبار کریں۔ مثلاً ٹورنٹو میں اسلامک ہاؤسنگ کوآپریٹو نے اپنے ممبران کو سوودی قرض کے بغیر مکانات حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اسی قسم کی کوششیں ذاتی استعمال کے قرضوں اور دوسرے تجارتی معاملات کے سلسلے میں بھی کی جا رہی ہیں۔

لیکن اسلامک فائنانس کے میدان میں جو رجحان انتہائی سرگرمی سے بڑھ رہا ہے وہ اسلامی ایکویٹی فنڈ کا رجحان ہے اور ماہنامہ ''بینکر'' کی فروری ۱۹۹۷ء کی اشاعت کے مطابق مارکیٹ میں اس کے سائز کا اندازہ ڈیڑھ بلین ڈالر سے بھی زیادہ لگا گیا ہے۔ اسلامی ایکویٹی فنڈز مغربی طرز کے میوچل فنڈز سے ملتے جلتے ہیں، جن میں کمپنیوں کے شیئرز کا ایک مشترک کھاتہ وجود میں لایا جاتا ہے، اور کوئی پیشہ ور ماہر اسے چلانے کا اہتمام کرتا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی میں مقیم عالمی بنک کے ضمیر اقبال کا کہنا ہے کہ اسلامی ایکویٹی فنڈ مغرب کے میوچل فنڈز سے ایک ہی بنیادی معاملے میں مختلف ہے کہ اس میں شیئرز کے انتخاب کے لئے ایک تحت

اسکریننگ کرنی ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں صرف وہی شیئرز خریدے جاسکتے ہیں جو تمویل کے اسلامی اصولوں کے مطابق ہیں۔

ایکویٹی فنڈز اسلامی سرمایہ کاری کے لئے فطری طور پر سب سے زیادہ موزوں راستہ ہیں، کیونکہ اسلام کے مالیاتی اصول معاشی وسائل کے پیداواری استعمال، منصفانہ حصہ داری اور خطرات میں شرکت کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

دنیا بھر میں نج کاری کا جو عمل ہورہا ہے، اس کی وجہ سے اسلامی ایکویٹی فنڈز کے لئے بڑے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ دنیا بھر کے علاوہ خود اونٹاریو میں نج کاری سرمایہ کاروں کو یہ موقع فراہم کررہی ہے کہ وہ کسی پرائیویٹ...... تجارتی کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنیں اور یہ کام اسلامی ایکویٹی فنڈز تشکیل دینے کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ تاہم اسلام کی رو سے شیئرز کے انتخاب پر جو کڑی شرائط عائد ہیں ان کی وجہ سے فنڈ کو تنوع پذیر بنانا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلامی فنڈز کے منتظمین دنیا بھر میں سرمایہ کاری کے نئے مواقع پیدا ہونے کے منتظر ہیں۔

اگر یہاں اس کانفرنس میں کچھ ایسے فنڈز کے منتظمین موجود ہوں تو میں آپ کو بتاسکتی ہوں کہ اونٹاریو کیوں سرمایہ کاری کے لئے بہترین جگہ ہے، ہمارے یہاں ٹیکسوں کا ماحول مسابقانہ (Competitive) ہے، ہمارے یہاں ایسے بہت سے کاروبار ہیں جو سرمائے کے منتظر ہیں، ہمارے پاس سیاسی استحکام موجود ہے، اور ہماری اسٹاک مارکیٹ میں اوپر جانے کا رجحان (Bullish Trend) پایا جاتا ہے۔ اور ہماری حکومت ایسی ہے جو ہمارے بجٹ کے خسارے اور قرضوں کو ختم کرنے کی ذمہ داری قبول کئے ہوئے ہے۔

اسلامی ایکویٹی فنڈز کی طرح کی جدید ترین پیداوار کو متعارف کروانا کینیڈا میں اسلامی بینکنگ کے لئے ایک حقیقی چیلنج ہے اگر اس چیلنج کا کامیابی کے ساتھ سامنا کرلیا گیا تو اس سے کینیڈا میں اسلامی مالیاتی بازار کے قیام اور بقاء کا صحیح تعین ہوگا۔

مسلمانوں نے جس طرح کینیڈا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ بنایا ہے، اور کینیڈا جس طرح اپنے آپ کو مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگ بنا رہا ہے، وہ اسلام اور کینیڈا دونوں کے لئے

قابل تعریف ہے۔ کینیڈا نئی مذہبی اقلیتوں کو خوش آمدید کہنے کی ایک باعزت تاریخ رکھتا ہے، اور اسی لئے ہم اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ کثیر النوع (Interogenous) قوم ہیں۔

اسی طرح اسلام ایک عالمگیر دین ہے، اور مسلمان اسی طرح مختلف ثقافتوں، مختلف زبانوں اور مختلف نسلوں کا مجموعہ ہیں جیسے کینیڈا، لہذا یہ امر باعث تعجب نہ ہونا چاہئے کہ کینیڈا کے مسلمان کینیڈا میں رہتے ہوئے ایک مذہبی اور ثقافتی روایت قائم کرنے میں نہایت کامیاب رہے ہیں، مختلف اعتبار سے ہم ایک دوسرے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں' اور نئے آنے والوں کی یکے بعد دیگرے مختلف لہریں ہماری قوم کو روئے زمین پر ایک منفرد قوم کا درجہ دے رہی ہیں۔

کانفرنس کے بعد

۳ر جون کو سیمینار کے اختتام کے بعد میں ایک دن مزید ٹورنٹو میں رہا۔ یہ دن بھی بڑا مصروف گزرا۔ مغربی ممالک میں جانوروں کو ذبح کرنے کے جو طریقے رائج ہیں، ان پر جون کے آخر میں اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے سالانہ اجلاس میں بحث ہونے والی ہے جس کے لئے ایک مقالہ مجھے بھی پیش کرنا ہے۔ اس لئے میں بذات خود ان طریقوں کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، پچھلے سفروں میں اس کام کا کچھ حصہ پہلے مکمل ہو چکا تھا، بعض مذبح خانے اس مرتبہ ٹورنٹو سے کچھ فاصلے پر جا کر دیکھے۔ اس کے علاوہ ٹورنٹو اسٹار کینیڈا کا صف اول کا اخبار ہے، اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اس کے ایڈیٹوریل صفحے کے اڈیٹر ایک پاکستانی مسلمان جناب ہلال صدیقی صاحب ہیں، انہوں نے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔

آج عوام کی ذہن سازی میں اخبارات کا جو کردار ہے وہ کسی بھی باخبر انسان سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ جناب صدیقی کے ٹورنٹو اسٹار کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہونے سے بہت سے مسلم مفادات کا تحفظ ہوا ہے۔

اس کے علاوہ مسٹر ڈیریک لی (Derek Lee) اور مسز ازابیل بسٹ نے دعوت دی تھی کہ صوبہ اونٹاریو کی اسمبلی کی کارروائی آ کر دیکھی جائے، اتفاق سے ایک روز پہلے ہی کینیڈا میں

عام انتخابات ہوئے تھے، اور کنزرویٹو پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی، مسٹر لی بھی اسی پارٹی کے اہم رکن ہیں۔ مقامی مسلمانوں نے رائے دی کہ اس دعوت کو قبول کرنا چاہئے۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد اونٹاریو کی صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں جانا ہوا، اور کارروائی دیکھی، اس وقت سوال وجواب کا وقفہ تھا، اور اپوزیشن بنچوں کی طرف سے حکومت پر اعتراضات کی زبردست بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ کسی تنازعے کے حل کے لئے حکومت نے کوئی عدالتی ٹریبونل بنائے تھے، اپوزیشن ان ٹریبونلز کے قیام اور ان کے طریق کار کو غیر جمہوری قرار دے رہی تھی، اور حکومت کے اس اقدام کو "بربریت" سے تعبیر کیا جارہا تھا۔

ہم پاکستان میں اسمبلی کی کارروائی کے انداز اور شوروشغب کے جس طریقے کو برا سمجھتے اور اس کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں یہاں کی کارروائی دیکھ کر اس احساس میں کچھ کمی آئی، اس لئے کہ جو کارروائی ہم نے دیکھی، اس میں شوروہنگامہ، ایک دوسرے کی بات نہ سننے، مخالف نقطۂ نظر کو برداشت نہ کرنے اور بولتے ہوئے شخص کے بیچ میں مداخلت کا وہی انداز نظر آیا جسے آج کل صحافتی زبان میں مچھلی بازار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سارے ہنگامے میں اسپیکر تقریباً بے بس نظر آتا تھا۔

مدینہ مسجد ٹورنٹو کی سب سے بڑی مسجد ہے، اور ماشاء اللہ بھاری تعداد میں مسلمانوں کا مرکز۔ وہاں کے امام وخطیب مولانا محمد خلیل صاحب کے اصرار پر مغرب سے عشاء تک وہاں خطاب ہوا۔ دور دور سے محبت کرنے والے حضرات وہاں جمع ہوگئے تھے، پوری مسجد بھری ہوئی تھی، اس خطاب کے بہانے بہت سے ان دوستوں سے ملاقات ہوگئی جن سے اس مختصر قیام میں پہلے ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ ٹورنٹو شمالی امریکہ کے ان شہروں میں سے ہے جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ اور مسجدوں، مدرسوں اور اسکولوں سے لے کر مسلمانوں کے اپنے ہر قسم کے ادارے قائم ہیں۔ اور ہر مرتبہ انہیں روبہ ترقی دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ اس مرتبہ ٹورنٹو میں میرا قیام صرف تین دن رہا، ان میں سے دو دن سیمینار میں مشغولیت رہی۔ اور ان حضرات سے ملاقات کے لئے بمشکل ایک دن مل سکا۔

کیلی فورنیا میں

۵؍جون کی صبح نو بجے میں ٹورنٹو سے سان فرانسسکو کے لئے روانہ ہوا۔ نارتھ ویسٹ ایئر لائنز کے جہاز نے پہلے امریکہ کے شہر منیاپولس پہنچایا جہاں دو گھنٹے انتظار کے بعد دوسرا جہاز بدلنا پڑا۔ سان فرانسسکو ریاست کیلی فورنیا کا مشہور قدیم شہر ہے۔ جو امریکہ کے جنوب مغربی حصے میں بحرالکاہل کے کنارے آباد ہے۔ نیو یارک سے یہاں تک کا فضائی سفر چھ گھنٹے لیتا ہے، اور نیو یارک سے یہاں کا وقت بھی تین گھنٹے آگے ہے۔ یعنی گرمیوں میں پاکستان اور کیلی فورنیا کے درمیان پورے بارہ گھنٹے کا فرق ہو جاتا ہے، جب پاکستان میں رات کے آٹھ بجتے ہیں تو یہاں صبح کے آٹھ بجے ہوتے ہیں۔ سان فرانسسکو ایئر پورٹ پر احباب استقبال کے لئے موجود تھے چونکہ میں ٹورنٹو میں ایک دن قیام کا اضافہ کرنے کی وجہ سے یہاں اصل پروگرام سے ایک دن بعد پہنچا تھا اور اس دن مجھے سان فرانسسکو سے تقریباً سو میل دور ایڈ لے کے مقام پر خطاب کرنا تھا، اس لئے جہاز سے اتر کر مجھے سیدھا کار کے ذریعہ پہلے اسٹاکٹن اور پھر ایڈ لے جانا پڑا۔ ایڈ لے میں عصر و مغرب کے درمیان مسلمانوں کا بڑا اجتماع تھا۔ یہاں اردو میں خطاب ہوا۔ مغرب کے بعد عشائیہ تھا، جس کے بعد رات واپس، اسٹاکٹن کے اسلامی مرکز میں آ کر گذاری، یہ مرکز جناب مولانا عبیدالرحمٰن کی سرکردگی میں مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ کیلی فورنیا کے متعدد علماء نے یہاں کے مسائل اجتماعی طور پر حل کرنے کے لئے شریعہ کونسل آف کیلی فورنیا کے نام سے ایک جماعت بنائی ہوئی ہے مولانا عبیدالرحمٰن صاحب اس کے امیر ہیں، اور صاحب استعداد عالم ہیں۔ ان کی اجتماعی سرگرمیاں دیکھ کر مسرت ہوئی۔

۶؍جون کو جمعہ تھا، اور اس روز مجھے کیلی فورنیا کے صوبائی دارالحکومت سیکرامنٹو (Secramento) میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرنا تھا۔

یہ شہر اسٹاکٹن سے تقریباً چالیس پچاس میل دور ہے۔ سیکرامنٹو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ براعظم امریکہ میں سب سے پہلی مسجد یہیں پر بنی تھی۔ اس تاریخی مسجد کے امام و

خطیب مولانا ممتاز الحق صاحب دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، اور اس علاقے کے فعال علماء میں سے ہیں۔ انگریزی بہت روانی سے بولتے ہیں، اور علاقے کے لوگ ان سے مانوس ہیں۔

ان کی معیت میں سیکرامنٹو کا سفر ہوا، اس علاقے میں چونکہ مسلمان مختلف علاقوں سے آکر آباد ہوئے ہیں اس لئے کوئی ایک زبان ایسی نہیں ہے جو سب اچھی طرح سمجھ سکیں۔ چنانچہ یہاں کا معمول یہ ہے کہ پہلے اردو، پھر انگریزی میں تقریر ہوتی ہے۔

اسی معمول کے مطابق مجھے بھی یکے بعد دیگرے دونوں زبانوں میں خطاب کرنا پڑا۔ یہ مسجد بیسویں صدی کی پہلی دہائی (تقریباً ۱۹۰۶ء) میں قائم ہوئی تھی، اور اب اس کے ساتھ ایک مدرسہ، دارالمطالعہ اور مسلمانوں کی ایک اجتماع گاہ بھی موجود ہے۔ جمعہ کے بعد کھانے پر یہاں کے مسلمانوں سے مقامی مسائل پر گفتگو رہی، امریکہ میں اطراف عالم سے آئے ہوئے مختلف مسلمانوں کو یکجا دیکھ کر ہمیشہ وحدت اسلامی کا بڑا خوشگوار تاثر قائم ہوتا ہے اور اگر کچھ متنازعہ مسائل نہ ہوں تو یہ اسلام کی عالمگیر حیثیت کا بڑا ایمان افروز منظر ہوتا ہے۔

چار بجے مجھے واپس کیلی فورنیا کے ایک اور شہر سانتا کارلا جانا تھا جو یہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔

باہر نکلنے سے پہلے ہمارے رہنما مولانا ممتاز صاحب نے سیکرامنٹو کے وسط شہر (Down Town) کا ایک چکر لگایا۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے صوبائی حکومت کے دفاتر، پارلیمنٹ وغیرہ کی خوبصورت عمارتیں یہیں پر واقع ہیں، اگرچہ کیلی فورنیا کی ریاست میں لاس اینجلز اور سان فرانسسکو جیسے بڑے شہر موجود ہیں، لیکن ریاستی دارالحکومت کے لئے ان بڑے شہروں کے بجائے سیکرامنٹو کا انتخاب غالباً اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ شہر کیلی فورنیا کے تقریباً بیچ میں واقع ہے اور ہر طرف کے لوگوں کے لئے یہاں پہنچنا نسبتاً آسان ہے۔

سیکرامنٹو میں گرمی اچھی خاصی تھی، لیکن جوں جوں ہم سڑک کے راستے مغرب کی طرف بڑھتے رہے گرمی کم ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ تقریباً نصف راستہ طے کرنے کے بعد پہاڑی

علاقہ شروع ہوا تو موسم یکلخت تبدیل ہو گیا۔ ان پہاڑوں سے لے کر ساحل سمندر تک کا علاقہ جس میں سان فرانسسکو بھی آباد ہے، عام طور پر ٹھنڈی ہواؤں کی وجہ سے ''ایئر کنڈیشنڈ علاقہ'' سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ یہاں بحرالکاہل کے کھلے علاقے سے آنے والی ہوائیں ان پہاڑوں سے ٹکرا کر پورے علاقے کو ٹھنڈا بنا دیتی ہیں، چنانچہ مشرق میں چند میل کے فاصلے پر خواہ کتنی گرمی پڑ رہی ہو، یہاں موسم ٹھنڈا ہی رہتا ہے، اور بعض اوقات چند میل کے فرق سے درجہ حرارت میں دس پندرہ ڈگری تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔

تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم سات بجے کے قریب سانتا کارلا میں داخل ہوئے، یہ شہر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دولت مند تاجر افراد کا شہر ہے مسلمانوں کی بھی خاصی بڑی تعداد یہاں آباد ہے۔ اور وہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہیں، انہوں نے یہاں اپنا ایک خوبصورت کمیونٹی سینٹر بنایا ہوا ہے، جس میں مسجد بھی ہے، اجتماع گاہ بھی، اور بعض دوسری سماجی سرگرمیوں کے مراکز بھی۔ نماز مغرب کے بعد یہاں کے آڈیٹوریم میں اجتماع رکھا گیا تھا، اور میں جب اسٹیج پر پہنچا تو سامعین کی تمام نشستیں پُر تھیں۔ منتظمین نے میرے خطاب کا موضوع (Islamic Judicial System) (یعنی اسلام کا نظام عدل) تجویز کیا ہوا تھا۔ حاضرین میں پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ عرب اور امریکی مسلمانوں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی، لہٰذا وہ مشترک زبان جو سب سمجھ سکیں، انگریزی ہی ہو سکتی تھی، چنانچہ میرا یہ خطاب بھی انگریزی میں ہوا اور تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا۔ میں نے قرآن کریم کی اس آیت کو اپنی گفتگو کی بنیاد بنایا جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ و لا تکن للخائنین خصیما''

''بیشک ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس بصیرت سے فیصلے کریں جو اللہ نے آپ کو دی ہے، اور آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنئے۔''

میں نے عرض کیا کہ اس آیت کریمہ نے نظام عدل سے تعلق رکھنے والے بنیادی اداروں یعنی مقننہ (Legislature) عدلیہ (Judiciary) اور وکالت (Bar) تینوں کے لئے اصولی رہنمائی فراہم کی ہے۔ اسی ضمن میں یہ گفتگو بھی بڑی تفصیل سے آئی کہ قوانین کو ہمیشہ تغیر پذیر (Dynamic) ہونا چاہئے یا کچھ قوانین ایسے بھی ہونے چاہئیں جو ہر حالت اور تمام زمانوں میں یکساں رہیں؟ اور اگر کچھ قوانین ایسے ہونے چاہئیں تو کس بنیاد پر ان کا تعین کیا جا سکتا ہے؟ الحمدللہ میری گذارشات بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنی گئیں، تقریر کے بعد سوال و جواب میں حاضرین نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور یہ سلسلہ بھی دیر تک جاری رہا۔ اس سنٹر کے سربراہ ایک عرب ہیں۔ میں اسٹیج سے نیچے اترا تو انہوں نے میری پیشانی کو بوسہ دیا، اور کہا، نحن فخورون بک (ہمیں آپ پر فخر ہے)۔

عشاء کی نماز دس بجے کے قریب ہوئی۔ نماز کے بعد لوگوں سے انفرادی ملاقاتوں میں خاصا وقت لگ گیا۔ امریکہ میں تقریباً ہر جگہ یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ مسلمانوں میں اپنے دین کے تحفظ اور اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کی فکر ماشاء اللہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ وہ ٹھیٹھ مسلمان ملکوں میں بھی بسا اوقات نظر نہیں آتی۔

یہ میرا امریکہ کا ساتواں دورہ تھا، اور ہر مرتبہ مجھے یہ احساس ہوتا رہا ہے کہ مسلمانوں کا یہ جذبہ پہلے سے کہیں آگے بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اسلامی موضوعات پر اجتماع میں شریک ہونے کے لئے لوگ دو دو سو تین تین سو میل سے سفر کر کے آتے ہیں۔ آج بھی سنٹر کے اردگرد گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں، اور لوگ دور دور سے سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔

ان حضرات کی محبت، قدر دانی اور خلوص دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے۔

تقریر کے بعد مجھے سان فرانسسکو واپس جا کر رات وہاں گزارنی تھی، میرے میزبانوں مولانا عبیدالرحمٰن صاحب، اور مولانا امجد صاحب نے ایئرپورٹ کے قریب ہوٹل ہالی ڈے ان میں میرے قیام کا انتظام کیا ہوا تھا۔ چنانچہ رات کو بارہ بجے کے بعد ہوٹل پہنچ کر رات وہیں قیام کیا۔

صبح سات بجے ہوٹل ہی میں میرے میزبانوں نے علاقے کے علماء، خطباء اور ائمہ مساجد کا ایک اجتماع بلایا ہوا تھا۔ ان حضرات نے یہاں کے مسائل کو باہمی مشورے سے طے کرنے کے لئے ایک ''شریعہ کونسل'' بنائی ہوئی ہے جس کے امیر مولانا عبید الرحمٰن صاحب ہیں۔ دراصل یہ اسی کونسل کا اجلاس تھا جو میری موجودگی میں اس لئے طلب کیا گیا تھا کہ بعض مسائل پر احقر کی موجودگی میں تبادلہ خیال کر کے احقر کی رائے معلوم کی جائے، اور ان مسائل میں آئندہ کوئی مشترک موقف اختیار کیا جائے۔ یہ اجلاس صبح سات بجے سے تقریباً ساڑھے دس بجے تک جاری رہا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ الحمدللہ کونسل کے تمام ارکان باہمی تعاون کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے قابل تعریف کام کر رہے ہیں، اور مسائل پر اجتماعی غور وفکر کے لئے ان کا انداز واسلوب تعمیری ہے۔ اس مجلس میں بہت سے مسائل زیر بحث آئے، ان میں سے بعض مسائل میں ارکان کی آراء مختلف بھی تھیں، لیکن سب کی فکر ایک تھی۔ اور اختلاف رائے کے باوجود باہمی تعاون اور اخوت میں کوئی فرق نہیں آیا، اور مسائل کا تصفیہ بحمداللہ وسعت قلب کے ساتھ ہوا۔

میرے دوست عامر اختر، جو لاس اینجلز میں مقیم ہیں، میرے یہاں آنے کی خبر پا کر دو روز سے اپنے دوست ظفر صاحب کے ساتھ یہاں آئے ہوئے تھے۔ اور مسلسل میرے ساتھ تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ متواتر سفر اور مسلسل پروگراموں کے بعد کچھ وقت سیر کے لئے بھی نکالنا چاہئے، اب ساڑھے دس بجے سے دو بجے تک کا وقت میرے پاس خالی تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے ایک مقامی دوست کو بلا کر ان کے ساتھ شہر سان فرانسسکو کی سیر کا پروگرام بنایا۔ یہ شہر امریکہ کے مغربی سرے بحرالکاہل کے کنارے واقع ہے۔ مغرب کی طرف سے بحرالکاہل کا پانی ایک خلیج کی شکل میں اس طرح اندر آ گیا ہے کہ اس نے خشکی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ سان فرانسسکو شہر کا بیشتر حصہ اس خلیج کے جنوبی کنارے پر آباد ہے، لیکن کیلی فورنیا کے اندرونی علاقے خلیج کے شمالی کنارے پر واقع ہیں، لہٰذا سان فرانسسکو کو شمالی علاقوں سے ملانے کے لئے اس خلیج پر کئی پل تعمیر کئے گئے ہیں، جو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک گولڈن

برج (Golden Bridge) ہے جو اس لحاظ سے ایک منفرد پل سمجھا جاتا تھا کہ اس کے دونوں طرف صرف دو ستون ہیں، اور بیچ میں کوئی ستون نہیں ہے، بلکہ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کی مسافت تک یہ پورا پل ہوا میں معلق ہے۔ بعد میں تو اس طرح کے پل استنبول اور ٹوکیو وغیرہ میں بھی بن گئے ہیں جو اس سے بھی زیادہ لمبے ہیں، لیکن چونکہ دنیا میں پہلی بار اس قسم کا پل یہیں پر بنا تھا، اس لئے سان فرانسسکو کا گولڈن برج زیادہ مشہور ہوگیا۔ یوں بھی جس مقام پر یہ پل تعمیر کیا گیا ہے۔ وہ بڑے خوبصورت قدرتی مناظر پر مشتمل ہے، اس لئے یہ سیاحت کا ایک اہم پوائنٹ بن گیا ہے۔ یہاں سے مغرب میں چھ ہزار میل دور تک سمندر ہی سمندر ہے اور اگر اسے مغرب میں دنیا کا آخری کنارہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ سمندر کی سمت سے یہ علاقہ اکثر تیز ٹھنڈی ہواؤں کی زد میں رہتا ہے۔ دوسرے اس کے جنوب میں سان فرانسسکو کی بلند عمارتیں شمال میں سرسبز پہاڑ اور مشرق میں پھیلی ہوئی خلیج بڑا دلکش نظارہ پیش کرتی ہے۔ یہاں سمندر کا پانی نہایت سرد بھی ہے اور بہت تیز رو بھی، اس لئے مخصوص لباس پہنے بغیر یہاں نہانا بھی ممکن نہیں ہے۔ مقامی حضرات نے بتایا کہ عموماً یہ پل اور اس کا قریبی علاقہ شدید دھند کی لپیٹ میں رہتا ہے، اس لئے اس نظارے سے لطف اندوز ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس روز دھوپ خوب نکھری ہوئی تھی، ہوا نسبتاً ہلکی اور خوشگوار حد تک خنک تھی، اور دور تک کا منظر کسی رکاوٹ کے بغیر واضح تھا چنانچہ تھکے ہوئے جسم و دماغ کے لئے اس دلکش ماحول میں چند لمحات بڑے فرحت بخش ثابت ہوئے۔

خلیج پر ایک دوسرا پل اس جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں خلیج کی چوڑائی سات میل ہے چنانچہ یہ سات میل لمبا پل سمندر سے صرف چند فٹ بلند سڑک کی شکل میں دور تک چلا گیا ہے۔ اور اس پر ہر وقت ٹریفک کا ایک سیلاب رواں دواں رہتا ہے۔ سمندر کے درمیان یہ طویل سڑک ہوائی جہاز سے بھی نظر آتی ہے۔ اور اپنے اس سفر کے دوران اس پر سے کئی بار گزرنا ہوا۔ تیز رو سمندر کے بیچوں بیچ سڑک کا یہ سفر بھی بڑا دلچسپ اور فرحت بخش ہوتا ہے۔

سان فرانسسکو شہر کے وسط میں بھی متعدد قابل دید مقامات تھے۔ یہاں ایک سڑک ایسی

ہے جسے دنیا کی سب سے زیادہ ٹیڑھی سڑک (The most crooked street of the world) ہونے کا ''شرف'' حاصل ہے۔ غیر آباد پہاڑی علاقوں میں تو ایسی بل کھاتی ہوئی سڑکیں بہت سی ہوتی ہیں۔ لیکن بارونق شہر کے عین درمیان واقعۃً ایسی سڑک کہیں اور نہیں دیکھی چنانچہ یہ جگہ سیاحوں کا مرکز ہے اور دور دور سے لوگ سڑک کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اتفاق سے اسی سڑک کے قریب ان انسانیت دشمن بد مذاقوں کے محلے کے محلے آباد ہیں جو اپنے آپ کو Gay کہتے ہیں، اور ہم جنس پرستی پر نہ صرف فخر کرتے ہیں، بلکہ ہم جنسوں کے ساتھ شادیاں رچا کر زندگی گذار رہے ہیں۔ چنانچہ ''دنیا کی سب سے ٹیڑھی سڑک'' پر پہنچ کر بے ساختہ میرے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ Their crookedness has been symbolized here یعنی ''ان لوگوں کی کج روی کو یہاں ایک محسوس علامت کی شکل دیدی گئی ہے''

پھر ہمارے دوست ہمیں ایک دو پہاڑوں کے سنگھم (Twin mountains) پر لے گئے۔ یہ دو سرسبز پہاڑیوں کی مشترک چوٹی ہے جہاں سے سان فرانسسکو شہر کا پورا منظر اس طرح نظر آتا ہے جیسے ہم اسے نیچی پرواز کے ہوائی جہاز سے دیکھ رہے ہوں۔ اس کے بعد شہر کی ساحلی سڑک (Marine Drive) پر بھی جانا ہوا۔ یہ ساحلی سڑک سینکڑوں میل لمبی ہے، اور سمندر کے کنارے کنارے لاس اینجلز تک چلی گئی ہے۔

اسی شام مغرب کے بعد سان فرانسسکو کے قلب شہر میں واقع ایک اسلامی سنٹر میں میرا خطاب تھا۔ یہ سنٹر شہر کے تجارتی مرکز میں بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک کشادہ مسجد بھی ہے دار المطالعہ بھی، اور بچوں کی دینی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ یہ سنٹر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا مرکز ہے، جن میں پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، عرب، اور مقامی امریکی مسلمان ملے جلے ہیں، انہی کی فرمائش پر یہاں میرا خطاب ''اسلام کی معاشی تعلیمات'' کے موضوع پر انگریزی میں ہوا، اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے عشاء کی نماز تک جاری رہا۔ حسب معمول یہاں بھی مجمع اچھا خاصا تھا، اور لوگ دور دور سے شرکت کے لئے آئے تھے۔

یہ رات بھی سان فرانسسکو میں گذری۔ اگلے دن (۸/ جون) صبح دس بجے ہم دوبارہ اسٹاکٹن گئے جہاں کے اسلامی مرکز میں ظہر کے بعد ایک اجتماع رکھا ہوا تھا، حاضرین تقریباً تمام پاکستانی یا ہندوستانی تھے۔ لہٰذا خطاب اردو میں ہوا اور تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا۔ خطاب کے فوراً بعد مجھے لاس اینجلس روانہ ہونا تھا۔ یہاں سے سان فرانسسکو کی بہ نسبت سیکرامنٹو زیادہ قریب (تقریباً پچاس میل) تھا۔ اس لئے سیکرامنٹو ایئر پورٹ سے روانگی طے پائی تھی، تقریباً ساڑھے چار بجے شام میں یونائٹڈ ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوا جو پانچ بجے روانہ ہو کر سوا چھ بجے شام لاس اینجلز کے ایئر پورٹ پر اترا۔

پچھلے آٹھ دن کے متواتر سفر اور اجتماعات کے بعد لاس اینجلز میں ایک روزہ قیام میں نے اول تو اپنے دوست عامر اختر صاحب کی دلداری کے لئے رکھا تھا کہ وہ عرصہ سے اس کے لئے مصر تھے۔ دوسرے میں یہ چاہتا تھا کہ آگے کا طویل سفر شروع کرنے سے پہلے مجھے ایک دن ذہنی فراغت کے ساتھ مل جائے، اس لئے میں نے عامر اختر صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ لاس اینجلز میں میری آمد کی اطلاع کسی اور کو نہ کریں۔ انہوں نے بذات خود اس کا اہتمام بھی کیا، لیکن محبت کرنے والوں نے کسی نہ کسی طرح میری آمد کا پتہ لگالیا۔ چنانچہ ایئر پورٹ پر اُترا تو متعدد حضرات استقبال کے لیے موجود تھے اور پتا چلا کہ کچھ اور حضرات پہنچنے والے ہیں۔ بالآخر طے یہ کیا کہ ایئر پورٹ کے قریب مولانا آصف صاحب کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی جائے، اور تمام حضرات سے وہاں ملاقات کرلی جائے۔ چنانچہ عصر کی نماز وہاں ادا کی، اور کچھ دیر ان احباب سے ملاقات اور گفتگو رہی۔ سب حضرات مصر تھے کہ لاس اینجلز کے قیام میں توسیع کی جائے۔ مگر میں پہلے سے طےشدہ پروگرام کی وجہ سے مجبور تھا۔ اس لئے معذرت کے سوا چارہ نہ تھا۔ یہ مسجد جس میں نماز عصر ادا کی گئی، تبلیغی جماعت کا مرکز ہے، اور معلوم ہوا کہ الحمدللہ علاقے میں تبلیغی جدوجہد کا کام اس مرکز کے توسط سے روز بروز ترقی پذیر ہے۔

یہاں سے عامر اختر مجھے اپنے گھر لے گئے۔ دن بھر کے سفر کے بعد کچھ دیر آرام کی ضرورت تھی جو یہاں بھرپور طور پر حاصل ہوا۔ رات کے کھانے اور عشاء کی نماز کے بعد کچھ دیر

سیر کے لیے باہر نکلے تو عامر صاحب نے گاڑی میں لاس اینجلز کے وسط شہر (Down town) کا پورا ہی چکر لگوا دیا۔ لاس اینجلز امریکا ہی نہیں دنیا کے مشہور بارونق اور بڑے شہروں میں سے ہے۔ لیکن رات کے وقت یہاں سڑکوں پر ہُو کا عالم نظر آتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں جرائم کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ رات کے وقت لوگ گھروں سے باہر نہیں نکلتے، کیوں کہ کسی کی جان و مال محفوظ نہیں۔ چنانچہ دن کے وقت جو شہر تمدن اور معاشی سرگرمیوں کا بارونق مرکز ہوتا ہے، دن ڈھلتے ہی وہ ایک ویرانے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ امریکا میں یہ مسئلہ روز بروز شدت اختیار کرتا جارہا ہے کہ وہاں کے بارونق شہر جرائم کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ پولیس اگرچہ اتنی چوکس اور فعال ہے کہ تین منٹ کے نوٹس پر ہر جگہ پہنچ جاتی ہے اور مجرموں کو پکڑنے کے لئے نت نئے وسائل ایجاد ہوچکے ہیں، لیکن جرائم ہیں کہ ان میں کمی آکر نہیں دیتی۔ سان فرانسسکو کے جس ہوٹل میں، میں ٹھہرا تھا، وہاں ہوٹل کے منتظمین کی طرف سے ایک طویل ہدایت نامہ ہمیں دیا گیا۔ جس میں یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ کمرے کے دروازے کے اندر جتنے تالے ہیں وہ سب لگا کر کمرہ بند کریں۔ رات کو سوتے وقت کوئی کھڑکی لاک کیے بغیر نہ سوئیں، دروازے پر دستک ہو تو آنے والے کو پہچانے بغیر دروازہ نہ کھولیں، اگر آنے والا یہ ظاہر کرے کہ وہ ہوٹل کی انتظامیہ کا آدمی ہے تو پہلے استقبالیہ سے فون کر کے تصدیق کریں کہ کیا واقعی انہوں نے کوئی آدمی آپ کے پاس بھیجا ہے، ان مطبوعہ ہدایات سے آپ اندازہ کریں کہ وہاں ہر شخص جرائم کے خوف سے کس طرح لرز رہا ہے، پچھلے سال میں امریکی ریاست مشی گن کے شہر ڈیٹرائٹ گیا تو وہاں بھی یہ منظر دیکھا کہ وسط شہر (Down town) کا رہائشی علاقہ ویران پڑا ہے۔ جرائم کے خوف سے لوگ اپنے گھر چھوڑ کر مضافاتی بستیوں (Suburbs) میں منتقل ہو گئے ہیں، اور ان ویران مکانات پر سیاہ فام آبادی نے قبضہ کرلیا ہے۔ لاس اینجلز کے مرکز شہر میں بھی وہی منظر نظر آرہا تھا۔

ہالی وڈ اور بورلے ہلز (Beverly Hills) جیسے علاقے جو دنیا بھر میں مشہور ہیں تقریباً سنسان پڑے تھے، اور چند سیاحوں اور کچھ بھکاریوں کے سوا وہاں کوئی باہر نظر نہیں آرہا تھا۔

تمدن کی عظیم الشان ترقی کے ساتھ بدامنی اور جرائم کا یہ حال امریکی معاشرے کا وہ تضاد ہے جس کی توجیہ میں ہر منطق ناکام ہو رہی ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

امریکی معاشرے کے ایک اور تضاد کا بھی اسی رات واضح مظاہرہ سامنے آیا۔ بورلے ہلز (Beverly Hills) لاس اینجلز کا وہ محلّہ ہے جس میں دنیا کے امیر ترین افراد آباد ہیں، اسی محلے کی ایک سڑک دنیا کی سب سے مہنگی مارکیٹ کہلاتی ہے۔ عامر صاحب نے اس کی تشریح یوں کی کہ یہاں ہر چیز غیر معمولی طور پر مہنگی ہے، مثلاً ایک ٹائی دو سو ڈالر کی، موزوں کی جوڑی ڈیڑھ سو ڈالر کی، ایک سوٹ ہزاروں ڈالر کا، ایک دوکان کے مالک اپنے گاہکوں کو سوٹ کے انتخاب اور اس کے رنگ اور ڈیزائن کے تعین کے لئے مشورے بھی دیتے ہیں، اور اس مشورے کے بھی ہزاروں ڈالر چارج کرتے ہیں (جو سامان خریدا جائے وہ اس کے علاوہ ہے) اور یہ مشورہ حاصل کرنے کے لئے ان سے پہلے سے وقت لینا پڑتا ہے۔ اور وقت بھی آسانی سے نہیں ملتا، بلکہ بعض اوقات مہینوں بعد ان سے شرف باریابی حاصل کرنے کا نمبر آتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ سڑک دولت کے تالاب رکھنے والوں کے لئے اپنی دولت کے اظہار اور اس کے خرچ کے بہانے ڈھونڈنے کا ایسا ذریعہ ہے جس کے لئے اعلیٰ سطحی حماقت کے سوا کوئی اور لفظ مجھے نہیں مل رہا۔ اس سڑک پر آکر اور اس کی دوکانیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہاں سب وہ لوگ بستے ہیں جو منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن یہاں سے چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر سر بفلک عمارتوں کے نیچے فٹ پاتھ پر ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی جو سڑکوں پر رکھے ہوئے کچرے کے بکسوں سے کوکا کولا، سیون اپ وغیرہ کے خالی ڈبے جمع کر رہے ہوں گے۔ رات بھر یہ ڈبے جمع کر کے وہ صبح کو انہیں کسی کباڑیے کے پاس فروخت کرتے ہیں، اور اس کی قیمت پر اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔ انہی فٹ پاتھوں پر متعدد لوگ ایسے نظر آئے جو ایک ٹرالی میں

پھٹا پرانا سامان رکھے ہوئے جارہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہی ٹرالی ان کا گھر ہے، اور اس میں رکھا ہوا سامان ان کا کل اثاثہ ہے، جب سونے کا وقت آتا ہے تو وہ اسی ٹرالی کو کہیں کھڑا کر کے اس کے سائے میں سو جاتے ہیں۔ انہی فٹ پاتھوں پر بہت سے لوگ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ عامر صاحب نے ایک پیٹرول پمپ پر گاڑی روکی تو ایک سفید فام بھکاری نے ان سے بھیک مانگی۔ ان کے پاس اس وقت ڈالر کے چھوٹے نوٹ نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے معذرت کرنی چاہی۔ اس پر بھکاری نے کہا کہ (I take Pennies) یعنی میں پیسے بھی لے لیتا ہوں۔

چنانچہ انہوں نے چند سکے اسے دیئے اور وہ راضی ہو کر چلا گیا۔

''دولت مندی کے عین درمیان افلاس'' (Poverty in the midst of plenty) کی یہی وہ فضا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے، اسی کے ردعمل کے طور پر اشتراکیت نے جنم لیا تھا۔ آج اگر اشتراکیت، اپنی ذاتی کمزوریوں کی بنا پر شکست کھا گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی یہ خرابیاں دور ہو گئی ہیں۔ یہ خرابیاں آج بھی برقرار ہیں، اور جب تک حقیقت پسندی کے ساتھ انہیں دور نہیں کیا جائے گا، انسانیت افراط و تفریط کی انتہاؤں میں بھٹکتی رہے گی۔

واپسی کا سفر

اگلے روز بارہ بجے دوپہر میری واپسی طے تھی۔ امریکہ کے مغربی کنارے تک پہنچنے کے بعد وطن واپسی کے دو راستے ممکن ہیں، ایک یہ کہ جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے بحر اوقیانوس عبور کر کے یورپ اور پھر وہاں سے واپس پاکستان آئیں، اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ مغرب میں بحر الکاہل عبور کر کے مشرق بعید کے راستے پاکستان پہنچیں۔ میں نے کئی وجوہ سے یہ دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس راستے سے ٹکٹ بھی نسبتاً سستا تھا، اور واپسی میں جاپان رکنے کا بھی موقع تھا، جہاں میں اس سے پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ چنانچہ ۹ رجون بروز پیر میں ساڑھے بارہ بجے نارتھ ویسٹ ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہوا۔ میرے اب تک کے بیشمار سفروں میں یہ

طویل ترین مسلسل پرواز تھی۔ طیارے کو گیارہ گھنٹے متواتر بحرالکاہل (Pacific Ocian) پر پرواز کر کے ٹوکیو پہنچنا تھا، امریکہ کے اس مغربی کنارے سے جاپان کے مشرقی ساحل تک تقریباً چھ ہزار میل کا فاصلہ ہے، اور یہ پوری مسافت سمندر ہی سمندر پر مشتمل ہے۔ پیر کے روز تقریباً ایک بجے دوپہر جہاز نے یہ طویل سفر شروع کیا، اور جب ٹوکیو کے نریتا ایئر پورٹ پر اترا تو منگل ۱۰ر جون کی سہ پہر کے چار بجنے والے تھے، تاریخ اور دن تبدیل ہو چکے تھے لیکن ہمارے سفر کے دوران رات نہیں آئی۔ چونکہ یہ سفر مسلسل مغرب کی سمت میں تھا، اس لئے ہم سورج کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے چنانچہ گیارہ گھنٹے تک مسلسل سہ پہر کا وقت باقی رہا۔ لاس اینجلز سے روانہ ہونے کے تقریباً پانچ گھنٹے بعد جہاز انٹرنیشنل ڈیٹ لائن (International Date Line) سے گذرا، اور تاریخ تبدیل ہوگئی۔ اب تک جہاز کے نقشے پر مغرب کا طول البلد مسلسل بڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا، یہاں تک کہ ۱۸۰ ڈگری طول البلد پر پہنچنے کے بعد مشرقی طول البلد گھٹنا شروع ہوگیا، اور ہم مغرب میں دنیا کے آخری کنارے تک پہنچنے کے بعد مشرق کے آخری کنارے کی طرف منتقل ہوگئے۔

ٹوکیو میں

میں شام کے چار بجے ٹوکیو کے ایئر پورٹ پر اترا تو پاکستانی سفارت خانے کے تھرڈ سیکریٹری مسٹر اصغر گونو استقبال کے لئے موجود تھے۔ ایئر پورٹ کے مراحل سے بہت جلد فارغ ہو کر ہم شہر کے لئے روانہ ہوگئے۔ نریتا ایئر پورٹ ٹوکیو شہر سے تقریباً اسی میل دور ہے ٹوکیو اور اس کے مضافات میں ہائی ویز کا نظام بڑا مستحکم ہے جس کے ذریعہ دور دراز کے فاصلے آسانی سے طے ہو جاتے ہیں، لیکن ان ہائی ویز کے استعمال پر ٹول ٹیکس انتہائی گراں ہے۔ گونو صاحب نے مجھے بتایا کہ کار کے ذریعہ ایئر پورٹ آمد و رفت پر صرف ٹول ٹیکس کی ادائیگی میں تقریباً دو سو ڈالر کے برابر رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ ٹول ٹیکس کے حوالے سے یہ رقم اتنی زیادہ ہے کہ ہم جیسے پاکستانی کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی ہے۔

میں ہوٹل پہنچا تو مغرب میں ابھی ایک گھنٹے سے زائد وقت باقی تھا۔ یہاں پہنچ کر میں

نے عصر کی نماز پڑھی، جبکہ ظہر کی نماز میں امریکہ میں پڑھ کر روانہ ہوا تھا۔ اس بارہ تیرہ گھنٹے کے عرصے میں کسی اور نماز کا وقت نہیں آیا، اور آج میرا دن تیس گھنٹے لمبا ہوا اور اس کے نتیجے میں کھانے اور سونے کے اوقات اور دوسرے معمولات شب و روز ایسے خلط ملط ہو گئے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آدمی کب کھائے اور کب سوئے؟ میرا ہوٹل ایک سمندری خلیج کے کنارے واقع تھا، اور یہاں سے حد نظر تک بحرالکاہل کی نیلگوں موجیں کروٹیں لیتی نظر آ رہی تھیں۔ اسی سمت سے چھ ہزار میل لمبی پرواز کے ذریعہ میں چند گھنٹوں میں یہاں تک پہنچ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ذرائع مواصلات کی برق رفتاری نے پوری دنیا کو کس طرح سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

ٹوکیو میں ایک پاکستانی نژاد تاجر جناب شیخ قیصر صاحب یہاں کی پاکستانی برداری میں بڑی ہر دلعزیز شخصیت کے مالک ہیں، اور متعدد سماجی اور فلاحی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہتے ہیں، رات کو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ ٹوکیو میں قیام کے دوران وہ اپنے دو رفقاء میری رہنمائی کے لئے صبح میرے پاس بھیج دیں گے، اور رات کو انہوں نے ایک عشائیہ کا اہتمام کیا ہے جس میں شہر کے خاص خاص پاکستانی حضرات کو بھی مدعو کیا ہے۔ چنانچہ اگلی صبح (۱۱رجون) ۸ بجے الیاس جاوید صاحب میرے پاس پہنچ گئے۔

اور مجھے لے کر پہلے شیخ قیصر صاحب کے دفتر پہنچے، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کو ٹوکیو کی تاجر برادری میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے، اور وہ یہاں پاکستان کی نیک نامی کا باعث ہیں۔ یہاں سے شیخ صاحب کے ایک اور رفیق محمد نعیم صاحب بھی ہمارے ساتھ ہو گئے، میں ٹوکیو کے خاص خاص مقامات کے علاوہ یہاں کے اسلامی سنٹر بھی جانا چاہتا تھا، الیاس جاوید صاحب اور نعیم صاحب بہترین رہنما اور ہمسفر ثابت ہوئے، انہوں نے مختصر وقت میں ٹوکیو جیسے شہر کا بہت بڑا حصہ دکھا دیا۔

جاپان نے پچھلے چالیس سال میں صنعتی اور سائنسی میدان میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، ٹوکیو واقعۃً اس کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔ جدید تمدن کے بیشمار عجوبوں پر مشتمل یہ شہر اپنی گنجان آبادی کے باوجود اپنی وسعت، صفائی ستھرائی، بلند عمارتوں، بارونق سڑکوں، خوبصورت بازاروں اور قدم قدم پر بنے ہوئے فلائی اوورز کے اعتبار سے دنیا کے گنے چنے شہروں میں شمار

ہوتا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے کہ عام طور پر یورپ اور امریکہ کے بڑے شہروں میں صرف وسطی علاقہ (Down town) بارونق ہوتا ہے جو عموماً چار پانچ میل کی حدود میں ہوتا ہے، لیکن ٹوکیو تقریباً پورا ہی اس معیار کا ہے۔ جدید انداز کی سر بفلک عمارتیں بھی ٹوکیو میں بہت سی ہیں، کچھ عرصہ قبل گورنمنٹ سیکریٹریٹ کی ۶۵ منزلہ عمارت (ٹوچو بلڈنگ) اس طرح تعمیر کی گئی ہے کہ اس کے تین حصے تین مختلف سڑکوں پر واقع ہیں، لیکن درمیانی پل کے ذریعہ ان کو آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ یہ پرشکوہ اور وسیع عمارت، جو ایک عام آدمی کے لئے بھول بھلیاں سے کم نہیں، جدید فن تعمیر کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔

شہر کے وسط میں ٹوکیو ٹاور بھی سیاحوں کی دلچسپی کا خاص مرکز ہے یہ ٹاور پیرس کے ایفل ٹاور کے طرز پر بنایا گیا ہے، لیکن ایفل ٹاور ۳۲۰ میٹر بلند ہے، اور اس کی بلندی ۳۳۳ میٹر تک پہنچا کر اسے دنیا کے سب سے بڑے لوہے کے ٹاور کی حیثیت دیدی گئی ہے۔ لیکن ایفل ٹاور کا وزن سات ہزار ٹن ہے۔ اور اس ٹاور کا وزن صرف چار ہزار ٹن، کیونکہ اس میں لوہے کی ایسی جدید ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے جس نے کم وزن سے زیادہ کام لے لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایفل ٹاور محض ایک تفریحی اور علامتی ٹاور ہے، لیکن ٹوکیو ٹاور سے اس کے بنانے والوں نے بہت سے فنی اور تیکنیکی کام لئے ہیں اور اس میں ایک موی میوزیم بھی بنایا ہے جو لندن کے مادام تساد میوزیم سے ملتا جلتا ہے۔ اس ٹاور میں ۶۴ افلڈ لائٹس نصب ہیں جن کی وجہ سے رات کے وقت وہ ایک روشنی کا دلکش مینار نظر آتا ہے اور ماحول کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

اگرچہ مہنگائی کے اعتبار سے یہ شہر شاید دنیا کا گراں ترین شہر ہو، لیکن لوگوں کی آمدنیاں بھی اسی تناسب سے زیادہ ہیں، اور عام طور سے لوگ خوشحال ہیں، لوگوں میں نرم مزاجی اور صلح جوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، ہمارے جو پاکستانی بھائی سالہا سال سے وہاں مقیم ہیں انہوں نے بتایا کہ اس پورے عرصہ میں انہوں نے کبھی دو آدمیوں کو لڑتے یا بلند آواز سے تو تکار کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جرائم کا اوسط بھی بہت کم ہے۔ اور لوگ عموماً فرض شناس، محنتی اور اپنے اپنے کام کے لئے مخلص ہیں۔ اسی محنت اور فرض شناسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے مختصر مدت میں ایک پسماندہ ملک کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے کہ آج یہ ملک امریکہ جیسی طاقت کے لئے

بھی ایک مضبوط تجارتی اور صنعتی حریف بنا ہوا ہے۔

سڑکوں پر عام طور سے پولیس نظر نہیں آتی، اس کے باوجود لوگ ٹریفک اور دوسرے ضابطوں کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پولیس عام راستوں پر کھڑی ہونے کے بجائے ہیڈ کوارٹرز میں اسکرینوں کی مدد سے مختلف علاقوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اور جہاں ضرورت ہو، چند منٹ کے نوٹس پر وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اگرچہ مغربی اثرات جاپان پر بھی تیز رفتاری سے حملہ آور ہو رہے ہیں لیکن پھر بھی مشرقیت کے کچھ نہ کچھ آثار یہاں ابھی پائے جاتے ہیں، فحاشی و عریانی اس طرح کی نہیں ہے جیسی مغربی ممالک میں دیکھنے میں آتی ہے، خاندانی نظام بھی ابھی بڑی حد تک محفوظ ہے، جن پاکستانی احباب سے ملاقات ہوئی، ان میں سے اکثر نے جاپانی خواتین کو مسلمان کر کے ان سے شادیاں کی ہیں اور وہ سب اس بات پر متفق نظر آئے کہ جاپانی خواتین بڑی وفادار، جفاکش اور ایثار کی خوگر ہوتی ہیں۔

جاپان کے پاس قدرتی وسائل شاید اتنے زیادہ نہیں ہیں لیکن یہاں کے لوگوں نے محنت، جفاکشی، اپنے ملک وقوم کی غیرت وحمیت اور اخلاص وامانت کے ذریعہ اپنے ملک کی تعمیر کی ہے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی زریں بات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ باطل میں اللہ تعالیٰ نے ابھرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھی، قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ''ان الباطل کان زھوقا'' (یعنی باطل مٹنے والی چیز ہے۔)

لہٰذا اگر کسی باطل عقیدے کی قوم کبھی ابھرتی اور ترقی کرتی نظر آئے تو سمجھ لو کہ اسے ابھارنے والی چیز اس کا باطل عقیدہ یا نظریہ نہیں ہے، بلکہ اس نے ضرور کسی حق بات کو اختیار کیا ہے اور اس حق بات کے نتیجے میں اسے فروغ نصیب ہوا ہے۔ لہٰذا جتنی باطل قوتیں آج ترقی کر رہی ہیں، ان کی ترقی کا سبب محنت، جفاکشی، امانت سچائی اور اپنے مشن کے لئے اخلاص ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو قوموں کو ابھار کر ترقی کی راہ پر گامزن کرتے ہیں۔

دوسرے ملکوں میں یہ سب کچھ دیکھ کر یقیناً دل حسرت سے بھر جاتا ہے کہ یہ تمام اوصاف کبھی ہمارے تھے۔ ہم نے انہیں چھوڑ کر صرف اپنا نقصان نہیں کیا، بلکہ اپنے دین، اپنے ملک اور اپنی ملت کو دنیا بھر میں بدنام کر ڈالا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بہترین قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ انسانی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی ہم بفضلہ تعالیٰ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، لیکن امانت و دیانت کے فقدان، کرپشن، خودغرضی اور محنت کے بغیر آمدنی کے حصول کے شوق نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ خدا جانے من حیث القوم ہمیں اپنے ان تباہ کن جرائم کا احساس کب ہوگا؟

ٹوکیو میں ایک اسلامی سنٹر بھی قائم ہے۔ ہم نے ظہر کی نماز وہیں جا کر ادا کی۔ سنٹر کے سربراہ جناب صالح سامرائی ایک عراقی مسلمان ہیں۔ جو شروع میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاپان آئے تھے، پھر جاپان میں دعوت اسلام کا کام کرنے کے ارادے سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے علاوہ جناب عبدالرحمٰن صدیقی صاحب پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی اس مرکز کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جاپان میں اسلام

جاپان میں اسلام کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی اور متوسط زمانوں میں یہاں کسی مسلمان کی رسائی یا کسی دعوتی کام کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم تاریخ میں شاید سب سے پہلے خلافت عثمانیہ کے سلطان عبدالحمید نے ۱۸۹۰ء میں بحری راستے سے اپنی بحریہ کے جہاز ارطغرل میں ایک خیر سگالی مشن جاپان بھیجا تھا، بظاہر اس کا مقصد اس علاقے میں دعوت اسلام کے امکانات کا جائزہ بھی لینا تھا۔ اس وفد نے جاپان میں بہت اچھے اثرات قائم کئے، اور درحقیقت اس سرزمین میں قبول اسلام کا بیج بو دیا، لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ جب یہ وفد واپس ترکی جانے لگا تو جاپان ہی کے سمندر میں شدید طوفان کی وجہ سے اس کا جہاز غرق ہو گیا، اور اس پر سوار ۶۰۹ افراد میں سے صرف ۶۹ افراد زندہ بچ سکے، باقی سب شہید ہو گئے۔ یہ حادثہ رات کی تاریکی میں پیش آیا تھا، اور قریبی جزیرے کے جاپانی باشندوں نے متاثرہ افراد کی

بڑی گرمجوشی سے مدد کی، جاپان کے بادشاہ میجی نے زخمیوں کے علاج اور زندہ بچ جانے والوں کو ترکی بھیجنے کا انتظام کیا، اور حادثے میں شہید ہونے والوں کی یادگار ''ارطغرل'' کے نام سے تعمیر کی۔ اور اس وقت سے ہر سال اس حادثے کی یادگار منانے کے لئے جاپان میں ایک تقریب منقعد کی جاتی ہے۔

اس خیر سگالی مشن کے بیشتر ارکان اگرچہ شہید ہوگئے، لیکن ان کی قربانی رنگ لائی۔ جاپان کے لوگوں پر اس حادثے کا بہت اثر تھا، ایک ۲۴ سالہ نوجوان توراجیرو یما جو اعلیٰ تعلیم یافتہ صحافی تھا اس حادثے سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے ملک کے طول وعرض میں اس حادثے کے شہداء کے اہل خاندان کی مدد کے لئے چندہ جمع کرنے کی ایک مہم چلائی، اور ۵۴۰ شہداء کے گھروالوں کے لئے امداد کی ایک بڑی رقم اکٹھی کر کے اپنے وزیر خارجہ سے درخواست کی کہ یہ رقم ترکی بھیج دی جائے، وزیر خارجہ نے اس کے جذبے کی قدردانی کرتے ہوئے خود اسی کو یہ رقم لے کر ترکی روانہ کردیا۔ توراجیرو استنبول پہنچ کر ترکی وزیر خارجہ سے ملا اور ایک عالیشان تقریب میں یہ رقم ترکی کی وزارت بحریہ کے حوالے کی گئی۔ تاکہ وہ متاثرہ افراد میں تقسیم کی جاسکے۔

اس موقع پر خود سلطان عبدالحمید نے توراجیرو کو بلا کر اسے یہ پیشکش کی کہ وہ دو سال ترکی میں رہ کر یہاں کے فوجی افسروں کو جاپانی زبان سکھائے۔ توراجیرو نے یہ پیشکش قبول کرلی، اور ترکی افسران کو جاپانی زبان سکھانے کے ساتھ خود اس نے ترکی زبان سیکھی، اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنی شروع کیں۔ اور کچھ ہی عرصے میں مسلمان ہو کر اپنے نام کے ساتھ ''شنگیت سو'' (Shingetsu) کا اضافہ کرلیا جو جاپانی زبان میں ''ہلال'' کو کہتے ہیں بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا اسلامی نام ''عبدالخلیل'' رکھا تھا۔ ترکی میں قیام کے دوران جب وہ اپنے گھروالوں کو خط لکھتا تو اپنا یہ اسلامی نام ساتھ لکھا کرتا تھا۔ اگرچہ ابھی جاپان میں اسلام کے داخلے کی تاریخ پر بہت کچھ ریسرچ باقی ہے، لیکن اب تک کی معلومات کے مطابق توراجیرو جاپان کی سرزمین کا پہلا شخص تھا جس نے اسلام قبول کیا۔ اس شخص نے ۹۱ سال عمر پائی۔ اور ۱۹۵۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ اس واقعے کے بعد ایک اور جاپانی شخص یاماؤ کا نے ۱۹۰۹ء میں اسلام قبول کر کے اپنا نام عمر یاماؤ کا رکھا، اور حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک اور جاپانی شخص بمپاچیر واریگا نے بمبئی کا سفر کیا، اور مقامی مسلمانوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اس نے بھی اسلام قبول کیا اور اپنا نام احمد اریگا رکھا۔ ان دونوں نے جاپان واپس آ کر اسلام کی تبلیغ شروع کی، اور اس کے بعد اور بھی متعدد جاپانی افراد مسلمان ہوئے۔

ادھر ترکستان میں بالشویک انقلاب کے دوران روسیوں کے مظالم سے تنگ آ کر ازبکستان، تاجکستان، قازقستان، اور کرغیزستان سے مسلمانوں کی بڑی تعداد دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلی، ان میں سے کچھ لوگ جاپان بھی پہنچے، اور انہوں نے یہاں آ کر سیاسی پناہ حاصل کی۔ ان لوگوں کے جاپان میں سکونت اختیار کرنے سے مسلمانوں کی اجتماعی سرگرمیاں شروع ہوئیں، اور ان کی جدوجہد کے نتیجے میں بھی بہت سے جاپانی باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ ساتھ ہی انڈیا، چین اور جنوبی ایشیاء کے دوسرے ملکوں سے بھی کچھ مسلمان جاپان میں آ کر آباد ہوئے، اور ان کی جدوجہد سے پہلی بار ۱۹۳۵ء میں کوبے میں ایک مسجد قائم ہوئی۔ پھر ۱۹۳۸ء میں ٹوکیو میں بھی ایک مسجد قائم ہوگئی۔ اس مسجد کے قیام میں جاپان کے کچھ بااثر غیر مسلم افراد نے بھی مالی تعاون کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء ہی میں جاپان کے ایک اور شہر نگویا میں ایک مسجد بنی، اور ۱۹۷۷ء میں اوساکا میں بھی ایک مسجد قائم ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان کو بہت سے مسلم ممالک سے رابطے قائم کرنے پڑے، اور جنگ کے خاتمے پر اپنی صنعتی ترقی کے لئے تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک سے روابط مزید استوار ہوئے۔ اس کے نتیجے میں جاپان میں مسلمانوں کی آمد و رفت بڑھی، جاپانی باشندے بھی مسلم ملکوں میں پہنچے، اس طرح دوطرفہ طور پر جاپان میں اسلام کی اشاعت تیز رفتاری سے ہوئی۔ اس دوران جاپانی مسلمانوں نے کچھ تنظیمیں بھی قائم کیں۔ قرآن کریم کے جاپانی زبان میں کئی ترجمے ہوئے، اسلامی معلومات پر مشتمل کتابیں تیار ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء میں ایک انٹرنیشنل اسلامک سنٹر قائم ہوا جو ۱۹۷۴ء میں اس "اسلامک سنٹر جاپان" میں ضم ہوگیا

جس میں ہم اس وقت موجود تھے۔[1]

یہ سنٹر ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیر انتظام چل رہا ہے جس کے ارکان میں عرب، پاکستانی، ترکی اور خود جاپانی مسلمان شامل ہیں۔ سنٹر کا خرچ زیادہ تر سعودی حکومت، رابطہ عالم اسلامی، خلیج کی ریاستوں میں سے متحدہ عرب امارات، قطر کی حکومت اور او آئی سی مل کر اٹھاتے ہیں۔ سنٹر کی طرف سے تقریباً چالیس کتابیں جاپانی زبان میں شائع کی گئی ہیں جن میں قرآن کریم کا ایک جاپانی ترجمہ بھی داخل ہے۔ ''السلام'' کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ بھی شائع ہوتا ہے۔ بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کا بھی بہت محدود پیمانے پر انتظام حال ہی میں شروع کیا گیا ہے۔ سنٹر کی طرف سے ہر سال جاپانی عازمین حج کو حج پر بھیجنے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً یہاں مذاکرے اور تقاریر بھی ہوتی ہیں جن کے ذریعے اہل جاپان کو بنیادی اسلامی تعلیمات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

اس سنٹر کے علاوہ تبلیغی جماعت نے بھی ۱۹۵۶ء سے جاپان میں اپنی دعوتی سرگرمیاں شروع کیں جو بفضلہ تعالیٰ بہت کامیاب رہیں۔ تبلیغی جماعت کے حضرات نے ٹوکیو کے مضافاتی علاقے سائی تاما (Saitama) میں ایک عمارت خرید کر وہاں ایک مسجد بھی قائم کی جو اس وقت تبلیغی مرکز کی خدمات بھی انجام دے رہی ہے، اور اس کی سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء تک جاپانی مسلمانوں کی تعداد تین ہزار بتائی جاتی تھی۔ اب سرکاری اعداد و شمار کے مطابق وہاں مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار ہے۔ اس کے علاوہ جو مسلمان دوسرے ملکوں سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں، ان کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جاپان میں مجموعی طور پر تقریباً ڈھائی لاکھ مسلمان موجود ہیں۔[2]

---

[1] جاپان میں اسلام کے داخلے کی یہ تاریخ ایک جاپانی مسلمان ابوبکر موری موٹو کی کتاب (Islam in Japan) سے ماخوذ ہے جو ٹوکیو کے اسلامک سنٹر سے شائع ہوئی ہے۔

[2] ''الاسلام فی الیابان'' مولفہ ڈاکٹر صالح سامرائی ص ۴

جاپانی مسلمانوں کی ضروریات

اگر چہ پچھلے چند سالوں کے دوران جاپان میں مسلمانوں کی تعداد میں خاصی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔لیکن ان کی دینی ضروریات کی تکمیل اس کے مقابلے میں انتہائی سست رفتار ہے، اور ابھی یہاں دینی سرگرمیوں کی وہ فضا پیدا نہیں ہوئی جو یورپ اور امریکہ کے بعض ملکوں میں بفضلہ تعالیٰ پیدا ہو چکی ہے۔

کسی بھی مسلم معاشرے کی سب سے بڑی دینی ضرورت مسجد ہے، مسجد ہی وہ مرکز ہے جہاں مسلمان دینی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور جہاں سے دینی فکر کی شعاعیں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرف پھوٹتی ہیں۔اب ٹوکیو شہر کا حال یہ ہے کہ اگر چہ شہر میں مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لئے کئی مصلے قائم کئے ہوئے ہیں، لیکن اس وقت شہر میں باقاعدہ مسجد ایک بھی نہیں ہے۔ٹوکیو کی جو مسجد ۱۹۳۸ء میں تعمیر ہوئی تھی، اور جس کا ذکر پیچھے آیا ہے، وہ عرصہ دراز تک قائم رہی، اور اس کے ذریعہ ہزاروں افراد کو دولت ایمان نصیب ہوئی، دوسری جنگ عظیم کے دوران جب آس پاس کی دوسری عمارتیں بمباری سے تباہ ہو گئیں، مسجد اپنی جگہ قائم رہی، لیکن کچھ سال پہلے زلزلوں اور سیلاب سے اس کی عمارت بوسیدہ ہو کر منہدم ہوگئی، اب وہ جگہ خالی پڑی ہے۔جاپان میں تعمیر اتنی گراں ہے کہ اس کو از سر نو تعمیر کرنے کے لئے تقریباً ایک کروڑ امریکی ڈالر کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔اسلامک سنٹر نے اس کا نقشہ تیار کرالیا ہے۔اور تعمیر کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔اس سال دسمبر تک تعمیر شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ مرکز نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ٹوکیو کی اس واحد بڑی مسجد کی تعمیر میں حصہ لیں۔اسلامی سنٹر کا پتہ یہ ہے:

Tokyo mosque

c/o Islamic centre- japan

1-16- H OHARI- SETA GAYAKU

Tokyo. japan-T 156

phone: 03-3460-6169, Fax: 03-3460-6105

مسجد کا اکاوئٹ نمبر یہ ہے:

Islamic Centre- Japan, Mosque Fund Account

The Sumitomo Bank Ltd, Shinjuku Nishiguchi

Branch, Tokyo Japan

Current Account no. 204129

دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک جاپان میں قرآن کریم اور دینیات کی تعلیم کے لئے کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں سے جو مسلمان جاپان میں آ کر آباد ہوئے ہیں، وہ بکثرت جاپانی خواتین کو مسلمان کر کے ان سے شادیاں کر رہے ہیں۔ لیکن ان خواتین کی دینی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام ہے، نہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا۔ چنانچہ وہاں کے مسلمانوں کی اہم ترین دینی ضرورت یہ ہے کہ اس قسم کے مکاتب و مدارس قائم ہوں جو اس کمی کی تلافی کر سکیں۔

تیسرا مسئلہ جاپانی زبان میں دینی معلومات پر مشتمل کتابوں کی کمی کا ہے۔ اگرچہ اسلامک سنٹر نے تقریباً چالیس کتابیں اب تک جاپانی زبان میں شائع کی ہیں، لیکن اس لٹریچر میں مزید اضافے کی ضرورت ہے۔

جاپانی باشندے دین و مذہب کے معاملے میں خاصے کھلے ذہن کے حامل ہیں، اس لئے ان تک اسلام کی دعوت موثر انداز میں پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے دہشت گردی کی وارداتیں کر کے مغربی پریس کو یہ جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں، اور مغربی پریس کے اس پروپیگنڈے کا اثر جاپان کے لوگوں پر بھی ہوا ہے، اور اس کی وجہ سے دعوت اسلام کے راستے میں اچھی خاصی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے، لیکن اگر حکمت اور سچائی کے ساتھ اہل جاپان کو اسلام کا پیغام پہنچا دیا جائے تو یہ زمین اب بھی زرخیز ثابت ہو سکتی ہے۔

اسلامک سنٹر میں میری آمد کی اطلاع پہلے ہی فون کے ذریعے ہوچکی تھی، سنٹر کے سربراہ جناب صالح سامرائی اور سیکریٹری جناب عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے بڑی محبت اور تپاک سے استقبال کیا۔ سنٹر کے مختلف حصے دکھائے، اب تک کی کارکردگی کی تفصیلات بتائیں اور مسائل سے آگاہ کیا۔

سنٹر کی شخصیات میں حال ہی میں ایک درویش صفت بزرگ مولانا نعمت اللہ خلیل صاحب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اصلاً ازبکستان کے رہنے والے ہیں اور روسی مظالم کے زمانے میں حجاز کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ عرصۂ دراز تک مکہ مکرمہ کی مسجد النور میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کئی بار پاکستان بھی آئے۔ مجھ سے وہ سعودی عرب میں بھی ملے، اور ایک مرتبہ تاشقند میں بھی۔ کسی وقت ان کی ملاقات صالح سامرائی صاحب سے ہوگئی جنہوں نے ان کو جاپان آکر تبلیغ کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی، اور اب وہ یہاں پہنچ کر عجیب وغریب دھن کے ساتھ تبلیغی کام میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر سامرائی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان بزرگ کی آمد سے پہلے جب جاپانی باشندے سنٹر میں اسلام کے بارے میں معلومات لینے کے لئے آتے تھے تو ہم انہیں مطلوبہ معلومات فراہم کر کے رخصت کردیا کرتے تھے، لیکن جب سے مولانا نعمت اللہ صاحب آئے ہیں، وہ آنے والوں کو محض معلومات دے کر رخصت نہیں ہونے دیتے بلکہ انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اور ان کی دعوت پر بہت سے لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کا ایک نرالا طریق کار یہ ہے کہ انہوں نے ایک چار صفحے کا پمفلٹ جاپانی زبان میں ''اسلام کیا ہے؟'' کے عنوان سے چھپوالیا ہے۔ دوسری طرف جاپانی زبان کے چند جملے سیکھ لئے ہیں جن میں سے ایک جملہ یہ ہے کہ ''جاپان کے لوگ بہت اچھے ہیں، مجھے ان سے محبت ہے'' اور ''میری طرف سے یہ تحفہ قبول کیجئے''۔ جب ان کی کسی نئے جاپانی شخص سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ پہلے اس سے یہ جملے بولتے ہیں، پھر اپنا وہ کتابچہ تحفہ کے طور پر اسے پیش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے کہتے ہیں کہ ''جو میں کہوں آپ بھی کہئے'' اس کے بعد اس کے سامنے کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں۔ اس کو چند مرتبہ دہرواتے ہیں، پھر اس سے اس کا نام پوچھتے ہیں، وہ جو

جاپانی نام بتاتا ہے، اس کے ساتھ کوئی اسلامی نام مثلاً احمد، عمر، علی وغیرہ لگا کر اس سے کہتے ہیں کہ "آج سے آپ کا نام یہ ہے" پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ "اب آپ کا نام کیا ہے؟" وہ ان کا تجویز کردہ نام دہرا دیتا ہے تو کہتے ہیں "اب آپ اطمینان سے یہ کتابچہ پڑھ لیجئے۔"

میں نے ان کا یہ طریق کار سنا تو ان سے پوچھا کہ "کیا اس طرح وہ اسلام کو سمجھ لیتا ہے؟" ڈاکٹر صالح سامرائی نے ان کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "پہلے میں بھی ان کے اس طریقے کو مذاق سمجھتا تھا، لیکن ان کے پاس ایک عجیب فلسفہ ہے اور اس فلسفے کے حیرت انگیز نتائج میں نے خود دیکھے ہیں، وہ فلسفہ آپ انہی سے سنئے۔" اس پر مولانا نعمت اللہ صاحب نے کہا کہ "دراصل کلمہ طیبہ ایک نور ہے، اگر وہ بے سمجھے پڑھا جائے تو اس کا نور انسان پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر ڈالتا ہے، دیکھئے آنحضرت ﷺ عکاظ کے میلے میں یہی دعوت دیتے تھے کہ لا اله الا الله کہو، فلاح پا جاؤ گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرا مخاطب ایک مرتبہ یہ نورانی کلمہ زبان سے کہہ لے تو اس کا نور کبھی نہ کبھی اثر دکھائے گا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صالح سامرائی نے بتایا کہ ان کے یہاں آنے کے بعد ایک دن ٹوکیو یونیورسٹی کے ایک استاد اپنی تدریس کے سلسلے میں اسلام کے بارے میں کچھ معلومات کرنے سنٹر آئے۔ جب وہ جانے لگے تو مولانا نعمت اللہ صاحب نے اپنے مذکورہ طریق کار کے تحت ان سے کہا کہ "لا اله الا الله" پڑھئے، انہوں نے پڑھ لیا، اور مولانا کے اس انداز سے ایسے متاثر ہوئے کہ اسی وقت واقعۃً اسلام قبول کر لیا، اور کہا کہ میں یونیورسٹی کے دوسرے اساتذہ کو جمع کر کے انہیں بھی اس نعمت میں شریک کروں گا۔ چنانچہ چند روز بعد ان کا فون آیا کہ میں نے آج فلاں وقت پر بہت سے اساتذہ کو جمع کیا ہے، اور انہیں اسلام کے بارے میں بتا بھی دیا ہے، ساتھ ہی انہوں نے مولانا نعمت اللہ صاحب سے فرمائش کی کہ آپ اس وقت یونیورسٹی پہنچ جائیں۔ مولانا کو یونیورسٹی کا پتہ تک معلوم نہ تھا، لیکن وہ پتہ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ گئے، وہاں واقعۃً یونیورسٹی کے پندرہ بیس اساتذہ ایک کمرے میں جمع تھے، مولانا نعمت صاحب نے اپنا وہی نسخہ ان کے سامنے بھی آزمایا، وہ سب مسلمان ہوئے، اور اب سنٹر سے بحیثیت مسلمان ان کا رابطہ قائم ہے۔

ڈاکٹر صالح یہ واقعہ سنا رہے تھے اور مجھے یہ مصرعہ یاد آ رہا تھا۔

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

سنٹر سے رخصت ہوتے وقت مولانا نعمت اللہ صاحب میرے ساتھ ہو گئے، ان کے ساتھ اپنے کتابچوں کی ایک گڈی تھی، میں نے دیکھا کہ ان پر تبلیغ کی یہ دھن سوار ہے کہ جہاں جہاں ہم گئے، انہوں نے کتابچوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جن لوگوں کو یہ کتابچے دیئے گئے ہیں، ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور بعد میں رابطہ قائم کریں گے، اور مجھے اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جاپان کی ہدایت کے لئے مولانا نعمت اللہ صاحب کی شکل میں ایک لطیفہ غیبی بھیج دیا ہو، جس کے طریق کار کے بعض حصے ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہیں۔

مغرب کے بعد شیخ قیصر صاحب نے احقر سے ملاقات کے لئے کچھ پاکستانی احباب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ شیخ قیصر صاحب جاپان میں مسلم لیگ کے صدر بھی ہیں، اور انہوں نے ایک عمارت میں مسلم لیگ کا دفتر بھی قائم کیا ہوا ہے۔ پہلے وہ ہمیں اس دفتر میں لے گئے اور بتایا کہ درحقیقت یہ دفتر ہم نے اس لئے قائم کیا ہے کہ پاکستانی اور مسلم برادری کے درمیان رابطے کی ایک شکل پیدا ہو۔ چنانچہ یہاں مل بیٹھنے سے کمیونٹی کے مسائل پر تبادلہ خیال اور ان کے حل کے لئے کوشش کا ایک موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ ٹوکیو جیسے شہر میں جہاں ایک چھوٹے سے کمرے کا حصول لاکھوں روپے کی بات ہے، ایک اجتماعی کام کے لئے یہ عمارت مخصوص کر دینا یقیناً شیخ قیصر صاحب کا قابل تعریف کارنامہ ہے۔ اس روز بھی اس دفتر میں پاکستانی احباب جمع تھے، مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، سب کو پاکستان کے لئے فکرمند پایا۔ بالآخر میں نے ان حضرات کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کیں جن میں اہم ترین بات یہی تھی کہ اگرچہ جاپان میں صرف پاکستانی حضرات کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔ دوسرے مسلم ملکوں کے لوگ ان کے علاوہ ہیں، لیکن ان مسلمان خاندانوں کی دینی تعلیم وتربیت کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں پیدا ہونے والے مسلم بچے بنیادی ارکان دین تک سے ناآشنا ہیں اور اس سنگین کمی کی تلافی فوری طور پر ضروری ہے۔ میں نے عرض کیا

کہ یورپ اور امریکہ میں اب مسلمان رفتہ رفتہ اس ضرورت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، اور اس کے نتیجے میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا کچھ نہ کچھ انتظام تقریباً ہر جگہ ہو رہا ہے، اور بعض شہروں میں تو بڑے اعلیٰ پیمانے کے انتظامات موجود ہیں۔ جاپان میں بھی اس قسم کے انتظام کو اپنے تمام اجتماعی کاموں پر اولیت دینی چاہیئے۔ حاضرین نے اس ضرورت سے اتفاق کیا، اور بتایا کہ ہمارے ذہن میں بھی یہ کام بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن ابھی تک ہمارے درمیان اجتماعیت کی خاطر خواہ فضا پیدا نہیں ہوئی، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پلیٹ فارم سے لوگوں کو جمع کر کے اسی قسم کے اجتماعی مسائل حل کرنے کی بنیاد ڈالیں۔ شیخ قیصر صاحب نے بتایا کہ اس دفتر کے قیام کے میرے پیش نظر یہی ہے کہ ہم جمع ہو کر رفتہ رفتہ اپنے معاشرتی مسائل کے لئے کام کریں۔ اور انشاء اللہ اب زیادہ اہمیت کے ساتھ اس طرف توجہ دیں گے۔

شیخ قیصر صاحب نے قریب ہی میں ایک پاکستانی ریسٹورنٹ قائم کیا ہوا ہے، جہاں حلال گوشت اور پاکستانی طرز کے کھانوں کا انتظام ہے۔ وہیں انہوں نے سب کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ جاپان میں بیٹھ کر پاکستانی طرز کے تکّے، کباب، تنوری نان اور دیسی طرز کے دوسرے کھانے یقیناً ایک نعمت تھے۔ رات گئے تک یہ محفل جاری رہی، اور میں ان حضرات کی محبت و خلوص کا گہرا نقش لے کر رات بارہ بجے ہوٹل واپس پہنچا۔

اگلی صبح (۱۲ر جون) کو ساڑھے آٹھ بجے پھر ایئرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ تقریباً بارہ بجے دوپہر تھائی ایئرویز کے ذریعہ روانہ ہوا، اور بنکاک کے راستے پاکستانی وقت کے مطابق رات ساڑھے دس بجے کراچی واپس پہنچا، اور اس طرح پورے بارہ دن میں کرۂ زمین کا ایک پورا چکر مکمل ہوگیا۔ وللہ الحمد اولہ و آخرہ۔

آسٹریلیا میں چند روز



ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
جون ۲۰۰۰ء

آسٹریلیا میں چند روز

دنیا کے پانچ بڑِ اعظموں میں سے ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ چاروں کے بیشتر مشہور اور نمایاں ملکوں میں مجھے جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے، لیکن پانچویں برِّ اعظم یعنی آسٹریلیا کی طرف ابھی تک میرا کوئی سفر نہیں ہوا تھا۔ کئی مرتبہ وہاں کے مختلف دوستوں نے وہاں آنے کی دعوت دی، لیکن میری مصروفیات کی وجہ سے کوئی حتمی پروگرام نہ بن سکا۔ پچھلے سال اکتوبر میں گولڈ کوسٹ کے مولانا اسد اللہ طارق صاحب کراچی تشریف لائے، اور انہوں نے بڑے اہتمام سے آسٹریلیا آنے کی دعوت دی۔ میں نے اپنے نظم اوقات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ عرض کیا کہ انشاء اللہ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ کے آخر (یعنی اپریل ۲۰۰۰ء) میں میرے لئے آنا اس لیے ممکن ہوگا کہ اس وقت دارالعلوم میں سہ ماہی امتحان ہورہے ہوں گے اور میں انشاء اللہ ہفتہ دس دن آسٹریلیا کے سفر کے لئے نکال سکوں گا۔

مولانا کی تحریک پر کوئنز لینڈ کی ایک اسلامک سوسائٹی نے مجھے مدعو کیا، اور بالآخر ۲۵ / اپریل ۲۰۰۰ء سے ۵ / مئی ۲۰۰۰ء تک میں نے آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ اس سفر کے بہت سے حالات امید ہے کہ قارئین کے بھی افادیت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ اس لئے اس کی تھوڑی سی رُوداد ان سطور میں پیش کررہا ہوں۔

سفر کے حالات سے پہلے آسٹریلیا کا مختصر تعارف اور اس میں مسلمانوں کی مختصر تاریخ پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا دنیا کا سب سے چھوٹا برِ اعظم ہے جو بحر ہند اور جنوبی بحرالکاہل کے درمیان واقع ہے، جغرافیہ کے ماہرین کہتے ہیں کہ اپنی چٹانوں کی عمر کے لحاظ سے یہ دنیا کا قدیم ترین برِ اعظم ہے، لیکن سب سے آخر میں دریافت ہوا۔ عام طور سے مشہور یہ ہے کہ برطانیہ کی نیوی کے کیپٹن جیمس کک نے سب سے پہلے ۱۷۷۰ء میں آسٹریلیا دریافت کیا، لیکن یہ بات صرف اس حد تک درست ہے کہ ایک متمدن ملک کی حیثیت سے آسٹریلیا کی تاریخ جیمس کک کے بحری سفروں کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے بھی اس برِ اعظم تک بہت سے لوگوں کی رسائی کے شواہد موجود ہیں۔ اور یہ بات تو واضح ہی ہے کہ جب برطانوی آبادکار آسٹریلیا پہنچے تو وہاں ایک ایسی قوم پہلے سے موجود تھی جو صدیوں سے یہاں رہتی چلی آرہی تھی، ان لوگوں کو ایبورجنیز (Aborginies) کہا جاتا ہے، یہ اگرچہ غیر متمدن قبائل کی صورت میں یہاں آباد تھے، لیکن ان کی تعداد اُس وقت کم از کم تین لاکھ تھی اور ان کی جسمانی ساخت اور دیگر تاریخی شواہد سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ انڈونیشیا اور جنوبی ایشیا کے دوسرے علاقوں سے سفر کرکے یہاں پہنچے تھے۔ جب برطانوی لوگوں نے آسٹریلیا میں آباد ہونا شروع کیا تو شروع میں ایبورجنیز نے ان کا بڑا خیر مقدم کیا، لیکن جب برطانوی آبادکاروں نے اپنی منصوبہ بندی کے تحت ان کی بستیاں اُجاڑنی شروع کیں تو انہوں نے مزاحمت کی، برطانوی نو واردوں نے انہیں بے دردی سے قتل کرنا شروع کیا اور ہزاروں مقامی باشندے اس قتل عام کی نذر ہوئے۔ کچھ عرصے انہوں نے برطانوی آبادکاروں کے خلاف چھاپہ مار جنگ جاری رکھی، لیکن بعد میں برطانوی طاقت کے مقابلے میں اُن کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ برطانوی فاتحین کے آگے ہتھیار ڈال کر اُن کی منصوبہ بندی میں مدغم ہوجائیں [1]۔

ہزارہا افراد کے قتل ہوجانے کے باوجود اب بھی ان کی خاصی بڑی تعداد آسٹریلیا میں آباد ہے۔

---

۱ تفصیل کیلئے دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۴۲۸ ج ۱۴/ ۱۹۸۸ء، پندرھواں ایڈیشن

لیکن عموماً یہ بڑے شہروں سے دور دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں، ان میں تعلیم بہت کم ہے اور یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کے علاقوں میں شراب بہت سستی کر دی گئی ہے، چنانچہ یہ شراب کے نشے میں مست رہتے ہیں اور اپنی موجودہ زندگی پر قانع ہو گئے ہیں، لطف کی بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ آسٹریلیا کے اصل باشندے ہیں، لیکن انہیں Aboriginal (غیر اصلی) کہا جاتا ہے اور آسٹریلیا کے جگمگاتے ہوئے شہروں سے ان کی بستیوں کا مقابلہ کیا جائے تو وہ اچھوت جیسے معلوم ہوتے ہیں۔

آسٹریلیا معدنی دولت سے مالا مال ہے اور اس میں سونے اور پیٹرول سے لے کر یورینیم تک ہر چیز کی کانیں موجود ہیں، اور ان قدرتی وسائل کے نتیجے میں آج سڈنی، میلبورن، برزبین، پرتھ اور کینبرا جیسے بڑے بڑے شہر اپنے حسن اور مادی ترقی میں امریکہ اور یورپ کو مات کر رہے ہیں لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس معدنی دولت کے حصول میں پاکستانی علاقے کے مسلمانوں کا بہت بڑا کردار ہے۔ اور آج آسٹریلیا جس معاشی ترقی سے جگمگا رہا ہے، اُس میں کراچی سے خیبر تک کے ہزاروں مسلمانوں کا خون پسینہ شامل ہے۔

آسٹریلیا میں مسلمان

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب برطانوی جہاز رانوں کو آسٹریلیا دریافت ہوا تو شروع شروع میں اس جزیرے کو انہی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا جن مقاصد کے لئے کبھی ''کالا پانی'' کو استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی برطانوی قانون کے تحت جو مجرم جلاوطنی کے مستحق ہوتے انہیں یہاں بھیج دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ انہی جلاوطن لوگوں کی نسلیں یہاں پروان چڑھنے لگیں، اور بعد میں بہت سے برطانوی باشندے اس برِاعظم کے حسن اور قدرتی وسائل سے مستفید ہونے کے لئے بھی یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ جب برطانوی آبادکاروں کی تعداد خاصی بڑھ گئی اور انہوں نے اس علاقے سے اپنا مستقبل وابستہ کر لیا تو انہیں مختلف خطوں کو آپس میں ملانے اور برِاعظم کے وسطی علاقوں میں معدنیات دریافت کرنے کے لئے سڑکیں تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وسطی علاقے بڑی حد تک چٹیل

صحراؤں پر مشتمل تھے۔ برطانوی آبادکاروں کو صحرائی علاقوں سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ انہوں نے گھوڑوں پر سوار ہوکر ان علاقوں میں کام کرنے کی کوشش کی، لیکن گھوڑے یہاں مکمل طور پر ناکام ہو گئے، اور انہیں یہ اندازہ ہوا کہ ان صحراؤں میں مواصلات اور نقل وحمل کے لئے اونٹ کے سوا کوئی چیز کارآمد نہیں ہوسکتی۔

آسٹریلیا میں اونٹ نایاب تھا، لہٰذا بعض مہم جو جہاز رانوں نے مختلف مقامات سے اونٹ خرید کر بحری جہازوں کے ذریعے آسٹریلیا پہنچانے کی کوشش کی، لیکن چونکہ انہیں اونٹوں کو سنبھالنے کا کچھ تجربہ نہ تھا، اس لئے کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ بیشتر اونٹ آسٹریلیا کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہی راستے میں مر گئے، اور اکا دکا اونٹ زندہ سلامت پہنچ سکے اور وہ بھی ناتجربہ کاری کی بنا پر اس مقصد کے لئے استعمال ہونے سے پہلے ہی بیماریوں کا شکار ہوکر ختم ہو گئے۔

اس مرحلے پر ان آبادکاروں کو احساس ہوا کہ اونٹوں سے ٹھیک ٹھیک استفادے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ اونٹوں کے رکھوالے بھی درآمد کئے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کچھ آسٹریلوی تاجر کراچی کی بندرگاہ پر اترے اور انہوں نے سندھ، مکران، بلوچستان اور صوبۂ سرحد کے اونٹ والوں سے معاہدہ کیا کہ وہ اپنے اپنے اونٹ لے کر آسٹریلیا جائیں اور وہاں صحراؤں کو چیرنے میں ان کی مدد کریں۔ اس معاہدے کے تحت مذکور صوبوں کے اونٹ والوں کی بڑی بڑی کھیپیں کراچی کی بندرگاہ سے مختلف مرحلوں میں سینکڑوں اونٹ لے کر آسٹریلیا پہنچ گئیں۔

یہ تجربہ کامیاب رہا۔ یہ اونٹ والے صحراؤں میں کام کرنے کا ہنر جانتے تھے، یہ بڑے مضبوط اور جفاکش لوگ تھے انہوں نے بہت تھوڑے معاوضے پر آسٹریلیا کی وہ خدمت انجام دینی شروع کر دی جو سالہا سال سے ناممکن نظر آ رہی تھی۔ انہی کی محنت اور جانفشانی کے نتیجے میں آسٹریلیا کے صحراؤں میں سڑکیں تعمیر ہوئیں، کانیں دریافت ہوئیں، ان کانوں سے نقل وحمل کا مرحلہ خیر وخوبی سے انجام پایا۔ آسٹریلیا اپنے ان قدرتی وسائل سے مستفید ہونے لگا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان قدرتی وسائل کے بل پر پورا ملک جگمگا اُٹھا۔

یہ اونٹ والے جنہوں نے آسٹریلیا میں یہ کارنامہ انجام دیا، اگر چہ زیادہ تر سندھ، مکران، بلوچستان اور صوبہء سرحد سے تعلق رکھتے تھے، لیکن نسلی اعتبار سے ان میں سے ایک بڑی تعداد افغان تھی، اس لئے آسٹریلیا میں ان سب کو افغان کہا جاتا تھا اور بعد میں اس نام میں تخفیف کر کے انہیں صرف ''گھان'' (Ghan) کہا جانے لگا۔ یہ لوگ مسلمان تھے اور انہوں نے اپنی بستیاں قائم کیں جنہیں یہاں Ghantowns یعنی افغان بستیاں کہا جاتا ہے۔

ان ''افغان'' اونٹ والوں کا پہلا کامیاب قافلہ کراچی کی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہو کر ۳۱ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو آسٹریلیا پہنچا تھا' اس قافلے میں ۱۲۴ر اونٹ اور کچھ دوسرے جانور تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے ۳۱ ''افغان'' آسٹریلیا لائے گئے تھے۔ یہ لوگ پکے مسلمان تھے اور انہوں نے اپنے برطانوی افسروں کی طرف سے انتہائی ہمت شکن حالات کے باوجود آسٹریلیا میں پہلی بار چھپروں کی شکل میں مسجدیں قائم کیں' رفتہ رفتہ بعض مسجدوں پر ٹین کی چھتیں ڈال دی گئیں' اس لئے انہیں Tin Mosque کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی بستیوں کے نام بھی اپنے اپنے قبائل کے لحاظ سے رکھے' مثلاً مری قبیلے کے لوگوں نے اپنی بستی کا نام مری رکھا اور ان کی بنائی ہوئی مسجد بھی مری کے نام سے مشہور ہوئی۔ جوں جوں صحراؤں میں کام بڑھتا گیا، اسی نسبت سے مزید ''افغان'' سندھ' بلوچستان' سرحد اور افغانستان سے بُلائے جاتے رہے' یہاں تک کہ آسٹریلیا میں ان کی بڑی تعداد آبسی اور شہری علاقے میں پہلی مسجد ۱۸۹۰ء کے قریب ایڈلیڈ (Adelaide) شہر میں قائم ہوئی اور دوسری مسجد ۱۹۰۵ء میں پرتھ میں تعمیر کی گئی۔[۱]

اگر چہ آسٹریلیا کی تعمیر و ترقی میں ان ''افغان'' اونٹ والوں کا بڑا کلیدی کردار ہے لیکن برطانوی آبادکاروں کا سلوک اُن کے ساتھ شروع ہی سے اچھا نہ تھا' ۱۹۲۰ء تک جب سڑکیں بن گئیں اور کانیں دریافت ہو گئیں تو اونٹوں کی ضرورت ختم ہو گئی اور ان ''افغانوں'' کے لئے دوسرے روزگار کے مواقع ختم کر کے انہیں آسٹریلیا میں رہائش دینے سے انکار کر دیا گیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ وطن واپس آ گئے اور جو باقی رہ گئے انہوں نے بڑی کسمپرسی کی حالت

The Oxford Cmpanion to Australion History, P.353, Oxford 1998

میں زندگی گذاری اور اب آسٹریلیا کی تاریخ میں ان لوگوں کے کردار کو تقریباً فراموش کر دیا گیا۔اب آسٹریلیا کے ایک محقق کرسٹین اسٹیونس (Christine Stevens) نے ۱۹۸۹ء میں ایک کتاب بڑی عرق ریزی سے مرتب کی ہے جس کا نام ہے۔ "Tin Mosques and Ghantowns" یعنی ''ٹین کی مسجدیں اور افغان بستیاں'' ۲۷۳صفحات کی اس ضخیم کتاب میں اُس نے ان اونٹ والوں کی تاریخ بڑی محنت سے جمع کی ہے۔کتاب کے مقدمے میں وہ لکھتا ہے:

> ''یہ افغان اوران کے جانوروں نے آسٹریلیا کے قلب تک رسائی اُس زمانے میں ممکن بنائی جب دوسرے لوگ اس کام میں اکثر ناکام رہے، اس کے باوجود ان کے خلاف خوف اور نفرت کا مظاہرہ کیا گیا اور ان کے منفرد معاشرے کو الگ تھلگ کر دیا گیا۔اُن کے مزاج وطبیعت اور ان کی ثقافت کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی گئی، بلکہ آج تک اکثر ان کے خلاف غلط فہمیاں سی پائی جاتی ہیں۔'' (ص ۱)

ان افغانوں کے بعد البانیہ، ترکی، لبنان، مصر، انڈونیشیا، ملائیشیا، ہندوستان، پاکستان سے مسلمانوں کی بڑی تعداد یہاں آ کر آباد ہوئی اور ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں یہاں ۶۷ مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلمان آباد تھے۔اس سرکاری مردم شماری کی رُو سے مسلمانوں کی تعداد ۱۴۷۵۰۷ تھی[1] آسٹریلیا کی کل آبادی اب دو کروڑ ہے اور غیر سرکاری اندازوں کے مطابق مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔آسٹریلیا اس لحاظ سے منفرد براعظم ہے کہ پورا براعظم ایک ہی ملک پر مشتمل ہے جس کا سرکاری نام ''کامن ویلتھ آف آسٹریلیا'' ہے۔یہ ایک وفاقی حکومت ہے جو چھ ریاستوں پر مشتمل ہے۔نیوساؤتھ ویلز جس کا دارالحکومت سڈنی ہے، وکٹوریہ جس کا مرکزی مقام میلبورن ہے۔کوئنز لینڈ جس کا مرکز برزبین ہے۔جنوبی آسٹریلیا جس کا دارالحکومت ایڈلیڈ ہے۔مغربی آسٹریلیا جس کا صدر مقام پرتھ ہے اور تسمانیہ جو انتہائی جنوب میں ایک مستقل جزیرہ ہے اور اس کا مرکزی مقام ہوبرٹ ہے

---

[1] The Oxford Cmpanion to Australion History, P.353

پورے آسٹریلیا کا دارالحکومت کینبرا ہے جو سڈنی سے جنوب میں واقع ہے اور اسلام آباد سے بہت مشابہ ہے۔

مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی "نیو ساؤتھ ویلز میں ہے" دوسرے نمبر پر وکٹوریہ میں، تیسرے نمبر پر کوئنز لینڈ میں اور شاید چوتھے نمبر پر مغربی آسٹریلیا میں۔

مجھے اپنے حالیہ سفر کے دوران کوئنز لینڈ کے شہر برزبین اور گولڈ کوسٹ وکٹوریہ کے شہر میلبورن اور نیو ساؤتھ ویلز کے شہر سڈنی اور سینٹرل کوسٹ کا دورہ کرنے کا موقع ملا اور یہی ریاستیں ملک میں مسلمانوں کے سب سے بڑے مراکز ہیں۔

آغاز سفر

منگل ۲۵ را پریل ۲۰۰۰ء کا دن گذارنے کے بعد رات کے تین بجنے والے تھے جب آسٹریلیا کے لئے میرا طویل سفر شروع ہوا۔ تھائی ایرویز کا طیارہ بنکاک کے لئے روانہ ہوا اور پانچ گھنٹے کی پرواز کے بعد جب تھائی لینڈ کے وقت کے مطابق صبح نو بجے کے قریب بنکاک کے ایئر پورٹ پر اُترا تو رات بھر کی بیداری اور اس سے پہلے دن کی سخت تھکن کی وجہ سے جسم چکنا چُور معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے آٹھ گھنٹے بنکاک میں گزارنے تھے اور شام پانچ بجے دوبارہ آسٹریلیا کی پرواز پر سوار ہونا تھا۔ میں بنکاک کئی مرتبہ آیا ہوں اور نہ جانے کیوں یہاں کا قیام مجھے ہمیشہ بھاری معلوم ہوا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ درمیانی آٹھ گھنٹے گزارنے کے لئے ایئر لائنز کی طرف سے اُس اماری ہوٹل میں ایک کمرہ بُک کر دیا گیا تھا جو ایئر پورٹ ہی کی حدود میں واقع ہے اس لئے مجھے شہر جانے کی مشقت اٹھانی نہیں پڑی اور جہاز سے اُتر کر چند ہی منٹ میں، میں ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ بنکاک میں پاکستانی سفارت خانے کے پروٹوکول آفیسر مسٹر شیخ کے سوا کسی کو میرے بنکاک آنے کی اطلاع نہیں تھی، جو مجھے ہوٹل تک پہنچا کر چلے گئے اور اس طرح مجھے ایسی یکسوئی کے ساتھ آرام کا موقع مل گیا جو اب زندگی میں کبھی کبھار ہی میسر آتی ہے۔ دوڈھائی گھنٹے کی نیند بھی ہو گئی اور لکھنے پڑھنے کا جو کام میرے ساتھ رہتا ہے، وہ بھی اس طرح کرنے کا موقع مل گیا کہ اس عرصے میں نہ کوئی ملاقاتی مخل ہوا نہ

کوئی ٹیلی فون۔ ایسی ذہنی یکسوئی چند گھنٹوں کے لئے بھی میسر آ جائے تو مجھے بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ یہ چند گھنٹے بڑی راحت کے گذرے اور شام تک بفضلہ تعالیٰ میں ایک طویل پرواز کے لئے تازہ دم ہو گیا۔

پانچ بجے شام برٹش ایئرویز کا جہاز سڈنی کے لئے روانہ ہوا۔ یہ نو گھنٹے کی پرواز تھی، معارف القرآن کا انگریزی ترجمہ میرے ساتھ تھا، اور میں اس پر نظر ثانی کرتا رہا۔ معارف القرآن انگریزی کی نظر ثانی کا بیشتر کام میں نے جہازوں میں اور مختلف سفروں کے دوران ہی کیا ہے اور اب بفضلہ تعالیٰ چار جلدوں کی تکمیل کے بعد پانچویں جلد پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اور الحمدللہ اس سفر کے دوران سورۂ یوسف اور سورۂ رعد کی تکمیل ہو گئی۔ رات بھر جہاز بحر ہند اور اس کے مختلف جزائر پر پرواز کرتا رہا۔ جب تک تھکن غالب نہیں آ گئی، میں کام کرتا رہا، پھر آخر کے دو تین گھنٹوں میں جب جہاز آسٹریلیا کے براعظم میں داخل ہو چکا تھا، میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو مشرق سے صبح طلوع ہو رہی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد فوراً جہاز نے اترنا شروع کر دیا۔ نیچے صبح صادق کے ابھرتے ہوئے اُجالے میں بحرالکاہل کے کنارے دور تک پھیلا ہوا سڈنی کا شہر بڑا خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جہاز سڈنی کے طویل و عریض ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ میری منزل ابھی اور آگے تھی مجھے یہاں سے دوسرے جہاز کے ذریعے ایک دوسرے شہر برزبین (Brisbane) جانا تھا۔ وہاں کی پرواز صرف ایک گھنٹے بعد تھی اور اس دوران مجھے امیگریشن، سامان کی وصولی اور کسٹم سے فارغ ہو کر دوسرے ٹرمینل سے مقامی پرواز پکڑنی تھی۔ ایئرپورٹ پر سڈنی میں پاکستان کے قونصل جنرل مسٹر باقر رضا استقبال کے لئے موجود تھے، انہیں وقت کی قلت کا احساس تھا، اس لئے انہوں نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا کہ امیگریشن اور کسٹم میں دیر نہ لگے، لیکن سامان آنے میں کچھ وقت لگ گیا اور جب ہم مقامی پروازوں کے کاؤنٹر پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اب متعلقہ پرواز تک پہنچنا ممکن نہیں۔ مگر بفضلہ تعالیٰ آدھے گھنٹے ہی کے بعد دوسری پرواز مل گئی۔ ایئرپورٹ کے باہر ڈاکٹر مولانا شبیر صاحب (جو ماشاءاللہ آسٹریلیا میں دینی خدمات کے لئے معروف ہیں) اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ منتظر تھے، اُن سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ہی برزبین میں میرے

میز بانوں کو پرواز بدلنے کی اطلاع دی۔ ایئر پورٹ پر ہی کچھ دیر ان حضرات سے مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ پرواز کا وقت ہو گیا۔

برزبین میں

یہاں سے برزبین کا راستہ ایک گھنٹے کا تھا، برزبین آسٹریلیا کی ریاست کوئنزلینڈ کا مرکزی شہر ہے اور مجھے اسی شہر کی اسلامک سوسائٹی نے دعوت دی تھی اور یہاں مجھے چار دن گذارنے تھے۔ برزبین بذات خود ایک انٹرنیشنل ایئر پورٹ ہے اور سیاحوں کے لئے خصوصی دلچسپیاں رکھنے کی وجہ سے یہاں ایشیا اور امریکہ سے براہ راست پروازیں بھی آتی ہیں۔ میں جہاز سے باہر آیا تو احباب کی ایک بڑی جماعت استقبال کے لئے منتظر تھی۔ جن میں گولڈ کوسٹ کے اسلامی سینٹر کے سربراہ مولانا اسد اللہ طارق، برزبین کے مولانا محمد عزیر، برزبین کی معروف بزنس فیملی کے الحاج حبیب دین کے نام اس وقت یاد ہیں برزبین آسٹریلیا کے چند حسین ترین شہروں میں سے ایک ہے اللہ تعالیٰ نے اسے قدرتی مناظر سے مالا مال کیا ہے۔ یہ آسٹریلیا کے شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے اور اسے چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں اور دلفریب وادیوں نے گھیرا ہوا ہے۔ آسٹریلیا میں اس وقت سردیوں کی آمد آمد تھی۔ درجہ حرارت ۱۸ ڈگری سینٹی گریڈ تھا اور فضا میں سمائی ہوئی خوشگوار خنکی نے ان مناظر کو مزید نشاط انگیز بنا دیا تھا۔ شہر سے متصل ایک خوبصورت رہائشی علاقہ ہالینڈ پارک کہلاتا ہے، یہاں ایک سرسبز ٹیلے پر بڑی خوشنما مسجد بنی ہوئی ہے جو اس علاقے کے مسلمانوں کا دینی اور سماجی مرکز ہے۔ میرا قیام اسی مسجد کے سامنے ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں ہوا جو اصلاً مولانا عزیر صاحب کا مکان ہے، لیکن میرے قیام کے دوران اسے خاص طور پر میرے اور مجھ سے ملنے والوں کے لئے مخصوص کر لیا گیا۔

مولانا عزیر صاحب ایک نوجوان عالم ہیں جو برطانیہ میں پیدا ہوئے اور انہوں نے پاکستان میں دینی تعلیم حاصل کی، ہالینڈ پارک کی مسجد اور اسلامی مرکز میں وہ قابل تعریف دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، انگریزی زبان اور لب ولہجہ پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے اور وہ

مسلمان نوجوانوں کو متاثر کرنے کی ماشاء اللہ بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں ان کی باغ و بہار طبیعت نے نوجوانوں کو اپنے آپ سے بے تکلف کر کے انہیں بہت مانوس کیا ہوا ہے۔ میرے آسٹریلیا کے قیام میں مسلسل وہ میرے ساتھ رہے اور میزبانی اور مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔

مکان تک پہنچتے پہنچتے دس بج چکے تھے۔ باہر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش نے خوابگاہ کی کھڑکی سے نظر آنے والے شاداب کوہساروں کا منظر اور زیادہ حسین بنا دیا تھا، ایک طویل سفر کے بعد دو تین گھنٹے کی پُرسکون نیند نے طبیعت میں نشاط پیدا کر دیا۔ ظہر سے عصر تک بھی کوئی مصروفیت نہ تھی۔ البتہ عصر کے بعد سے ملاقات کے لئے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مغرب کے بعد میزبانوں نے معززین شہر کے لئے عشائیہ کا اہتمام کیا تھا احباب دور دور سے بڑی محبت سے ملنے آئے تھے۔

عشائیہ کے بعد یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور مرکزی مسجد کوروبی میں عشاء کی نماز ادا کرنی تھی اور نماز کے بعد میری تقریر کا اعلان ہو چکا تھا ہم عشاء کے وقت وہاں پہنچے تو مسجد کا پورا احاطہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ سینکڑوں کیلومیٹر کا سفر طے کر کے اس اجتماع میں شرکت کے لئے پہنچے تھے۔ یہاں تک کہ نماز کے لئے مسجد تنگ پڑ گئی اور بہت سے حضرات نے باہر نماز ادا کی۔ مسجد کے امام صاحب نے بتایا کہ اس مسجد میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا مجمع دیکھنے میں نہیں آیا۔ آسٹریلیا میں چونکہ مختلف قومیتوں کے مسلمان آباد ہیں جن میں برصغیر کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے عرب مسلمان، صومالیہ، جنوبی افریقہ، الجزائر، انڈونیشیا، ملائیشیا، فیجی آئی لینڈ، ترکی وغیرہ شامل ہیں، اس لئے ایسی مشترکہ زبان جسے سب سمجھ سکیں، انگریزی کے سوا کوئی اور نہیں چنانچہ میرے میزبان مجھے پہلے ہی یہ بتا چکے تھے کہ یہاں تمام تقریریں انگریزی ہی میں ہونی ضروری ہیں۔

دوسری طرف ان مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے فقہی مسلک بھی مختلف ہیں اور دین کا پورا علم نہ ہونے کی وجہ سے ان حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال بڑے خلجان کا سبب بنتا رہتا ہے کہ مختلف فقہی مذاہب میں اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ اور اس معاملے میں عام مسلمانوں کے لئے راہ عمل کیا ہے؟ پچھلے دنوں بعض حضرات نے اس معاملے میں مزید ذہنی خلفشار یہ کہہ کر

پیدا کیا کہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مذاہب سب بدعت اور شرک ہیں لہٰذا ان میں سے کسی مسلک کی پیروی گمراہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دیارِ غیر میں مسلمانوں کو جن بنیادی مسائل کا سامنا ہے ان کے بجائے فروعی اختلافات کو ہوا دینے سے خواہ مخواہ مسلمانوں کے درمیان یکجہتی کے بجائے بعد پیدا ہونے لگا۔

حالات کے اس پس منظر میں میرے میزبانوں نے میری آج کی تقریر کا عنوان ''اسلامی فقہ اور فقہی مذاہب کی حقیقت'' تجویز کیا تھا تاکہ فقہی مذاہب کی حقیقت واضح کر کے لوگوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دی جائے۔ موضوع بڑا علمی اور تفصیل طلب تھا اور اسے ایک نشست میں سمیٹنا مشکل نظر آ رہا تھا مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس موضوع پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مفصل خطاب ہوا۔ میں نے مختصراً ''فقہ'' کی قرآنی بنیادوں کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ دین کے بیشتر بنیادی امور مثلاً توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد، ارکان اسلام، جھوٹ، غیبت، ظلم، بدکاری، دھوکہ دہی، سود، قمار، شراب نوشی وغیرہ کی حرمت وغیرہ ایسے معاملات ہیں جن میں قرآن وسنت کے احکام بالکل واضح ہیں اور ان کے معاملے میں کبھی فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ چنانچہ ان معاملات میں کسی علیحدہ فقہی مسلک کی نہ کوئی ضرورت ہوئی نہ اس بارے میں کوئی فقہی مسلک پیدا ہوا۔ لیکن قرآن وسنت کے بہت سے فروعی احکام ایسے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت بالغہ کے تحت تھوڑا سا اجمال چھوڑا ہے جس کی وجہ سے ان کی ایک سے زائد تشریحات ممکن ہیں۔ ان مختلف تشریحات میں سے کسی ایک تشریح کو متعین کرنے کے لئے قرآن وسنت کے وسیع و عمیق علم کی ضرورت ہے اور خود قرآن کریم نے آیت کریمہ "فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین'' کے ذریعے یہ اصول واضح فرمادیا ہے کہ ایسا وسیع و عمیق علم حاصل کرنا نہ ہر ایک کے لئے ممکن ہے نہ ضروری۔ اس کے بجائے قرآن کریم کا حکم یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسا علم حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کریں اور پھر اپنے اس علم کے نتائج دوسروں تک پہنچائیں۔ چنانچہ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے فقہاء امت نے اپنی زندگیاں اس کام کے لئے وقف کیں اور ایسے معاملات میں قرآن وسنت کی صحیح مراد متعین کرنے کی

کوشش فرمائی۔اسی کوشش کا نام اجتہاد ہے۔

دوسری طرف چونکہ ان احکام کے معاملے میں قرآن وسنت کی ایک سے زیادہ تشریحات (Interpretations) ممکن تھیں اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی سوچ ایک جیسی نہیں رکھی اس لئے قدرتی طور پر ان حضرات کے اجتہاد کے نتائج میں اختلاف پیدا ہوا اور اس سے مختلف فقہی مسلک وجود میں آئے لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک نے پوری دیانت داری اور محنت واخلاص کے ساتھ قرآن وسنت کی صحیح مراد تک پہنچنے کی کوشش کی، اس لئے ان میں سے کسی کو بھی بالکل غلط یا باطل نہیں کہا جاسکتا۔اس کی مثال یہ ہے کہ غزوہ احزاب کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو قریظہ کے یہودیوں پر حملہ کرنے کا حکم ہوا تو آپؐ نے بعض صحابہؓ کو بنو قریظہ کے علاقے کے لئے روانہ فرمایا اور انہیں تاکید فرمائی کہ عصر کی نماز وہیں جا کر پڑھیں۔صحابہ کرامؓ روانہ ہوئے، لیکن عصر کا وقت راستے ہی میں ہو گیا، اب بعض صحابہ کرامؓ کا خیال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عصر کی نماز منزل پر پہنچ کر پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے، اس لئے نماز وہیں چل کر پڑھنی چاہیے چنانچہ ان حضرات نے راستے میں نماز نہ پڑھی۔لیکن دوسرے حضرات کا موقف یہ تھا کہ آپؐ کا اصل مقصد وہاں جلد سے جلد پہنچنا تھا، یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر عصر کا وقت کسی وجہ سے راستے میں آ جائے تو راستے میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا، چنانچہ ان حضرات نے راستے ہی میں نماز پڑھ لی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں حضرات کے موقف کا علم ہوا تو آپؐ نے دونوں میں سے کسی پر بھی ملامت نہیں فرمائی۔اس سے صاف واضح ہے کہ جن مسائل میں اجتہاد کی گنجائش ہے، ان میں کسی ایک مؤقف کو سو فیصد صحیح اور دوسرے کو سو فیصد غلط نہیں کہہ سکتے، البتہ شرط یہ ہے کہ اجتہاد کرنے والا وسیع وعمیق علم کی وہ شرائط پوری کرتا ہو جو قرآن وسنت سے احکام کے استنباط کے لئے ضروری ہیں اور وہ محض اس بنا پر وہ موقف اختیار نہ کرے کہ وہ اس کی خواہشات کے زیادہ مطابق ہے یا اس میں آسانی زیادہ ہے۔بلکہ قرآن وسنت ہی کے دلائل کی بنیاد پر جو موقف اسے زیادہ مضبوط نظر آئے، اسے خلوص کے ساتھ اختیار کرے۔

حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلیؒ مسلک اسی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی غلط یا باطل نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے درمیان اختلاف حق و باطل کا نہیں ہے، بلکہ راجح اور مرجوح کا ہے۔ اب جو شخص نہ عربی زبان جانتا ہے، نہ قرآن وسنت کے متعلق علوم سے کما حقہٗ واقف ہے، اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ جس مجتہد کو زیادہ عالم سمجھے، اس کی رائے پر اعتماد کرکے اس پر عمل کرے، یہ درحقیقت اس مجتہد امام کی اتباع نہیں بلکہ قرآن وسنت ہی کی اتباع ہے، مگر قرآن وسنت کو سمجھنے میں اس کی مدد لی گئی ہے۔ پھر چونکہ اصل مقصد قرآن وسنت پر عمل کرنا ہے۔ اپنی خواہشات پر نہیں، اس لئے یہ طرز عمل بالکل ناجائز ہے کہ جس مسئلے میں جس کسی امام کا مسلک اپنی خواہش کے مطابق نظر آیا، اس پر عمل کرلیا، کیونکہ کسی بھی امام نے اپنا مسلک اس بنیاد پر متعین نہیں کیا کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق یا زیادہ آسان ہے، بلکہ دلائل کی بنیاد پر متعین کیا ہے لہٰذا عافیت کا راستہ یہی ہے کہ جس امام کو انسان زیادہ بڑا عالم سمجھے یا اس سے استفادہ آسان ہو، اس کی تشریحات پر اعتماد کرتے ہوئے قرآن وسنت کے فروعی احکام پر عمل کرے۔ ہاں اگر کوئی شخص اتنا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو کہ وہ اپنے اجتہاد سے مختلف مذاہب میں محاکمہ کر سکے تو وہ جس مذہب کو دلائل سے زیادہ مضبوط سمجھے، اسے اختیار کر سکتا ہے، لیکن یہ ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ احقر نے یہ بھی گذارش کی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو بڑے اہم اجتماعی مسائل درپیش ہیں جنہیں حل کرنے کے لئے سب کو یکجان ہو کر کام کرنا چاہئے اور ان فروعی اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے اس اصول پر عمل کرنا چاہیے کہ ''اپنے مسلک کو نہ چھوڑو اور دوسرے کے مسلک کو نہ چھیڑو۔'' اس کے سوا مسلمانوں کی صفوں میں وحدت قائم رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اگر اس دیارِ غیر میں بھی وہ اختلاف و انتشار درآمد کیا گیا جو ہماری شامتِ اعمال سے مسلمان ملکوں میں پایا جاتا ہے تو یہاں مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کا کوئی راستہ نہ رہیگا۔

مذکورہ بالا نکات پر الحمدللہ خاصی تفصیل سے گفتگو کی گئی، بعد میں دیر تک حاضرین کی طرف سے سوال وجواب کا سلسلہ بھی رہا اور بفضلہٖ تعالیٰ شرکاء مجلس نے کھلے دل سے اعتراف

فرمایا کہ اس تشریح وتوضیح سے ان کے دل سے شبہات کے بہت سے کانٹے نکل گئے۔

دو ڈھائی گھنٹے کی اس طویل ذہنی کاوش کے بعد جب قیام گاہ جانے کا وقت آیا تو ہمارے میزبان جناب الحاج حبیب دین صاحب نے پیشکش کی کہ تھوڑی سی تفریح بھی ہو جائے اور برزبین شہر کا ایک دورہ کرلیا جائے۔ جناب حبیب دین صاحب کی فیملی آسٹریلیا کی مشہور ومعروف فیملی ہے جو ''دین برادران'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے، ان کے آباء واجداد کا تعلق اصلاً مدراس سے تھا اور وہ آسٹریلیا میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ یہاں انہوں نے مختلف تجارتوں میں نام پیدا کیا۔ حبیب دین صاحب کا بنیادی کام تعمیراتی ٹھیکہ داری ہے اور اس لحاظ سے ان کا نام گینز بک آف ریکارڈ میں درج ہے کہ انہوں نے صرف ۵۰ سیکنڈ میں ایک بڑی عمارت کو گرا کر زمین کے برابر کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے ساتھ دین کی تڑپ بھی عطا فرمائی ہے اور آسٹریلیا میں مختلف مساجد، مدارس اور اسکولوں کے قیام میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے برزبین کے مرکزی علاقوں کی سیر کراتے رہے۔ برزبین یوں بھی بڑا خوبصورت شہر ہے جس میں قدرتی حسن کے ساتھ تمدنی حسن بھی جمع ہو گیا ہے، لیکن رات کے وقت واقعۃً اس کا منظر قابلِ دید تھا۔ بحرالکاہل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں شہر کے درمیان دریا کی شکل میں گھس آئی ہیں جس کے دونوں کناروں پر فلک بوس عمارتیں جگمگ کر رہی ہیں اور دونوں کناروں کو ملانے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلوں سے پُل بنے ہوئے ہیں، ہر پُل کا ڈیزائن مختلف ہے اور اس نے ماحول کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

شہر کے ایک طائرانہ دورے کے بعد حبیب دین صاحب ہمیں ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جسے ماؤنٹ گریفٹ (Mount Graffet) کہتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ جب مسلمان آسٹریلیا میں آئے تو انہوں نے بہت سے مقامات کا نام عربی روایت کے مطابق رکھا تھا۔ اس پہاڑ کا نام بھی انہوں نے ''عرفہ'' رکھا تھا جسے انگریزی میں بگاڑ کر Graffet بنا دیا گیا۔ واللہ اعلم۔ اس پہاڑ کی بلندی سے پورا شہر نظروں کے سامنے تھا اور زمین پر پھیلی ہوئی روشنیاں زمین کو تاروں بھرے آسمان کی شباہت عطا کر رہی تھیں۔

اگلے دن (۲۸؍اپریل) کو جمعہ تھا۔ آسٹریلیا میں برصغیر کے باشندوں نے مختلف مقامات پر اپنی کمیونٹی کے لئے پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن قائم کئے ہوئے ہیں جو بڑی دلچسپی سے سُنے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ریڈیو اسٹیشن ایک گھنٹے کے لئے اسلام کی تعلیمات پر مبنی پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔ اس پروگرام کی مالی کفالت بھی دین فیملی کرتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ اردو پروگرام صبح چھ بجے نشر ہوتا ہے۔ جمعہ کی صبح اس ریڈیو پر میری تقریر اور انٹرویو کا اعلان پہلے سے ہو رہا تھا، چنانچہ فجر کے فوراً بعد اس ریڈیو اسٹیشن پر جانا ہوا اور وہاں تقریباً نصف گھنٹہ میری تقریر اردو میں ہوئی جو اس سفر کے دوران میری واحد اردو تقریر تھی۔ بعد میں پندرہ منٹ کا ایک انٹرویو بھی نشر کیا گیا۔ مجھے شبہ تھا کہ لوگ صبح کو اتنے سویرے ریڈیو کہاں سنتے ہوں گے، لیکن بعد میں ملنے والے لوگوں نے ریڈیو کی اس تقریر کا حوالہ دیا جس سے معلوم ہوا کہ یہ پروگرام وسیع پیمانے پر مقبول ہے۔

اسی روز مجھے جمعہ کی نماز ہالینڈ پارک کی مسجد میں پڑھانی تھی، ان ملکوں میں چونکہ جمعہ کے دن چھٹی نہیں ہوتی، اس لئے یہاں نماز سے پہلے کی تقریر مختصر ہوتی ہے تاکہ لوگ جلد اپنے اپنے کام پر واپس جا سکیں۔ چنانچہ نماز سے پہلے بیس منٹ کے قریب میری تقریر ہوئی، مسجد کی دونوں منزلیں بھری ہوئی تھیں اور مختلف قومیتوں کے مسلمانوں کا شیر وشکر ہو کر نماز ادا کرنا اور بعد میں محبت سے ملنا بڑا ایمان افروز منظر ہوتا ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

جمعہ کی تقریر تو مختصر تھی، لیکن اسی رات عشاء کے بعد ہالینڈ پارک ہی کی مسجد میں میرے مفصل خطاب کا اعلان ہو چکا تھا۔ چنانچہ عشاء کے بعد مسلمانوں کے عمومی مسائل پر تقریباً ایک گھنٹہ خطاب ہوا اور اس کے بعد تقریباً اتنی ہی دیر سوال وجواب کا سلسلہ رہا۔ آج کے اجتماع کے بارے میں بھی مقامی حضرات کا تاثر یہ تھا کہ اس سے پہلے کبھی رات کے وقت اتنا بڑا اجتماع اس مسجد میں نہیں ہوا۔ ایسے لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے جو سو کلومیٹر سے بھی زائد مسافت طے کر کے پہنچے تھے۔ ان میں ہر شعبۂ زندگی کے لوگ تھے اور ان کی ادا ادا سے یہ پیاس نمایاں تھی کہ وہ دین کے بارے میں مستند معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں مسلمانوں کو اپنے دین کے مطابق زندگی گذارنے میں طرح طرح کی مشکلات اور مسائل

کا سامنا ہے۔ لیکن الحمدللہ ان کا دینی شعور اتنا مضبوط ہے کہ وہ خاصی باریک بینی سے اپنے اسلامی تشخص کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ اُن کے صرف عمر رسیدہ افراد ہی سے نہیں، بلکہ نوعمر نوجوانوں سے بھی ایسے ایسے سوالات سننے میں آتے ہیں جو ہمیں اپنے ملک کے نوجوانوں سے سننے میں نہیں آتے اور اُن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کے بارے میں کتنے فکرمند ہیں۔ اجتماع کے دوران عمومی سوالات کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے انفرادی طور پر الگ وقت مانگا اور اپنے انفرادی مسائل میں مشورہ طلب کیا ان میں بہت سے حضرات تو وہ تھے جو میری تحریروں اور تصانیف کی بنا پر مجھ سے پہلے سے جانتے تھے، برصغیر کے مسلمانوں کے پاس میری کتابیں پہنچی ہوئی تھیں اور عرب حضرات میری عربی اور انگریزی کتابوں کے واسطے سے مجھے جانتے تھے، ان کے علاوہ بہت سے حضرات وہ تھے جو پہلی بار مجھ سے متعارف ہوئے، لیکن جس خلوص ومحبت اور گرمجوشی کا مظاہرہ ان حضرات نے کیا، اس کا نقش بھلایا نہیں جا سکتا۔

ہفتے کی صبح نو بجے کوئنز لینڈ یونیورسٹی میں میری تقریر کا پروگرام تھا۔ کوئنز لینڈ آسٹریلیا کی ایک ریاست ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے جس میں پندرہ ہزار طلباء زیرِ تعلیم ہیں۔ یہاں کے مسلمان طلبہ نے یونیورسٹی کے ہال میں میری تقریر کا اہتمام کیا تھا۔ طلبہ اور طالبات کی نشستیں پردے کے اہتمام کے ساتھ الگ رکھی گئی تھیں۔ یہاں میرا مفصل خطاب ہوا جس میں میں نے علم کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے حصولِ علم کے لئے انسان کو جو مختلف وسائل وذرائع عطا فرمائے ہیں اُن کی مختلف حدودِ کار کی تفصیل بیان کی اور علم کے بارے میں اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کا بنیادی اختلاف واضح کر کے مسلمان طلبہ کی ذمہ داریوں پر گفتگو کی۔ اس تقریر کا اعلان چونکہ پہلے سے ہو چکا تھا، اس لئے طلبہ کے علاوہ بعض اساتذہ اور شہر کے دوسرے حضرات بھی سامعین میں موجود تھے۔

گولڈ کوسٹ میں

یونیورسٹی کے پروگرام کے بعد مجھے اُسی روز گولڈ کوسٹ جانا تھا جو ریاست کوئنز لینڈ کا ایک ساحلی شہر ہے جو برزبین سے تقریباً ۷۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور سیاحت کا بہت

بڑا مرکز ہے۔ برزبین سے نکل کر ہمیں یہاں پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا۔ درمیانی راستہ سرسبز وشاداب وادیوں، ساحلی علاقوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں پر مشتمل تھا۔ ظہر کی نماز ہم نے گولڈ کوسٹ پہنچ کر ادا کی، یہاں بفضلہ تعالیٰ ایک خوبصورت مسجد علاقے کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ مسجد کا اپنا ہال بہت وسیع ہے اور اس کے نیچے مسلمانوں کے عمومی اجتماعات کے لئے بڑا کشادہ ہال ہے، مسجد کے ساتھ لائبریری اور مسلمانوں کے بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ایک اسکول بھی ہے۔ اس اسلامی مرکز کے دینی سربراہ مولانا اسد اللہ طارق صاحب ہیں جو ماشاء اللہ وسیع المطالعہ عالم ہیں۔ انہیں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے اور انہوں نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے تخصص فی الدعوۃ والارشاد کا کورس مکمل کر کے پہلے فیجی آئی لینڈ اور نیوزی لینڈ میں خدمات انجام دیں اور اب آسٹریلیا کی ریاست کوئنز لینڈ میں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، انگریزی پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے اور ان کی تقریریں یہاں بڑی مقبول ہیں۔ انہوں نے عیسائیت کا بھی اچھا مطالعہ کر کے بہت سے عیسائی مردوں اور عورتوں کو مشرف بہ اسلام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کے اجتماعی مسائل میں انہیں علاقے کی مسلم آبادی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور وہ بفضلہ تعالیٰ اپنی اس ذمہ داری کو دانشمندی سے نباہتے ہیں۔

ایک مرتبہ کچھ نوجوان کسی جرم میں پکڑے گئے جن میں ایک نوجوان مسلمان بھی تھا۔ اور باقی غیر مسلم تھے غیر مسلموں کے وکیل نے متعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ اصل مجرم مسلمان ہے اور اسی نے دوسرے نوجوانوں کو جرم پر اُکسایا ہے اور دلیل یہ دی کہ مسلمان زندگی کے مختلف شعبوں میں تشدد پسندی کے عادی ہیں، جج نے غیر مسلم نوجوانوں کو بری کر کے صرف مسلمان لڑکے کو سزایاب کیا اور فیصلے میں یہ بات لکھ دی کہ مسلمان تشدد پسند ہوتے ہیں۔ اس موقع پر مولانا طارق نے جج کے اس غیر منصفانہ ریمارک کے خلاف آواز اُٹھائی، اخبارات میں ان کے انٹرویو شائع ہوئے، بات بہت آگے بڑھ گئی اور بالآخر جج کو اپنے ان ریمارکس پر واضح الفاظ میں معذرت کرنی پڑی جو اخبارات میں شائع ہوئی۔

یہاں اس بات کا بھی رواج ہے کہ عیسائی مشنری اسکول کے طلبہ کو مساجد کا دورہ کرایا جاتا ہے۔اس موقع پر ان کے اساتذہ اپنے طلبہ کو اسلام کے بارے میں وہی گھسے پٹے اور سکہ بند اعتراضات سکھا کر بھیجتے ہیں جو عیسائیوں نے سالہا سال سے اسلام کے بارے میں مشہور کرر کھے ہیں، مثلاً یہ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اسلام میں عورتوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ایک مرتبہ ایک ایسے ہی دورے میں مولانا طارق نے طلبہ کے سوالات کے جواب اس موثر انداز میں دیئے کہ اُن کے استاد نے کھڑے ہوکر برملا اعتراف کیا کہ ہمارے سالہا سال کے تاثر کے خلاف آج پہلی بار یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلام پر یہ اعتراضات غیر منصفانہ اور محض پروپیگنڈے کی پیداوار ہیں۔

گولڈ کوسٹ پہنچنے کے بعد اُس روز کوئی اجتماعی پروگرام نہیں تھا، البتہ دوپہر اور رات کے کھانے پر علاقے کے معزز افراد سے ملاقاتیں ہوئیں اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہاں کے مسلمان جو مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں، شیر وشکر ہوکر اس اسلامی مرکز کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔

عصر اور مغرب کے درمیان وقت خالی تھا اور ہم سیر کے لئے ساحلی علاقے کی طرف جانکلے۔گولڈ کوسٹ دنیا کے خوبصورت ترین ساحلوں میں شمار ہوتا ہے۔بحرالکاہل کے اس ساحل۔کے ساتھ ساتھ ستر کیلومیٹر تک ایک حسین ساحلی سڑک چلی گئی ہے جس میں سمندر کے کنارے مختلف تفریحی مقامات بنے ہوئے ہیں اور سڑک کے پار سیاحوں کے قیام کے لئے میلوں تک ہوٹلوں اور اپارٹمنٹس کا ایک طویل سلسلہ ہے۔دنیا بھر کے سیاح یہاں کے ساحلی حسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے ہیں۔اس وقت چونکہ سردی کا موسم تھا، اس لئے یہ ساحل اُس گندگی اور بدمذاقی سے بھی خالی تھے جو عموماً مغربیت زدہ ساحلوں کو ایک شریف آدمی کے لئے ناقابلِ برداشت بنادیتے ہیں۔سرسبز پہاڑیوں، شاداب میدانوں اور اُن میں اُگے ہوئے رنگا رنگ درختوں کے سامنے بحرالکاہل کی نیلگوں موجیں قدرت کی صناعی کا ناقابل فراموش منظر پیش کررہی تھیں۔مسلسل ذہنی مصروفیت کے درمیان فراغت کے یہ لمحات

بڑے نشاط انگیز ثابت ہوئے اور انہوں نے از سرِ نو تازہ دم کر دیا۔

اگلی صبح اتوار تھا اور گیارہ بجے گولڈ کوسٹ کی جامع مسجد میں میرے خطاب کا اعلان ہو چکا تھا۔چھٹی کا دن تھا اور لوگ اس پروگرام میں شرکت کے لئے اطراف و اکناف سے جمع ہو گئے تھے۔بعض حضرات سو سے زیادہ میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچے تھے۔تقریباً سوا گھنٹے کی تقریر کے بعد ظہر کی نماز تک سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا اور نماز ظہر کے بعد انفرادی ملاقاتوں، کا جن میں لوگوں نے اپنے نجی نوعیت کے مسائل میں مشورے کیے اور ان سب کے مجموعے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہر شعبۂ زندگی کے مسلمان اپنے اسلامی تشخص کو محفوظ رکھنے اور دینی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرنے کے لئے کتنے فکر مند ہیں۔

عصر کے بعد ہم واپس برزبین کے لئے روانہ ہوئے اور مغرب کی نماز وہیں پہنچ کر ادا کی۔اگرچہ برزبین شہر میں بیس سے زیادہ مسجدیں ہیں، لیکن اب وسط شہر کے ایک محلے دارا میں ایک نئی مسجد تعمیر ہو رہی ہے جو شہر کی سب سے بڑی مسجد ہو گی۔عشاء کے بعد ایک قریبی ہال میں اس مسجد کی تعمیر کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک اجتماع منعقد کیا گیا تھا جس میں بااثر حضرات دلچسپی سے شریک ہوئے، یہاں بھی میرا مختصر خطاب ہوا اور اسی مجلس میں لوگوں نے مسجد کی چھت ڈالنے کے لئے چالیس ہزار ڈالر مسجد کے فنڈ میں جمع کرائے۔

آسٹریلیا میں مسلمان اس لحاظ سے بڑے منظم ہیں کہ ہر مسجد کے ساتھ ایک تنظیم ''اسلامی سوسائٹی'' کے نام سے قائم ہے۔پھر ایک ریاست کی تمام اسلامی سوسائٹیوں پر مشتمل ایک اسلامی کونسل صوبائی سطح پر کام کرتی ہے ان صوبائی اسلامی کونسلوں نے وفاقی سطح پر ایک فیڈریشن بنائی ہوئی ہے جس کا نام آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسلز (AFIC) ہے۔اس طرح نچلی سطح سے ملکی سطح تک تمام مسلمان باہم مربوط اور منظم ہیں۔دارا مسجد کے اس اجتماع میں AFIC کے چیئرمین، کوئنز لینڈ اسلامی کونسل کے چیئرمین دارا اسلامک سوسائٹی کے چیئرمین اور ممبران موجود تھے اور سب نے تعمیر مسجد کے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

میلبورن میں

یہ برزبین میں میرے قیام کی آخری رات تھی اور اگلی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہمیں ملبورن کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اس سفر میں گولڈ کوسٹ کے مولانا طارق صاحب اور ہالینڈ پارک کے مولانا عزیر صاحب بھی میرے ساتھ تھے برزبین سے میلبورن تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر جنوب میں واقع ہے اور جنوب مشرق میں اس برِاعظم کا تقریباً آخری کنارہ ہے۔ یہ ریاست وکٹوریہ کا دارالحکومت ہے اور سڈنی کے بعد آسٹریلیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ مسلمان بھی سڈنی کے بعد اس شہر میں سب سے زیادہ آباد ہیں۔ یہاں بھی تقریباً چالیس مسجدیں ہیں، اور مسلمانوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے اپنے کئی تعلیمی ادارے قائم کئے ہوئے ہیں۔ ابھی دو سال سے کراچی کے مدرسہ عائشہ کی انتظامیہ نے یہاں ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے جو دارالعلوم کالج فاکنر کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے سربراہ ایک دردمند عرب مسلمان ہیں جو آسٹریلیا میں تبلیغی جماعت کے سربراہ بھی ہیں۔ دارالعلوم کراچی کے فاضل درجۂ تخصص مولانا نجیب صاحب اس ادارے کے نائب مدیر اور مفتی کی حیثیت میں کام کررہے ہیں۔ دوسرے نائب مدیر مولانا مصطفیٰ صاحب ہیں جو ترکی کے باشندے ہیں اور انہوں نے بھی ہمارے دارالعلوم میں تعلیم پائی ہے۔ تیسرے نائب مدیر مولانا وسیم صاحب ہیں یہ بھی نوجوان فاضل عالم دین ہیں۔ یہ سب حضرات ایئرپورٹ پر استقبال کے لئے موجود تھے۔

ایئرپورٹ سے ہم دارالعلوم کالج گئے جو میلبورن کے ایک محلے فاکنر میں واقع ہے۔ وہیں ایک مکان میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ یہ دارالعلوم کالج ابھی ڈیڑھ دو سال پہلے قائم ہوا ہے۔ اب بفضلہ تعالیٰ اسے ایک وسیع عمارت مل گئی ہے جو پہلے بھی ایک اسکول کی عمارت تھی۔ اس لئے تعلیمی ادارے کی ضروریات کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اسی عمارت کے ایک ہال کو عارضی طور پر نماز کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، اور اس کے باہر ایک وسیع قطعۂ زمین خالی ہے جس پر مسجد تعمیر کرنے کا پروگرام ہے۔ اس وقت اس دارالعلوم کالج میں نویں گریڈ تک کے طلبہ وطالبات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ نویں گریڈ تک کا مکمل سرکاری نصاب پڑھانے کے

ساتھ ساتھ طلبہ کو دینی تعلیم سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے، اور ان کی دینی تربیت کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کے یونیفارم سے لے کر نظمِ اوقات تک ہر چیز میں دینی رنگ نمایاں ہے، اور اس وقت اس کالج میں تین سو طلبہ اور طالبات زیرِ تعلیم ہیں، اس سال سے اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے درسِ نظامی کا آغاز بھی کیا گیا ہے۔ شہر کے مسلمان بڑے ذوق وشوق سے اپنے بچوں کو اس تعلیمی ادارے میں داخل کراتے ہیں، اور صبح کے وقت بچوں کو پہنچانے اور شام کے وقت واپس لیجانے کے لئے کاروں کی لمبی قطاریں لگی رہتی ہیں، ان میں سے بعض والدین دو دو گھنٹے کی مسافت سے بچوں کو یہاں لاتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے بچوں کے داخلے کی درخواستیں اس لئے منظور نہیں کی جاسکیں کہ فی الحال تین سو سے زائد بچوں کی گنجائش نہیں ہے۔

نمازِ ظہر کے بعد کالج کا معائنہ کرایا گیا۔ الحمدللہ ادارے کا نظم وضبط، حسنِ انتظام، معیارِ تعلیم وتربیت اور فضا پر مجموعی طور سے دینی رنگ کی چھاپ دیکھ کر دل بہت مسرور ہوا۔ ماشاءاللہ کالج کی لائبریری بھی یہاں کے لحاظ سے خاصی قیمتی ہے، اور اس میں عربی، انگریزی اور اردو میں معیاری دینی کتب کا قابلِ لحاظ ذخیرہ موجود ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ معائنے کے بعد یہاں کے اساتذہ اور معلمات سے احقر کا خطاب تھا، کالج کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اساتذہ ومعلمات بھی مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے یہاں بھی ایسی مشترک زبان جسے سب سمجھ سکیں۔ انگریزی ہی ہوسکتی ہے، چنانچہ ''اساتذہ کے فرائض'' کے موضوع پر یہ خطاب بھی انگریزی ہی میں ہوا۔

میں کسی بھی ملک میں جاتا ہوں تو میرے پروگرام کا ایک ضروری حصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ میں وہاں کے کسی بڑے کتب خانے کو دیکھوں اور اگر کچھ نئی کتابیں مفید مطلب معلوم ہوں تو خریدلوں۔ اب تک آسٹریلیا کے کسی کتب خانے میں جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ آج عصر کے بعد میرے میزبانوں نے میرے اس شوق کی تکمیل کی، اور اس کے لئے مجھے میلبورن شہر کے وسطی علاقے میں لے گئے۔ ایک بڑے کتب خانے میں کچھ وقت گذارا۔ آج کل سرمایہ دارانہ نظام اور مروجہ مالیاتی نظام پر مفکرین مغرب کی تنقیدیں اس کثرت کے ساتھ آرہی ہیں کہ تقریباً ہر مہینے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کتاب اس موضوع پر آجاتی ہے۔ اسی موضوع کی چند

کتابیں یہاں بھی ملیں، اور میں وہ اپنے ساتھ لے آیا۔ مغرب کی نماز بھی وسطِ شہر کی ایک مسجد میں ادا کی۔

عشاء کے بعد دارالعلوم کالج میں ''غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں'' کے موضوع پر میری تقریر کا اعلان تھا۔ چونکہ یہ چھٹی کا دن نہیں تھا اور دارالعلوم کالج شہر سے فاصلے پر واقع ہے، اس لئے منتظمین کسی بڑے اجتماع کی توقع نہیں کر رہے تھے، لیکن جب ہم اذانِ عشاء کے وقت کالج کے احاطے کے قریب پہنچے تو پورا احاطہ اور اس کے باہر کا علاقہ کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ نمازِ عشاء کے لئے مسجد کا ہال تنگ پڑ گیا، خواتین کے لئے الگ ہال میں انتظام کیا گیا تھا اور معلوم ہوا کہ خواتین مردوں سے بھی زیادہ تھیں۔ اصل تقریر انگریزی میں ہوئی، مگر تقریباً چھ سات زبانوں میں الگ الگ ترجمے کا انتظام تھا۔ اس کا طریقہ یہاں یہ ہوتا ہے کہ مختلف زبانوں میں سننے والے الگ الگ گروپوں کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں اور ہر گروپ میں ایک شخص تقریر کا متعلقہ زبان میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جاتا ہے۔ حسبِ معمول تقریر کے بعد سوال و جواب کی بھی طویل نشست ہوئی جو رات دیر تک جاری رہی۔

تقریر کے بعد آسٹریلیا ریڈیو (ایس بی ایس) کے کچھ نمائندے انٹرویو کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے تقریباً آدھے گھنٹے کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔

اس کے بعد بھی انفرادی ملاقاتوں اور مقامی مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور بستر تک پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج گئے۔

میلبورن میں ایک مصری مسلمان مسٹر ناصر عبدالحکیم نے مسلم کمیونٹی کوآپریٹو کے نام سے (جس کا مخفف MCCA ہونے کی وجہ سے لوگ اسے مکہ پڑھتے ہیں) ایک مالیاتی ادارہ قائم کیا ہوا ہے جس کا مقصد اسلامی بنیادوں پر سرمایہ کاری اور فنانسنگ کی خدمات انجام دینا ہے۔ اُن کی اور مقامی علماء کی خواہش تھی کہ میں اس ادارے کا معائنہ کروں اور یہ دیکھوں کہ وہ کس حد تک شرعی تقاضوں کو پورا کر رہا ہے؟ چنانچہ منگل ۲ مئی کی صبح نو بجے اُن کے دفتر میں جانے کا پروگرام تھا جو میلبورن شہر میں واقع ہے۔ مسٹر ناصر عبدالحکیم نے ادارے کے بنیادی خدوخال بتائے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ اس ادارے میں اپنی بچتیں جمع کرا کر اس کے حصص حاصل

کرتے ہیں اور ادارے کے نفع ونقصان میں شریک ہوتے ہیں ، پھر یہ ادارہ اسلامی طریقۂ ہائے تمویل کے مطابق لوگوں کو مختلف مقاصد کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے۔اب تک اس کی سرگرمیوں کا بڑا حصہ رہائشی مکانوں کے حصول کے لئے اسلامی بنیادوں پر سرمائے کی فراہمی ہے جسے انہوں نے شرکت متناقصہ (Diminishing Partnership) کے اصولوں پر استوار کیا ہے یعنی ادارے اور متعلقہ شخص کے درمیان مشترک طور پر مکان خریدا جاتا ہے ۲۰% قیمت متعلقہ شخص ادا کرتا ہے اور ۸۰% ادارہ۔ پھر ادارہ اپنا حصہ اس شخص کو کرائے پر دیدیتا ہے اور وقفے وقفے سے وہ شخص ادارے کے حصص خریدتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے کل مکان کی ملکیت حاصل ہوجاتی ہے۔

مغربی ملکوں میں چونکہ مکان کی ملکیت کے حصول کے لئے عموماً سود پر قرض لینا پڑتا ہے۔اس لئے کسی شرعی طریقے پر مکان کا حصول مسلمانوں کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ الحمدللہ اب ان ملکوں میں مسلمان ایسے ادارے قائم کر رہے ہیں جن کے ذریعے یہ مقصد اسلامی اصولوں کے مطابق حاصل ہوسکے۔ یہ ادارہ بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ مسٹر ناصر عبدالحکیم نے بتایا کہ گزشتہ سال ادارے کے حصہ داروں کو سات فیصد منافع تقسیم کیا گیا جو یہاں کی شرح منافع کے پیش نظر ایک بڑی کامیابی ہے۔

بیشتر ملکوں میں جہاں بھی اسلامی مالیاتی ادارے قائم ہیں ان کے شرعی معاملات کی نگرانی ایک شریعہ بورڈ کرتا ہے۔ ابھی اس ادارے میں ایسا کوئی شریعہ بورڈ نہیں ہے، میں نے تجویز پیش کی کہ الحمدللہ آسٹریلیا ہی میں ایسے اہل علم موجود ہیں جو یہ کام انجام دے سکتے ہیں لہٰذا ایسا شریعہ بورڈ بنانا ضروری ہے تاکہ واقعۃً کام شریعت کے مطابق ہو اور اسے عوامی اعتماد بھی حاصل ہوسکے۔ مسٹر ناصر نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے ارادہ ظاہر کیا کہ انشاء اللہ وہ عنقریب اس تجویز پر عمل کی کوشش کریں گے۔ مولانا مفتی نجیب صاحب نے ماشاء اللہ فتویٰ کی تربیت ہمارے دارالعلوم کراچی میں حاصل کی ہے، فقہ میں معیاری استعداد کے حامل ہیں اور عمدہ علمی وفقہی ذوق رکھتے ہیں، جدید مسائل پر بھی ان کی اچھی نظر ہے، انگریزی زبان پر بھی

انہیں عبور حاصل ہے، وہ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہی ہمارے مشورے سے آسٹریلیا آئے ہیں لیکن اس مختصر مدت میں انہوں نے بفضلہٖ تعالیٰ نہ صرف دارالعلوم کالج میں تدریس اور انتظامی امور سنبھالنے کا مشکل کام سلیقے سے انجام دیا ہے، بلکہ وہ ایک مفتی کی حیثیت میں علاقے کے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ بھی ذمہ داری اور لگن سے ادا کر رہے ہیں۔ میں نے ایم سی سی آئی کے حضرات کو مشورہ دیا کہ وہ ان سے رابطہ رکھیں۔ انشاء اللہ وہ اس کام کے لئے اُن کے بہترین معاون ثابت ہوں گے۔

بارہ بجے کے قریب ہم اس ادارے سے فارغ ہوئے، تو تھوڑا سا وقت میلبورن شہر کے خاص خاص مقامات دیکھنے میں بھی استعمال ہوا۔ کینبرا کے دارالحکومت بننے سے پہلے میلبورن کسی زمانے میں آسٹریلیا کی وفاقی حکومت کا صدر مقام بھی رہا ہے، یہ جنوب مشرق کی سمت میں آسٹریلیا کا آخری کنارا ہے اور اس کے بعد چند چھوٹے جزیروں کو چھوڑ کر قطبِ جنوبی تک مسلسل سمندر ہی سمندر ہے۔ یہ ریاست وکٹوریہ کا دارالحکومت ہے اور اس کے آس پاس سونے کی کانیں ہیں جن کی وجہ سے اسے بڑی معاشی اور تجارتی اہمیت حاصل ہے۔ شہر کی بیشتر عمارتیں قدیم برطانوی روایت کی آئینہ دار ہیں، البتہ ساحلِ سمندر کے قریب امریکی طرز کی بلند عمارتیں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس علاقے میں سردی نسبۃً زیادہ ہوتی ہے، مگر نقطۂ انجماد تک نہیں پہنچتی، اس کے علاوہ یہ شہر موسم کے جلد جلد تبدیل ہونے کیلئے آسٹریلیا بھر میں مشہور ہے۔ اُس روز موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی اور ساحل سمندر کی پُرسکون فضا میں چند لمحات بڑے سرور انگیز ثابت ہوئے۔

اُسی روز مغرب کے بعد آس پاس کے بہت سے علماء اور باثر حضرات ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ اُن سے مقامی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ عشاء کے بعد دوبارہ میرا خطاب تھا۔ اس دن میں نے خطاب مختصر کر کے زیادہ وقت اُن سوالات کا جواب دینے میں صرف کیا جو گذشتہ روز تشنہ رہ گئے تھے، رات گئے تک انفرادی طور پر بھی سوالات کا سلسلہ جاری رہا۔ مسلسل سفر اور پروگراموں کی وجہ سے جسمانی اور دماغی تھکن ضرور غالب ہوئی، لیکن الحمدللہ یہ

روحانی سکون میسر تھا کہ بہت سے حضرات کی الجھنیں دور ہوئیں، اور اپنے بھائیوں بہنوں کی خدمت کا موقع ملا۔

بدھ کی صبح نو بجے ہمیں سڈنی کے لئے روانہ ہونا تھا، ہم سوا آٹھ بجے کے قریب ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے، مگر معلوم ہوا کہ جہاز موسم کی خرابی کی وجہ سے لیٹ ہے میلبورن کے احباب ایک قریبی ریستوران میں بیٹھ گئے، جہاز بارہ بجے روانہ ہو سکا، بعض مسائل میں انہیں مشورہ کرنے کا وقت نہ مل سکا تھا۔ یہ وقت اس کمی کی تلافی میں کام آ گیا۔

سڈنی میں

میلبورن سے سڈنی کا سفر ایک گھنٹے کا ہے، سڈنی کے احباب دس بجے سے ایئرپورٹ پر منتظر تھے اور ہم ایک بجے سڈنی کے ایئرپورٹ پر اتر سکے۔ مولانا ڈاکٹر شبیر صاحب اپنے رفقاء کے ہمراہ استقبال کے لئے موجود تھے، حضرت مولانا نجم الحسن تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نظیر الحسن صاحب بھی ایئرپورٹ آئے ہوئے تھے۔ جہاز کی تاخیر کی وجہ سے وقت کم رہ گیا تھا سڈنی کا ایک مضافاتی علاقہ رُوٹی ہل کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں کی جامع مسجد اور مدرسے کی سربراہی ڈاکٹر شبیر صاحب فرماتے ہیں آج کا دن یہیں گزارنا تھا، اس لئے ایئرپورٹ سے براہِ راست رُوٹی ہل پہنچے، نماز اور کھانے کے بعد معمولی سا آرام ملا، عصر کے بعد ڈاکٹر شبیر صاحب نے علماء کا ایک اجتماع طے کیا ہوا تھا اور جب میں برزبین جاتے ہوئے سڈنی میں اترا تھا تو مولانا شبیر صاحب نے اسی وقت بتا دیا تھا کہ بعض مقامی مسائل ایسے ہیں جن کا فیصلہ یہاں کے مقامی علماء نے آپ پر چھوڑا ہوا ہے، یہ اجتماع اسی غرض سے بلایا گیا تھا۔ ان مسائل میں ایک اہم مسئلہ رویت ہلال کا تھا جس میں اختلاف کی وجہ سے مسلمان بڑی صعوبت کا شکار رہے ہیں۔ اس موضوع پر اختلافِ مطالع کے حوالے سے آراء بھی مختلف تھیں۔ چنانچہ عصر اور مغرب کے بعد مختلف نقطہ ہائے نظر سننے اور اُن پر بحث کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ حاضرین کا ایک فارمولے پر اتفاق ہو گیا۔ اس کے بارے میں ایک تحریر بھی لکھ لی گئی اور اس پر سب کے دستخط بھی ہو گئے۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ آسٹریلیا کے بعض دوسرے

گروپ جو اس مجلس میں حاضر نہیں ہو سکے تھے، اُن سے بھی مقامی علماء رابطہ کر کے ان کا اتفاق بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس مجلس کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے عشاء کی اذان ہوگئی، نماز کے لئے مسجد پہنچے تو وہ نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اگرچہ رُوٹی ہل کی یہ مسجد شہر سے کافی فاصلے پر واقع ہے اور عصر کے بعد سے مسلسل بارش کا سلسلہ بھی جاری تھا اور وہ چھٹی کا دن بھی نہیں تھا، اس کے باوجود اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کا یہاں تک پہنچنا دین کے ساتھ ان کی غیر معمولی وابستگی کی واضح علامت تھا۔

دن بھر کے سفر اور مسلسل مصروفیت کی بنا پر جسم اور ذہن پر تھکن کا غلبہ تھا مگر حاضرین کا جذبہ اور اشتیاق دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ طبیعت میں خود بخود تازگی آ گئی ہے۔ شروع میں خیال یہ تھا کہ مختصر خطاب کروں گا، لیکن حاضرین کی برکت سے یہ خطاب بھی تقریباً سوا گھنٹے طویل ہوا اور اس کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی وہ لوگ جن سے میری کوئی سابقہ ملاقات نہ تھی، نہ میں نے کبھی انہیں دیکھا تھا، نہ انہوں نے مجھے، صرف دینی رشتے کی محبت دل میں لئے اتنی دور دور سے یہاں پہنچے تھے۔ ان کا خلوص و محبت وہ دولت تھی جس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔ خطاب کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سماں بھی قابل دید تھا۔ ان میں سے بہت سے وہ تھے جو میری تحریروں کے واسطے سے مجھ سے متعارف تھے، بہت سے وہ تھے جنہوں نے صرف نام ہی سُنا تھا اور بہت سے وہ تھے جو میرے بارے میں پہلے کچھ نہیں جانتے تھے، لیکن صرف یہ معلوم کر کے چلے آئے تھے کہ پاکستان سے دین کا ایک طالب علم آیا ہے جو دین کے بارے میں کچھ گفتگو کریگا۔

تقریر کے بعد قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ملکی سطح پر مسلمانوں نے ایک ریڈیو ''وائس آف اسلام'' کے نام سے قائم کیا ہوا ہے جو پورے آسٹریلیا میں سُنا جاتا ہے۔ اس ریڈیو کے نمائندے انٹرویو کے لئے موجود تھے۔ تقریباً نصف گھنٹہ انہیں انٹرویو دینے میں صرف ہوا۔ مگر انہوں نے بہت مفید سوالات کئے اور امید ہے کہ انشاء اللہ اس سے بہت سے ضروری امور کی وضاحت ہوئی ہوگی۔

پہلے سے میرا جو پروگرام طے شدہ تھا، اس کے مطابق مجھے اگلے دن یعنی جمعرات کو سہ پہر میں واپس کراچی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ لیکن ایک تو سڈنی کے احباب کا اصرار تھا کہ یہاں کچھ وقت مزید گذارا جائے، دوسرے مولانا ڈاکٹر شبیر صاحب سے کینبرا کے حضرات نے رابطہ کیا تھا کہ جمعہ کا دن کینبرا میں ہو اور وہیں جمعہ کا خطاب بھی ہو، مگر پروازوں کا نظام کچھ ایسا تھا کہ اگر جمعہ کینبرا میں گذارا جاتا تو پیر کے دن تک کوئی مناسب پرواز مہیا نہ ہوتی۔ تیسرے حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی قدس سرہ کے صاحبزادے جناب نظام الحق تھانوی صاحب اور حضرت مولانا نجم الحسن تھانوی صاحبؒ کے صاحبزادے نظیر الحسن تھانوی صاحب سڈنی سے تقریباً سو کیلومیٹر کے فاصلے پر سینٹرل کوسٹ میں مقیم ہیں، میرے پورے سفر کے دوران جگہ جگہ اُن کے فون آتے رہے تھے کہ قیام میں تھوڑا سا اضافہ کر کے کم از کم ایک دن ان کے ساتھ سینٹرل کوسٹ میں گذارا جائے۔ یہ سب حضرات رات کے کھانے پر مولانا شبیر صاحب کے مکان پر موجود تھے اور یہ تجویز لے کر آئے تھے کہ جمعہ اور ہفتے کی درمیانی شب میں ایک پرواز سنگاپور جاتی ہے اس کے ذریعے ہفتے کی شام تک کراچی پہنچنا ممکن ہے۔ ابھی میں اسی تردّد میں تھا کہ نظام الحق تھانوی صاحب نے کہا کہ ''اگر اجازت ہو تو استاد ذوق کا ایک قطعہ پیش کروں جو ہمارے حسبِ حال ہے۔'' پھر انہوں نے اپنے والدِ ماجد حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی قدس سرہ کے مخصوص لب ولہجہ اور ترنم میں یہ قطعہ سُنایا

وہ صبح کو آئیں تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا
ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور چاہوں کہ گر آج سے کل جائے تو اچھا
جب کل ہو تو پھر یونہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھا
القصہ نہیں چاہتا جائیں وہ یہاں سے
دل ان کا یہیں کاش بہل جائے تو اچھا

ان حضرات نے کچھ ایسی محبت سے یہ فرمائش کی کہ میں رد نہ کر سکا، جناب سرور صاحب نے جو سڈنی کے بااثر مسلمان ہیں، سیٹ اور ٹکٹ کی تبدیلی کا ذمہ لیا اور اس طرح آسٹریلیا میں میرا قیام تقریباً ڈیڑھ دن بڑھ گیا۔ اس کے بعد رات گئے تک احباب کی پُر لطف نشست جمی رہی نظام الحق صاحب اور نظیر الحسن صاحب شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، اس لئے شعر و شاعری کا بھی تھوڑا سا دور چلا، ڈاکٹر شبیر صاحب ماشاء اللہ یہاں دینی رہنمائی کا مرکز اور مرجع سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے مقامی مسائل پر گفتگو فرمائی اور بالآخر رات گئے بستر پر پہنچنے کی نوبت آئی۔

جمعرات ۴ر مئی کو فجر کے بعد مسجد میں میرا مختصر سا درسِ حدیث ہوا، ناشتے کے بعد ڈاکٹر شبیر صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ یہاں قریب میں مرغیوں کے مشینی ذبیحے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ہے اُس کا معائنہ کر کے دیکھا جائے کہ اس طریقے سے اسلامی ذبیحے کے تقاضے پورے ہوتے ہیں یا نہیں؟ اگر چہ میں امریکہ، کینیڈا اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں متعدد کارخانے دیکھ چکا ہوں اور اس موضوع پر میرے عربی رسالے "احکام الذبائح" میں مفصل بحث موجود ہے لیکن مولانا شبیر صاحب نے بتایا کہ اس فیکٹری میں طریق کار تھوڑا سا مختلف ہے اور اس میں شرعی تقاضے پورے ہونے کا احتمال موجود ہے، اس لئے اس کا معائنہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ ہم سب لوگ اس مشینی مذبح میں پہنچے جس کا نام Rootihill Homeboush Abott ہے اور اس میں اوسطاً ساٹھ ہزار مرغیاں روزانہ ذبح ہوتی ہیں۔ جیسا کہ میں اپنے رسالے "احکام الذبائح" میں لکھ چکا ہوں، مشینی ذبیحے کے طریق کار میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہر مرغی پر الگ اللہ تعالیٰ کا نام لینا ممکن نہیں ہوتا، بہت سے لوگ مشین کا بٹن دباتے وقت بسم اللہ پڑھ لیتے ہیں، پھر مشین سے سارے دن ہزاروں مرغیاں ذبح ہوتی رہتی ہیں۔ اس طریق کار سے شرعی شرائط پوری ہونے میں سخت اشکال ہے، اس لئے اب تک ہم نے اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔ لیکن اس کارخانے میں طریق کار یہ ہے کہ جب مرغی مشینی چھری کے قریب پہنچتی ہے تو ایک شخص اُسے چھری کی طرف دھکا دیتا ہے اور اس وقت یہ بات ممکن ہے

کہ وہ ہر مرغی کو دھکا دیتے وقت بسم اللہ پڑھ لے، اگرچہ ابھی تک کارخانے میں اس پر عمل نہیں ہورہا ہے لیکن کارخانے کے لوگ اس پر رضامند ہیں کہ وہ اس جگہ مسلمان اہل کار تعینات کریں اور وہ مرغیوں کو چھری تک لیجانے کے عمل کے وقت بسم اللہ پڑھ لیں۔ اس طریق کار کا مشاہدہ کرنے کے بعد میرا رُجحان بھی یہ ہوا کہ اگر اس طریق کار پر عمل کرلیا جائے تو جانوروں کے حلال ہونے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

اس مذبح کے معائنے کے بعد ہم ڈاکٹر شبیر صاحب سے جدا ہوکر نظام الحق صاحب اور نظیر الحسن صاحب کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ مولانا عزیر صاحب کو جو برزبین سے ہمارے ساتھ تھے اسی روز دوپہر واپس برزبین جانا تھا۔ لہٰذا سڈنی شہر کا ایک چکر لگانے کے بعد پہلے انہیں ایئرپورٹ پر الوداع کہا، مولانا اسد اللہ طارق صاحب کو بھی سڈنی کے کچھ احباب کے پاس ٹھہرنا تھا، اس لئے وہ بھی یہاں سے جُدا ہوگئے اور میں اب سینٹرل کوسٹ جانے کے لئے نظام الحق صاحب اور نظیر الحسن صاحب کے ساتھ روانہ ہوگیا، راستے میں سڈنی کا ایک محلّہ آبرن (Auburn) پڑتا تھا، یہاں ترکی کے مسلمانوں نے ایک عالیشان اور خوبصورت مسجد تعمیر کی ہے جو استنبول کی سلطان احمد مسجد (Blue Mosque) کا ہو بہو نمونہ ہے اور ایک غیر مسلم ملک میں اتنی شاندار مسجد دیکھ کر دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ اسی مسجد کے قریب ایک مکان میں نظیر الحسن صاحب نے قرآن کریم کی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم کیا ہوا ہے جہاں مسلمان بچے اور بچیاں قرآنِ کریم حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، نظیر الحسن صاحب خود اور ان کی والدۂ ماجدہ یہاں تعلیم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

سینٹرل کوسٹ میں

یہاں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم سینٹرل کوسٹ جانے کے لئے سڈنی سے باہر نکلے، سینٹرل کوسٹ سڈنی کے شمال میں ایک طویل ساحلی علاقہ ہے جو بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں پر مشتمل ہے، انہی شہروں میں سے ایک نام وایونگ (Wyong) ہے جہاں یہ دونوں حضرات مقیم ہیں، سڈنی سے اس شہر کا فاصلہ تقریباً ۱۰۰ کیلومیٹر ہے، مگر ہائی وے اتنی صاف ہے

کہ یہ فاصلہ گھنٹے سوا گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ یہ پورا راستہ سرسبز و شاداب وادیوں، سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں اور سمندری خلیجوں سے بھرا ہوا ہے، راستے کے حسن کی وجہ سے فاصلے کا احساس ہی نہیں ہوا مغرب کے قریب ہم وایونگ پہنچ گئے۔ قیام گاہ سے تقریباً پانچ سات کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے عشاء کی نماز ہم نے اس مسجد میں ادا کی۔ اگرچہ اس شہر میں میری آمد کسی تقریر وغیرہ کے لئے نہ تھی، لیکن بعض حضرات کو اطلاع ہوگئی اور وہ قریب کے ایک بڑے شہر نیو کاسل سے سفر کر کے عشاء میں یہاں پہنچ گئے، اس لئے یہاں بھی ایک مختصر سا خطاب ہو گیا۔

یہ مسجد جن صاحب نے تعمیر کی ہے، وہ ایک انڈونیشی مسلمان ہیں جنہیں یہاں لوگ رضوان صاحب کے نام سے جانتے ہیں اور اس وقت وہ متعدد فیکٹریوں کے مالک اور بڑے دولتمند انسان ہیں۔ عشاء کے بعد وہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر آ گئے۔ باتوں باتوں میں ایک صاحب نے ذکر کیا کہ وہ نومسلم ہیں اور ان کا اصل نام رابرٹ واجو تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ تقریباً دس سال پہلے مسلمان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کی جو داستان سُنائی وہ بڑی ایمان افروز ہے اور اسے یہاں ذکر کئے بغیر میرے اس سفر کا تذکرہ نامکمل رہیگا۔

اُنہوں نے بتایا کہ میرے دادا اگرچہ مسلمان تھے، لیکن انہوں نے ایک عیسائی خاتون سے شادی کر لی تھی، ان عیسائی خاتون نے (جو رضوان صاحب کی دادی تھیں) اپنی ساری اولاد کو عیسائی بنا لیا جن میں میرے والد صاحب بھی شامل تھے، اُن کے زیر اثر میں بھی عیسائی تھا۔ میں اپنے لڑکپن میں ایک خطرناک حد تک، وارہ لڑکا تھا جو شراب وشباب سے لے کر قتل وغارت گری تک ہر برائی میں مبتلا تھا۔ اگرچہ اپنے جیسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہ کر یہ ساری بُرائیاں میرے لئے روزمرہ کی عادت بن گئی تھیں، لیکن کبھی کبھی میرے دل میں سویا ہوا ضمیر جاگتا اور مجھے احساس ہوتا کہ میں سنگین گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہوں، ایسے موقع پر میں کبھی کبھی چرچ جاتا اور پادری صاحب سے اپنے گناہوں کا ذکر کرتا، پادری صاحب میری بخشش

کی دعا کر کے مجھے مطمئن کر دیتے۔ دوسری طرف میں جس تعلیمی ادارے میں پڑھتا تھا، وہاں میری ایک خاتون استاد تھیں جو مسلمان تھیں اور مجھے ان کی باتیں اچھی لگتی تھیں، اس لئے میں کبھی کبھی ان کے پاس چلا جاتا اور ان سے بھی اپنی حالت کا ذکر کرتا تو وہ مجھے ان حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرتیں اور بتاتیں کہ ان کاموں کا انجام دنیا میں بھی بُرا ہے اور آخرت میں بھی۔ میرے والد نے جو فوج کے بڑے اونچے عہدے پر فائز تھے، مجھے ایک بی ایم ڈبلیو گاڑی خرید کر دی ہوئی تھی اور اس کے لئے ایک ڈرائیور رکھا ہوا تھا، وہ بھی مسلمان تھا۔ یہ مسلمان ڈرائیور بھی کبھی کبھی باتوں باتوں میں میرے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کیا کرتا تھا۔

اسی دوران میرے مسلمان دادا بیمار ہوئے، اور مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے میرے لئے ایک وصیت نامہ سربمہر کر کے رکھا ہوا ہے اور یہ وصیت کی ہے کہ یہ تحریر ان کی وفات کے بعد مجھے دی جائے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دادا نے اس تحریر میں اپنی جائیداد وغیرہ مجھے دینے کی وصیت کی ہوگی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب میرے دادا کی وفات ہوئی تو ان کی وصیت کے مطابق یہ سربمہر لفافہ میرے حوالے کیا گیا۔ میں خوش تھا کہ اس وصیت نامے کے نتیجے میں، میں مزید مال دار ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں نے لفافہ کھول کر دیکھا تو میری حیرت اور افسوس کی انتہا نہ رہی۔ یہ ایک سادہ کاغذ تھا جس پر کسی وصیت نامے کے بجائے صرف یہ کلمہ لکھا ہوا تھا کہ:

"اشهدان لااله الاالله واشهدان محمداً عبده ورسوله"

مجھے یہ پرچہ دیکھ کر اتنا صدمہ ہوا کہ میں نے اس کے دو ٹکڑے کر کے اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور سیدھا اپنی مسلمان استانی کے پاس پہنچا اور اُن کو جا کر یہ واقعہ سنایا۔ وہ میرے ساتھ میرے گھر آئیں، پرچہ دیکھا اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہارے دادا نے تمہیں دنیا کے مال و دولت سے کہیں بڑی نعمت دینے کی وصیت کی ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ، مگر میں نے ان کی بات نہ مانی اور پھر اپنی انہی بداعمالیوں میں مصروف ہو گیا۔

وہ کہتے ہیں کہ ایک عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر میرے ضمیر کے کچوکے مجھے چرچ لے گئے اور میں نے پادری صاحب سے کہا کہ میں بار بار آپ کے پاس آتا ہوں اور آپ مجھے مغفرت کی بشارت سنا کر واپس بھیج دیتے ہیں، لیکن میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، میں

پھر بے دھڑک وہی کام کرنے لگتا ہوں۔ پادری صاحب نے پھر وہی بات دُھرائی کہ جب میں تمہارے لئے مغفرت کی دعا کردیتا ہوں تو پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ مجھے پادری صاحب کی اس بات پر غصہ آ گیا، میں نے جیب سے پستول نکالا اور اُن پر اس طرح فائر کردیا کہ وہ زخمی ہوجائیں، مگر زندہ رہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ واردات کرکے میں باہر نکلا تو میرے اندر کی بے چینی میں اور اضافہ ہوگیا، قدرتی طور پر مجھے اس واقعے کے بعد فرار ہونا تھا۔ لیکن میں نے اپنی بے چینی کا تذکرہ اپنے مسلمان ڈرائیور سے کیا، ڈرائیور نے ایک مرحلے پر کہا کہ میں آپ کو ایک ایسی جگہ لیجاتا ہوں جہاں شاید آپ کی بے چینی میں کمی آجائے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو وہ مجھے ایک ایسے حلقے میں لے گیا جہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے لا الہ الا اللہ کا ذکر کررہے تھے۔ میں جب اس حلقے میں پہنچا تو میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا تھا، مجھ پر ایک ناقابل بیان کیفیت طاری ہوئی، ذکر کرنے والوں کی آواز لاالہ الااللہ میری رگ و پے میں سرایت کرگئی اور مجھ پر اس ذکر نے کچھ ایسا طلسماتی اثر کیا کہ میرا سارا وجود لرز اُٹھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں سر سے لے کر پاؤں تک بدل چکا ہوں میں جلد سے باہر نکلا اور اپنی مسلمان استانی کے پاس پہنچا، انہیں سارا واقعہ سنایا، اس پر وہ اُٹھیں اور تھوڑی دیر میں وہ پھٹا ہوا پرچہ اٹھا لائیں جو میرے دادا نے میرے لئے چھوڑا تھا اور میں نے اسے پھاڑ دیا تھا، میری اُستانی نے ٹکڑوں کو جوڑ کر مجھے وہ پرچہ دکھایا جس پر لکھا تھا:

اشھدان لاالہ الااللہ واشھدان محمداً عبدہ ورسولہ

میری استانی نے کہا کہ تمہارے دادا کی وصیت پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے، اب تم اس کلمے پر ایمان لاکر مسلمان ہوجاؤ۔ میری زندگی میں پہلے ہی انقلاب آ چکا تھا اور اس کلمے کی حقانیت میرے دل میں اتر گئی تھی، میں نے بلاتاخیر اسلام قبول کرلیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میں اپنے عیسائی والد کے پاس پہنچا اور انہیں بتایا کہ میں مسلمان ہوچکا ہوں۔ میرے والد غصے سے آگ بگولہ ہوگئے انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا، میری بی ایم ڈبلیو واپس لے لی اور اپنی ساری دولت سے مجھے محروم کردیا۔ مگر اسلام میرے دل

میں گھر کر چکا تھا، میں چند دن کچھ مسلمان درویشوں کے پاس رہا اور میرے دل میں یہ بات سما گئی کہ ''ذکر'' ہی سب کچھ ہے، چنانچہ کچھ عرصے بعد میں نے شہر سے باہر ایک جھونپڑی بنالی اور وہاں دن رات ''لاالہ الا اللہ'' کے ذکر میں مشغول ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس ذکر نے میری گناہوں کی زندگی کو دھو دیا ہے اور میرا ہر کام اسی ذکر کی بدولت بنتا ہے، میں اُس وقت نماز روزے اور دوسرے احکام اسلام سے بھی بے بہرہ تھا اور صرف ذکر پر قناعت کئے ہوئے تھا، بھوک پیاس دور کرنے کے لئے تھوڑا سا کام کرتا، پھر اپنے جھونپڑے میں آ کر ذکر میں مشغول ہو جاتا۔ جب اسی حالت میں کچھ عرصہ گذر گیا تو ایک روز میں نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا، انہوں نے فرمایا کہ میں (شیخ) عبدالقادر جیلانیؒ ہوں اور جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے وہ صحیح نہیں، اسلام کا تقاضا یہ نہیں کہ انسان دنیا کو چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے اور صرف ذکر کرتا رہے۔ اسلام میں ذکر کے علاوہ فرض عبادتیں بھی ہیں جن میں نماز سرفہرست ہے اور اسلام ہی کا یہ حکم بھی ہے کہ انسان سنت کے مطابق انسانوں کے ساتھ زندگی گذارے، اس لئے اب جنگل چھوڑ کر شہر واپس جاؤ، اسلام کی صحیح تعلیم حاصل کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔

اس خواب کے بعد میں دوبارہ شہر میں آیا، اپنی مسلمان استانی سے دین کی تعلیمات حاصل کیں، اس دوران میرے والد کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا، میں اُن کا بیٹا تھا اور مجھے گم کر کے وہ پریشان تھے، جب میں دوبارہ شہر میں آیا تو انہوں نے مجھ سے پھر بیٹے جیسا سلوک شروع کر دیا اور جو سہولتیں مجھ سے چھینی تھیں وہ بڑی حد تک مجھے واپس دیدیں۔ میری والدہ آسٹریلیا میں رہتی تھیں، وہ بھی انڈونیشیا آ کر میری گمشدگی پر پریشان تھیں، میری واپسی کے بعد وہ مجھے ملنے آئیں اور مجھے اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی، مگر میں نے اُن سے صاف کہہ دیا کہ اسلام چھوڑنا میرے لئے ناقابلِ تصور ہے۔

اسی دوران ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی پر مزید گہرے اثرات مرتب کئے۔ میرے والد کے ایک مسلمان دوست فوج میں جنرل تھے وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے اور میں دیکھتا تھا کہ وہ مسجدوں کی تعمیر، ہسپتالوں کے قیام اور دوسرے خیراتی

کاموں میں بڑا حصہ لیا کرتے تھے۔ اُن کا انتقال ہوگیا تو میں اُن کے جنازے میں شریک ہوا۔ جب انہیں قبر میں اتارنے کا وقت آیا تو اُن سے اپنے قلبی لگاؤ کی وجہ سے میں نے ہی انہیں قبر میں اُتارا، قبر پر مٹی ڈال دی گئی، مگر جب میں واپس جانے لگا اور وقت دیکھنے کے لئے گھڑی دیکھنی چاہی تو کلائی سے گھڑی غائب تھی۔ یہ گھڑی بہت قیمتی تھی اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ قبر میں رہ گئی ہے۔ اس وقت میں نے کسی سے کچھ ذکر نہ کیا، لیکن رات کے وقت مرحوم کے رشتہ داروں سے اس واقعہ کا ذکر آ گیا، گھڑی چونکہ بہت قیمتی تھی اس لئے ان رشتہ داروں نے پیشکش کی کہ صبح قبر کھود کر گھڑی نکال لی جائے۔ کچھ تردد کے بعد میں بھی راضی ہوگیا، چنانچہ صبح کو قبر کھودی گئی تو وہاں ایک ایسا بھیانک منظر نظر آیا جو آج بھی میری نگاہوں سے نہیں ہٹتا۔ جن جنرل صاحب کو ہم دفن کر کے آئے تھے وہ قبر میں نیم اکڑوں حالت میں بیٹھے تھے، اُن کا منہ خوفناک انداز میں کھلا ہوا تھا، اُن کی کہنیوں سے خون بہہ رہا تھا، سینے اور ہاتھ پاؤں پر نیلے نیلے نشان تھے۔ ہم نے گزشتہ دن چار بجے شام کے قریب انہیں دفن کیا تھا اور یہ اگلے دن صبح آٹھ نو بجے کا وقت تھا، یعنی تدفین کو سولہ سترہ گھنٹے سے زیادہ بھی نہیں گزرے تھے، اتنی سی دیر میں ان کی لاش کا یہ حشر دیکھ کر ہم سب پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ آج بھی وہ ہیبت ناک منظر نگاہوں سے نہیں ہٹتا۔

میں نے اس واقعے کا ذکر اپنی استانی سے کیا اور ان سے پوچھا کہ یہ جنرل صاحب تو خیراتی کاموں میں بہت حصہ لیا کرتے تھے، اس کے باوجود ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں ہوا؟ میری استانی نے کہا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے اندرونی حالات سے باخبر نہیں ہوسکتا اور اگر خیراتی کاموں میں اخلاص نہ ہو، بلکہ وہ شہرت اور نام ونمود کے لئے کئے جائیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی کوئی قیمت نہیں۔

اس واقعے کے بعد مجھے ہر وقت اپنی قبر یاد رہنے لگی، میں نے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حالات درست کرنے کی فکر شروع کردی اور بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے غیر مسلم والد کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنا کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کروں۔ چنانچہ میں آسٹریلیا چلا آیا۔ شروع کا زمانہ میں نے بڑی غربت میں گذارا اور سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے کام کر کے

پیٹ پالا...... (جس وقت رضوان صاحب یہ واقعہ سنا رہے تھے اُن کے ساتھ ایک اور انڈونیشی مسلمان بیٹھے تھے ان کی طرف اشارہ کر کے رضوان صاحب نے کہا ''ان سے پوچھئے یہ میرے اُس وقت کے دوست ہیں'' اُن صاحب نے تصدیق کی اور بتایا کہ واقعۃً یہ اس وقت بڑی غربت کی حالت میں آسٹریلیا میں رہ رہے تھے) لیکن میں نے اپنی پچھلی زندگی سے دو سبق حاصل کئے تھے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق قائم رکھا جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے، دوسرے جو کام کیا جائے، اخلاص اور محبت کے ساتھ کیا جائے ۔ انہی دو اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے میں ہر بات اللہ تعالیٰ سے مانگتا، کثرت سے نماز ادا کرتا، اپنی قبر ہر وقت میرے سامنے رہتی یہاں تک کہ میرے لئے رزق کے دروازے کھلتے چلے گئے اور الحمدللہ آج میں متعدد فیکٹریوں کا مالک ہوں۔

رضوان صاحب نے یہ طویل داستان ختم کی تو حاضرین میں سے ان حضرات نے جو انہیں مدت سے جانتے تھے یہ بتایا کہ اس سے پہلے انہیں بھی ان کے اس پورے واقعے کا علم نہیں تھا اور آج پہلی بار انہوں نے یہ واقعات تفصیل کے ساتھ سنائے ہیں، واضح رہے کہ یہ رضوان صاحب انڈونیشیا کے موجودہ صدر کے سسرالی رشتہ دار ہیں، (انہوں نے ان سے اپنا صحیح رشتہ بھی بتایا تھا جو اب مجھے یاد نہیں رہا) اور اس بنا پر صدر انڈونیشیا سے ان کے بے تکلفانہ تعلقات ہیں ۔ اُن کی اس داستان میں بعض پہلو عجیب ضرور ہیں، لیکن مجھے ان کی شخصیت میں غلط بیانی یا مبالغہ آمیزی کا کوئی امکان نظر نہیں آیا۔

سینٹرل کوسٹ کے احباب نے بتایا کہ رضوان صاحب اس وقت مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ۔ وایونگ میں ایک خوبصورت مسجد جس میں ہم نے عشاء کی نماز پڑھی تھی، انہی کی تعمیر کردہ ہے جس کا نام انہوں نے ''مسجد القہار'' اس لئے رکھا ہے کہ ان کی استانی جن کی بدولت انہیں اسلام کی دولت نصیب ہوئی انڈونیشیا کے جس مدرسے میں پڑھاتی تھیں اس کا نام ''القہار'' تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور مصلی اپنی ایک فیکٹری کے ساتھ بنایا ہوا ہے، وہاں بھی پنج وقتہ نماز ہوتی ہے ۔ اگلی صبح ہم نے نمازِ فجر اسی مصلے میں ادا کی ۔

ناشتے کے بعد میرے میزبان مجھے سینٹرل کوسٹ کے ایک تفریحی مقام ''انٹرنس'' (Enterance) لے گئے یہ دراصل وہ جگہ ہے جہاں سے بحرالکاہل ایک خلیج کی شکل میں خشکی کے درمیان داخل ہوگیا ہے اور پھر کئی شاخوں میں تقسیم ہوکراس نے دریاؤں کی سی شکل اختیار کرلی ہے جن کے کنارے سرسبز وشاداب پہاڑیوں سے آباد ہیں۔ آسٹریلیا کا یہ مشرقی ساحل قدرتی مناظر سے مالا مال ہے جنہیں دیکھ کر انسان بیساختہ ''تبارک اللہ احسن الخالقین'' کہہ اٹھتا ہے ؎

اس آئنہ خانے میں سبھی عکس ہیں تیرے
اس آئنہ خانے میں تو یکتا ہی رہیگا

جاوید اکبر صاحب اس علاقے کے باا ثر اور دردمند مسلمان ہیں، وہ کچھ عرصے سے اس کوشش میں ہیں کہ آسٹریلیا کے قانونی نظام میں مسلمانوں کا پرسنل لاء حکومتی سطح پر منظور ہوجائے۔ اس سلسلے میں مشورے کے لئے وہ ایک مرتبہ میرے پاس کراچی بھی آئے تھے، انہوں نے اب تک اس سلسلے میں حکومتی اداروں سے جو خط وکتابت کی ہے اور جو مواد جمع کیا ہے وہ دکھانے کے لئے وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے اس مسئلے پر ان سے تبادلہ خیال ہوا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل طے کیا گیا۔ اتنے میں جمعہ کا وقت قریب آچکا تھا۔ ہم نے وایونگ کی مسجد ''القہار'' میں جمعہ ادا کیا جہاں میرا مختصر خطاب بھی ہوا۔

مغرب کے بعد ہم وایونگ سے روانہ ہوئے اور ساڑھے ۷ بجے کے قریب سڈنی پہنچے یہاں محترم سرور صاحب نے رات کے کھانے پر کچھ لوگوں کو جمع کیا ہوا تھا، وہاں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہم ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے جاتے جاتے ان حضرات نے گاڑی سڈنی کے مشہور ہاربر برج کے قریب سے نکال لی، اگرچہ دن کے وقت ہم یہ علاقہ دیکھ چکے تھے، لیکن رات کے وقت جگمگاتی ہوئی سربفلک عمارتوں اور سمندر میں پڑے ہوئے ان کے عکس کے پس منظر میں اس نظارے کا اور ہی لطف تھا۔

ایئرپورٹ پہنچے تو وہاں رضوان صاحب (جن کی طویل داستان میں نے ابھی بیان کی

ہے) بھی مجھے الوداع کہنے کے لئے پہنچے ہوئے تھے اور اس غرض کے لئے ایک طویل سفر طے کر کے آئے تھے، انہوں نے اپنے ایک تجارتی منصوبے کے بارے میں بھی مشورہ کیا۔ بالآخران تمام احباب کو الوداع کہہ کر میں ساڑھے ۹ بجے آسٹریلیا کی کوانٹس ایئر لائنز میں سوار ہوا۔ یہ پرواز پہلے میلبورن اتری اور ساڑھے ۱۲ بجے شب سنگاپور کے لئے روانہ ہوئی۔ معارف القرآن جلد پنجم کا جو کام میرے ساتھ تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ میلبورن سے روانہ ہونے تک تقریباً مکمل ہو گیا اور صرف چند صفحات رہ گئے۔ اس کے بعد میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو صبح صادق ہو چکی تھی اور جہاز نے سنگاپور کی طرف اترنا شروع کر دیا تھا صبح ٦ بجے جہاز سنگاپور اترا تو سنگاپور میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب توحید صاحب استقبال کے لئے موجود تھے، توحید صاحب سے میری پرانی شناسائی ہے مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ آج کل سنگاپور میں ہیں۔ سڈنی میں ہمارے قونصلیٹ نے سنگاپور کے ہائی کمیشن کو فیکس بھیجا تو توحید صاحب کو میرے آنے کا علم ہوا اور وہ ازراہِ محبت خود ہی استقبال کے لئے پہنچ گئے۔ میرے لئے یہاں ایک ہوٹل ایئر لائنز کی طرف سے بک تھا، مگر توحید صاحب کا اصرار ہوا کہ یہ چند گھنٹے ان کے مکان ہی پر گذارے جائیں، چنانچہ وہ اپنے گھر لے گئے جو سنگاپور کے مرکزی علاقے آرچرڈ میں واقع ہے۔ یہاں میں نے کچھ دیر آرام کیا اور معارف القرآن کے باقی ماندہ صفحات مکمل کئے۔ بعد میں توحید صاحب سنگاپور کے حالات بتاتے رہے، کہ اس ملک نے ۱۹٦۵ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد کتنی تیز رفتاری سے ترقی کی ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں۔ اسی گفتگو میں جہاز کا وقت ہونے لگا اور توحید صاحب کے ہمراہ میں دوبارہ ایئر پورٹ پہنچا، سنگاپور ایئر لائنز کا طیارہ ڈھائی بجے سہ پہر کراچی کے لئے روانہ ہوا، یہ پانچ گھنٹے کا سفر تھا اور میں نے اس کو آسٹریلیا کا یہ سفرنامہ لکھنے میں استعمال کیا۔ یہاں تک کہ پاکستانی وقت کے مطابق ہفتہ ٦ رمئی کی شام ساڑھے پانچ بجے بحمداللہ واپس کراچی پہنچ گیا۔



تاثرات

آسٹریلیا میں یہ نو دن ایسا لگا کہ پلک جھپکتے گذر گئے۔ میرے میزبانوں کو یہ شکوہ تھا اور مجھے بھی اس کا احساس رہا کہ آسٹریلیا جیسے ملک کے لئے نو دن کی مدت بہت کم ہے لیکن اس مختصر مدت میں بھی آسٹریلیا اور یہاں کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھنے سمجھنے کا کافی موقع ملا۔ ہر زبان اور ہر طبقہ فکر کے مسلمانوں نے میرے ساتھ جس محبت، گرمجوشی اور مہمان نوازی کا مظاہرہ کیا اُس کا نقش دل سے مٹایا نہیں جاسکتا۔ یہ حضرات مشکل حالات میں جس طرح اپنے اسلامی تشخص کو محفوظ رکھنے کی کوشش کررہے ہیں، وہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ دین کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کا شوق اور ان کی لگن کا مظاہرہ اس بات سے ہوتا ہے کہ میرے ہر خطاب میں لوگ بعض اوقات سینکڑوں کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے پہنچے۔ ہر شعبۂ زندگی کے نمایاں افراد نے یہ خطابات بڑے ذوق وشوق اور دلچسپی سے سنے اور انہیں کیسٹوں میں محفوظ کیا گیا۔ ہر خطاب کے بعد سوالات کے پرچوں کا ڈھیر یہ بتلاتا تھا کہ لوگ کتنی باریک بینی سے وہ مسائل دریافت کرتے ہیں جو بسا اوقات ہمیں اپنے ملک میں سننے میں نہیں آتے۔ خواتین اور نوعمر نوجوان بھی اس ذوق وشوق میں عمر رسیدہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں تھے۔

آسٹریلیا کے مسلمان ملکی سطح کی ایک بڑی تنظیم آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسلز (AFIC) سے منسلک ہیں اور اس تنظیم کا نیٹ ورک محلوں کی سطح تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ اس تنظیم میں کوئی لسانی یا مسلکی تفریق نہیں ہے، بلکہ ہر زبان بولنے والے اور ہر مسلک سے وابستہ مسلمان اپنے اجتماعی مسائل طے کرنے کے لئے متحد اور منظّم ہیں۔ اسی تنظیم کے تحت ملک بھر میں بہت سے تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم ہیں اور بحیثیت مجموعی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت کا کام ماشاء اللہ ہر ملک میں نمایاں نظر آتا ہے۔ آسٹریلیا میں بھی بفضلہ تعالیٰ اس کے مفید اثرات قدم قدم پر محسوس ہوتے ہیں۔ جماعت کی محنت نے نہ صرف آسٹریلیا بلکہ آس پاس کے اُن چھوٹے چھوٹے جزائر میں اسلام کی تبلیغ کی ہے جہاں کوئی کلمہ

گو مشکل سے دستیاب تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں دینی بیداری کی جو لہر نظر آتی ہے، اسے پیدا کرنے اور ترقی دینے میں تبلیغی جماعت کی کوششوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میلبورن کا دارالعلوم کالج جو آسٹریلیا میں اپنے طرز کا منفرد تعلیمی ادارہ ہے، درحقیقت تبلیغی جماعت ہی کے حضرات کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ان تمام کوششوں کے باوجود آسٹریلیا کے مسلمان بھی اُن مسائل کا شکار ہیں جو غیر مسلم ملکوں، بالخصوص مغربی ممالک میں مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا ہے۔ جب بچے ملک کے عام تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں تو وہاں کے ماحول سے اُن کا متاثر ہونا لازمی ہے اور اگر والدین ان کی خصوصی نگرانی نہ کریں، جو بہت ہی مشکل کام ہے، تو ان کے دین و ایمان اور اخلاق و اعمال کے تحفظ کا کوئی راستہ نہیں، چنانچہ جو والدین اس پہلو سے اپنی اولاد کی فکر نہیں کرتے، وہ اپنی اولاد کو ہاتھ سے کھو چکے ہیں، خاص طور سے لڑکیوں کا مسئلہ انتہائی سنگین ہے اور ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ لڑکیوں نے غیر مسلموں سے شادی رچالی اور والدین دیکھتے رہ گئے۔ اس مسئلے کا کوئی حل اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلمان اپنے تعلیمی ادارے خود قائم کریں اور بچوں کو ابتدا ہی سے اسلامی ماحول فراہم کیا جائے۔ میں ان تمام ممالک میں اس ضرورت پر زور دیتا رہا ہوں اور یہ عرض کرتا رہا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ بفضلہ تعالیٰ بہت سے مقامات پر لوگوں نے اس طرف توجہ کی ہے اور آسٹریلیا میں یہ فکر میں نے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کی ہے، لیکن ابھی تک مسلمانوں کے اپنے تعلیمی اداروں کی تعداد ضرورت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ تاہم اس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک نکاح، طلاق اور وراثت کے بارے میں اُن کا پرسنل لاء ان ملکوں میں منظور شدہ نہیں ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سے خاندان شدید پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ ہمارے ملک میں تقریباً ہر مذہب کے لوگوں کا پرسنل لاء منظور شدہ ہے اور جن مذاہب کے لوگ بہت قلیل تعداد میں ہیں، اُن کے نکاح وطلاق وغیرہ فیصلے
انہی کے مذہب کے لوگ بہت قلیل تعداد میں ہیں، اُن کے نکاح وطلاق وغیرہ کے فیصلے انہی

کے مذہب کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن یہ ممالک جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں، اور اپنے آپ کو مذہبی آزادی کا علمبردار قرار دیتے ہیں، وہ اپنے باشندوں کی اتنی بڑی تعداد کو ابھی تک یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ ان کے نکاح وطلاق اور وراثت کے فیصلے ان کے مذہب کے مطابق انجام دیئے جائیں۔ میں نے آسٹریلیا کے بعض بااثر مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی حکومت کو اس ضرورت کی طرف توجہ دلائیں اور جس طرح ماریشس اور ہندوستان وغیرہ میں مسلمانوں کا پرسنل لاء منظور شدہ ہے، اس طرح یہاں بھی اسے منظور کرایا جائے۔ اس سلسلے میں کچھ ابتدائی کارروائی شروع بھی ہوگئی ہے۔

الحمدللہ مسلمانوں کی معاشی حالت آسٹریلیا میں بحیثیت مجموعی اچھی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ وہاں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن میں اپنا یہ تأثر وہاں بھی ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکا کہ اپنا ملک ہزار خرابیوں کے باوجود، اپنا ملک ہے۔ دوسرے ملک میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت میں انسان سونے چاندی سے کھیل سکتا ہے۔ مگر قلب وضمیر کا وہ سکون حاصل کرنا بہت مشکل ہے جو ایک مانوس فضا میں رہ کر حاصل ہوتا ہے۔

ملائشیا میں چند روز



ملائشیا میں چند روز

پچھلے چند مہینے متواتر بیرونِ ملک سفروں میں مشغولیت رہی، اس لئے اس کالم سے غیر حاضری خاصی طویل ہوگئی، جن قارئین نے اس غیر حاضری کو محسوس فرما کر خطوط یا ٹیلی فون کے ذریعے یاد کیا، ان کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

متعدد سفروں کے بعد آخر میں ایک ہفتہ مجھے ملائشیا میں گذارنے کا موقع ملا، میں تقریبا پانچ سال پہلے بھی ملائشیا گیا تھا، لیکن اس تازہ سفر میں ماشاء اللہ اس ملک کی ترقی کی جو رفتار دیکھی، اور مختلف میدانوں میں اسکی قابل تعریف پیش قدمی کا جو انداز نظر آیا، دل چاہتا ہے کہ قارئین اس سے باخبر ہوں، اسلئے اس مرتبہ کچھ گذارشات اسی ملک کے بارے میں پیش خدمت ہیں۔

ملائشیا جنوبی ایشیا کا ابھرتا ہوا اسلامی ملک ہے، پہلے وہ ملایا کے نام سے مشہور تھا، اور چودھویں پندرھویں صدی عیسوی میں وہ عالم اسلام کا زریں حصہ سمجھا جاتا تھا، لیکن سولہویں صدی کے بعد وہ پہلے پرتگیزی، پھر ڈچ اور آخر میں انگریزی استعمار کا شکار ہوا، اور انگریزی سامراج سے اسکو ۱۹۵۷ء میں، یعنی ہماری آزادی کے دس سال بعد رہائی نصیب ہوئی، تیرہ ریاستوں یا صوبوں پر مشتمل اس ملک نے آزادی کے بعد ایک وفاقی پارلیمانی دستور بنایا جس کی دفعہ ۳ میں یہ صراحت کی گئی کہ وفاق کا مذہب اسلام ہوگا، البتہ دوسرے مذاہب پر بھی پرامن طریقے پر عمل کیا جاسکے گا، وفاق میں شامل تیرہ ریاستوں میں سے ہر ریاست کی نظریاتی اور دستوری سربراہی اس ریاست کا سلطان کرتا ہے، اور یہ تیرہ سلاطین (جو موروثی ہیں) اپنے آپ میں سے کسی ایک شخص کو پانچ سال کے لئے وفاق کا سلطان منتخب کرتے ہیں جو وفاق کا

آئینی سربراہ ہوتا ہے، لیکن برطانیہ کی بادشاہت کی طرح یہ سلاطین بھی محض آئینی سربراہ ہوتے ہیں، ان کا مسلمان ہونا ضروری ہے، اور یہ اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہوئے عربی کے باقاعدہ قسم کے الفاظ واللہ، باللہ، تاللہ کہہ کر یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ دین اسلام کا تحفظ کریں گے، لیکن انتظامیہ کی سربراہی وزیر اعظم کرتا ہے، جو سلطان کی طرف سے نامزد ہوتا ہے، بشرطیکہ اسکی رائے میں اسے پارلیمنٹ کا اعتماد حاصل ہو، ملائشیا میں بہت سی قومیں آباد ہیں جن میں ۵۰ فی صد سے زائد ملاوی نسل کے لوگ ہیں، اوران کے بعد آبادی کا دوسرا بڑا حصہ چینی نسل کے لوگوں کا ہے جو اکثر غیر مسلم ہیں، خود ملاوی نسل کی آبادی بھی مختلف نسلی اور جغرافی حصوں میں بٹی ہوئی ہے، لیکن آبادی کے ان مختلف طبقات میں نہ کوئی ایسی کشمکش ہے جو ملک کے استحکام کے لئے خطرہ ہو، نہ ان میں سے کسی کو محرومی کی کوئی نمایاں شکایت نظر آتی ہے، جو باہمی نفرتوں اور عداوتوں کا سبب بنے، آزادی کے فوراً بعد کچھ عرصے اس قسم کی کشمکش جاری رہی، لیکن بالآخر ایک مستحکم نظام حکومت نے ان مسائل پر بڑی حد تک قابو پالیا، اور خاص طور پر ۱۹۷۰ء کے بعد ملک تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کررہا ہے، ابتدا میں ملائشیا کو تنکو عبد الرحمٰن کی قیادت میسر آئی جس نے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر ڈالا، اور اب وزیر اعظم مہاتیر محمد کی قیادت میں پوری قوم تندہی اور لگن کے ساتھ ایک بہتر مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے، چند سال پہلے جب میں ملائشیا گیا تو وہاں کی حکومت نے عوام کو یہ ولولہ انگیز ہدف دیا ہوا تھا کہ ہم ۲۰۲۰ء تک مکمل طور پر ترقی یافتہ ملک بننا چاہتے ہیں، اب پانچ سال بعد میرا ملائشیا جانا ہوا تو واقعی کوالالمپور کی دنیا بدلی ہوئی نظر آئی، تیز رفتار ترقیاتی کام ہر شخص کو کھلی آنکھوں نظر آتا ہے، اس عرصے میں اس ملک نے صنعتی میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، اور وہ اپنی مصنوعات کے ذریعہ جاپان اور کوریا کا مقابلہ کررہا ہے، تعلیم کی شرح اسی فیصد سے بھی زائد ہوچکی ہے، عوام کے مزاج میں نظم وضبط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کوالالمپور شہر اب ہانگ کانگ اور سنگاپور سے زیادہ خوبصورت اور صاف ستھرا بنادیا گیا ہے، اس وقت دنیا کی بلند ترین عمارت (جو بلندی میں شکاگو کے سیئرس ٹاور سے بھی زیادہ ہے) کوالالمپور ہی میں زیر تعمیر ہے (یہ دو

سربفلک عمارتوں کا مجموعہ ہے، جنہیں درمیان میں ایک خوبصورت پل کے ذریعے ملایا گیا ہے، ان عمارتوں کا ڈھانچہ مکمل ہو چکا ہے، اور اب یہ تحسین وتزیین کے مرحلے میں ہیں) ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کیلئے زیر زمین ٹرین کے منصوبے پر کام شروع ہو چکا ہے۔

معاشی اور مادی ترقی کے ساتھ ملائشیا نے اپنے دین ومذہب سے بھی رشتہ نہ صرف قائم رکھا ہوا ہے بلکہ اسے مزید مضبوط کرنے کی فکر جاری ہے، اگر چہ ملائشیا کی تقریباً چالیس فیصد آبادی غیر مسلم ہے، اور مسلمانوں کا تناسب بمشکل ساٹھ فی صد ہے، اور چالیس فی صد غیر مسلم آبادی میں ان چینی نسل کے باشندوں کا بڑا حصہ ہے، جو ملکی تجارت وصنعت پر اپنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں، لیکن اسکے باوجود معاشی اور سماجی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی تنفیذ پر خاصی سنجیدگی سے کام ہورہا ہے، اور حکومت کی طرف سے اس سمت میں بھی برابر پیش قدمی جاری ہے۔

مجھے اس مرتبہ ,,سیکیورٹیز کمیشن،، نے مدعو کیا تھا، یہ کمیشن ملک کے مرکزی بینک کا ایک ذیلی ادارہ ہے، جو ہر قسم کی مالی کفالتوں کی نگرانی کرتا ہے، حکومت نے ایسی پالیسیاں اپنائی ہوئی ہیں جن کے تحت وہ بتدریج غیر سودی معیشت کی طرف بڑھ رہی ہے، اسی لئے سیکیورٹیز کمیشن نے اسلامی کیپٹل مارکیٹ کے موضوع پر ایک محفل مذاکرہ منعقد کی تھی، جس میں بحث کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ایک اسلامی مالیاتی بازار کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے؟ اس میں کس قسم کی دستاویزات جاری کی جاسکتی ہیں؟ اور خاص طور پر ملائشیا اس کام میں کیا کردار ادا کرسکتا ہے؟ مذاکرے کا افتتاح ملک کے ڈپٹی پرائم منسٹر الحاج انور ابراہیم نے کیا جو اپنی علم دوستی اور دینی رجحان کے لئے مشہور ہیں، اور وزیر اعظم مہاتیر محمد کے بعد ملک کی دوسری اہم شخصیت ہیں (بعض لوگ انہیں مستقبل کا وزیر اعظم بھی کہتے ہیں) عرب دنیا سے ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور پاکستان سے راقم الحروف کو خصوصی طور پر ہماری ذاتی حیثیت میں مدعو کیا گیا تھا، سیکیورٹیز کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منیر عبد المجید نے اپنی کلیدی تقریر میں ملائشیا میں غیر سودی بینکاری کی مختصر تاریخ بیان کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۹۸۰ء کے بعد سے ملائشیا میں اسلامی بینکاری کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی، اور بینک اسلام کے نام سے ایک ایسا بینک قائم کیا گیا جو سود کے بجائے

فنانسنگ کے اسلامی طریقوں کی بنیاد پر کام کر رہا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک قانون کے ذریعے اسلامی بینکوں کے قیام کے لئے گنجائش پیدا کی گئی، اور کمرشل بنکوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اسلامی بینکاری کے لئے علیحدہ کھڑکیاں (Windows) یا برانچیں قائم کریں، چنانچہ اب ملک کے بہت سے کمرشل بینکوں نے روایتی بینکاری کے ساتھ ساتھ اسلامی طریق کار کے مطابق کام کرنے والی برانچیں یا کھڑکیاں قائم کی ہوئی ہیں، ان بینکوں کی نگرانی کے لئے علماء پر مشتمل شریعہ بورڈ بھی قائم ہیں جو بینکوں کے معاملات کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے اور انہیں شرعی رہنمائی فراہم کرتے ہیں، سیکیورٹیز کمیشن کے چیئر مین نے کہا کہ شروع میں ہمیں یہ خطرہ تھا کہ بینکاری کے مسائل چونکہ عہد جدید کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور خاصے پیچیدہ ہیں، اس لئے ہمیں اپنے قدیم فقہی ذخیرے سے ان کے بارے میں مناسب رہنمائی ملنا مشکل ہوگا، لیکن اس سمت میں عملی پیش قدمی کے نتیجے میں ہم نے دیکھا کہ عالم اسلام کے شریعہ اسکالرز نے جدید مسائل کو قرآن وسنت اور فقہی ذخیرے کی روشنی میں ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا ہے، جس کے نتیجے میں اسلامی اصولوں پر مبنی نئی تحقیقات تیز رفتاری سے سامنے آرہی ہے، انہوں نے اس سلسلے میں عالم اسلام کے بہت سے علماء اور محققین کی تحریروں کا ذکر کیا، جنہوں نے ان کی رائے میں علمی تحقیق کے نئے افق کھولے ہیں، ان حوالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ حضرات اسلامی معیشت کے موضوع پر معاصر اہل علم کی تحریروں کا خاصی جُزرسی سے مطالعہ کر رہے ہیں، اسی ضمن میں انہوں نے میرے ایک انگریزی مقالے کے اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے، یہ مقالہ میں نے پانچ سال پہلے ملائشیا کے مرکزی بینک کے زیر اہتمام ایک سیمینار میں پیش کیا تھا، اور وہ بنیادی طور پر ,,محدود ذمہ داری،، (Limited Liability) کے موضوع پر تھا، معلوم ہوا کہ اسے یہاں کے علمی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی وہ یہاں بڑے پیمانے پر شائع ہوا، اور اب اس کا ملاوی زبان میں ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔

مذاکرے کے بعد ہمارے میزبانوں نے ملائشیا کے بعض اہم اداروں کا معائنہ کرایا، بینک نگارا ملائشیا کا سنٹرل بینک ہے اس کے ڈپٹی گورنر نے اپنے بینک کی ان کوششوں کی تفصیل

بتائی جو وہ ملک میں اسلامی بینکاری کے فروغ کے لئے کررہا ہے، انہوں نے ایک اہم بات یہ بتائی کہ اس وقت اگر چہ ہر اسلامی بینک کا اپنا ,,شریعہ بورڈ،، ہے جو اسے شرعی معاملات میں رہنمائی فراہم کرتا ہے، لیکن مرکزی بینک کا کوئی اپنا ,,شریعہ بورڈ،، نہیں ہے جو اسے مختلف اسلامی بینکوں سے معاملات انجام دینے میں شرعی رہنمائی فراہم کرے، اس لئے اب ایک ایسا بورڈ خود مرکزی بینک میں قائم کیا جارہا ہے، اور اس غرض کے لئے مرکزی بینک کے قانون میں ایک ترمیم مئی کے مہینے میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

سرکاری سطح پر زکوۃ کی فراہمی اور تقسیم کے لئے بھی ایک ادارہ قائم ہے، اس ادارے میں بھی حاضری ہوئی، ادارے کے سربراہ نے بتایا کہ پرائم منسٹر سیکریٹریٹ میں ایک شعبہ ,,مجلس الشئون الاسلامیہ،، (مجلس امور اسلامی) کے نام سے قائم ہے، یہ اس مذہبی امور کے ادارے سے الگ حیثیت رکھتا ہے جو اکثر ملکوں میں پایا جاتا ہے، اور اس میں تمام مذاہب کے امور کی نگرانی اور تنظیم کی جاتی ہے، ,,مجلس الشئون الاسلامیہ،، کا مقصد خاص طور پر اسلامی شعائر کی ترویج اور فروغ ہے، اسی شعبے کی طرف سے زکوۃ کا مرکز قائم کیا گیا ہے، یہ مرکز ۱۹۹۱ء میں قائم کیا گیا، اسکے تحت زکوۃ کی وصولیابی جبری تو نہیں ہے، لیکن جو لوگ اس ادارے کے ذریعہ زکوۃ ادا کرنا چاہیں ان کو یہ ادارہ زکوۃ کے حساب وکتاب اور ادائیگی کی سہولیات فراہم کرتا ہے، اس ادارے کی طرف سے کتابچوں، اخباری مضامین اور ریڈیو ٹی وی کے ذریعے زکوۃ کی اہمیت عوام پر واضح کی جاتی ہے، بروقت زکوۃ ادا کرنے کی ضرورت اور اسکے فوائد وفضائل سے آگاہ کیا جاتا ہے، نیز جو حضرات ادائے زکوۃ کے لئے اس ادارے کے رکن بن جائیں ان کا زکوۃ کھاتہ کھول دیا جاتا ہے، کمپیوٹر کے ذریعے ان کی زکوۃ کا حساب رکھا جاتا ہے، اور یہ سہولت بھی فراہم کی گئی ہے کہ جو لوگ چاہیں وہ اپنی تنخواہوں کا کچھ حصہ ہر ماہ زکوۃ کی مد میں اس ادارے کو فراہم کرتے رہیں، کمپیوٹر کے ذریعے ان ادائیگیوں کا حساب رکھا جاتا ہے، اور سال کے ختم پر اسکا مکمل اکاؤنٹ پیش کردیا جاتا ہے، جن لوگوں کا زکوۃ کا سال پورا ہوجائے، انہیں یہ ادارہ یاد دھانی کراتا ہے کہ وہ زکوۃ ادا کردیں، ادارے کی طرف سے ایسی گائیڈ بک بھی شائع کی گئی ہے

جس کی مدد سے ہر مسلمان اپنے قابلِ زکوۃ اثاثوں کی زکوۃ کا تعین کر سکے، اگر چہ ایک ایسا قانون بھی موجود ہے جس کی رو سے جو مسلمان زکوۃ ادا نہ کرے، اسے قید یا جرمانے کی سزا دی جاسکتی ہے، لیکن عملاً ایسی سزا کسی کو دی نہیں جاتی، کیونکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ کسی شخص نے زکوۃ کہیں بھی ادا نہیں کی، نیز فی الحال سرکاری حلقوں نے ترغیب کے ذرائع استعمال کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

۱۹۹۴ء میں اس مرکز کے توسط سے ملک بھر سے ایک سو پچپن ملین ملیشین ڈالر (رنگیٹ) زکوۃ وصول ہوئی جس میں سے ۳۵ ملین صرف کوالالمپور سے حاصل ہوئی تھی، مرکز زکوۃ یہ رقوم حاصل کرنے کے بعد خود خرچ نہیں کرتا بلکہ محکمۂ اسلامی امور کے تحت قائم شدہ زکوۃ فنڈ میں جمع کرا دیتا ہے، اس فنڈ کے تحت ہر صوبے میں تقسیم زکوۃ کا الگ نظم قائم ہے، جس کے ذریعہ مستحقین کو نقد امداد کے علاوہ پیشہ ورانہ آلات وغیرہ فراہم کئے جاتے ہیں۔

حکومت ملائشیا کا ایک عظیم کارنامہ جس کی پورے عالم اسلام میں کوئی مثال نہیں ملتی اسکا قائم کردہ ادارۂ حج ہے، جو نہ صرف ملیشیا کے مسلمانوں کو صاف ستھرے اور منظم انداز میں حج کرنے کی بہترین سہولیات فراہم کرتا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ وہ ملک کی معاشی ترقی اور حاجیوں کی بہبود میں قابل تقلید کردار ادا کر رہا ہے، اس ادارے کی سبق آموز کہانی یہ ہے کہ ۱۹۵۹ء میں یونیورسٹی آف ملایا کے ایک ماہر معاشیات انگ کو عزیز کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ملیشیا کے مسلمانوں کو حج کرنے کا بڑا ذوق ہے، اور وہ حج کی خاطر اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ ہر سال اپنی آمدنی سے بچا کر اپنی صندوقچیوں میں محفوظ کرتے ہیں، حج کی خاطر جمع کی ہوئی یہ انفرادی بچتیں سالہا سال صندوقچیوں میں ست (idle) پڑی رہتی ہیں، چونکہ حج کیلئے رقم جمع کرنے والے بینک کے سود سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے وہ یہ رقمیں بینکوں میں جمع نہیں کراتے، اور اس طرح ان بچتوں کا نہ ان کو کوئی مالی فائدہ پہنچتا ہے، اور نہ ان سے ملک کی معاشی سرگرمیوں کو کوئی سہارا ملتا ہے، انگ کو عزیز کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی ادارہ ان بچتوں کو یکجا کرکے انہیں ایسے تجارتی اور نفع بخش منصوبوں میں استعمال کرے جو شرعی اعتبار سے حلال

ہوں تو ایک طرف ان منصوبوں کا نفع حاجیوں میں تقسیم کر کے ان کو جلد از جلد حج ادا کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے، اور دوسری طرف ان تجارتی اور پیداواری منصوبوں سے ملکی معیشت کو فروغ ہوسکتا ہے، انگ کو عزیز نے اس خیال کی بنیاد پر ایک ایسے مالیاتی ادارے کا خاکہ تیار کیا جو لوگوں کی حج کے لئے جمع کی ہوئی رقوم کو جمع کر کے ان کو نفع بخش کاروبار میں لگائے، یہ خاکہ اس نے ایک ورکنگ پیپر کے طور پر حکومت کو پیش کیا، حکومت نے اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے ۱۹۶۲ء میں ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام "Malayan Muslim Pilgrim Saving Corporation" تھا، اس ادارے نے یہ بات طے کی کہ حاجیوں سے انکی بچتیں وصول کر کے انہیں صرف ایسے نفع بخش منصوبوں میں لگایا جائیگا جو شرعی اعتبار سے جائز اور حلال ہوں، جب تقریباً چھ سال تک یہ ادارہ کامیابی سے چلتا رہا تو ۱۹۶۹ء میں اسے ادارۂ حج کے ساتھ ضم کردیا گیا، اب یہ وزارت حج کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا نام ,,تابونگ حاجی،، ہے اور اسکی سر بفلک عمارت کوالالمپور کی خوبصورت ترین عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

ادارے کا طریقِ کار یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو حج کے لئے رقم جمع کرنا چاہتا ہو، اپنی بچت اس ادارے میں جمع کراسکتا ہے، اگر وہ چاہے تو اسکی تنخواہ سے بھی اسکی متعین کی ہوئی رقم ہر ماہ کٹ کر ادارے میں جمع ہوسکتی ہے، ادارے میں رقم جمع کرانے کیلئے یہ سہولت بھی موجود ہے کہ ہر شخص اپنے قریبی ڈاکخانے میں پیسے جمع کرادے، وہاں سے وہ ادارے کے اکاؤنٹ میں پہنچ جاتی ہے، ان جمع شدہ رقوم سے شرعی طور پر جائز کاروبار میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے، اور اسکے نتیجے میں جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ رقم جمع کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے، نفع کا ایک حصہ دوبارہ کھاتہ دار کے اکاؤنٹ میں جمع ہوکر مزید نفع بخش کاروبار میں لگ جاتا ہے، اور ایک حصہ بونس کی شکل میں کھاتہ دار کو نقد دیدیا جاتا ہے، اگر وہ چاہے تو اسے اپنی دوسری ضروریات میں استعمال کرے، اور اگر چاہے تو اسکو بھی حج کھاتے میں جمع کرادے، اس طرح جب کسی کھاتہ دار کی اتنی رقم کھاتے میں جمع ہوجاتی ہے جس سے وہ حج کرسکے تو اب حج کے تمام مراحل کا انتظام ,,تابونگ حاجی،، کے ذمہ ہوتا ہے، یہی ادارہ کھاتے دار کے پاسپورٹ

ویزاوغیرہ کا انتظام کرتا ہے، یہی ہر کھاتہ دار کو حج کی بہترین تربیت دینے کا انتظام کرتا ہے، یہی ادارہ کھاتہ دار کے وطن سے لے کر حرمین شریفین تک اور وہاں سے واپس وطن تک سفر کے اعلی انتظامات کرتا ہے، مقاماتِ مقدسہ میں قیام وطعام، علاج معالجے اور حجاج کی دوسری تمام ضروریات کی دیکھ بھال اسی ادارے کے ذمے ہے، جدہ ائیر پورٹ پر اس ادارے کے نمائندے حاجیوں کا استقبال کرتے اور ان کے سفر کے تمام مراحل بذاتِ خود پورے کراتے ہیں، منی، عرفات اور مزدلفہ میں قیام اور مناسک کی ادائیگی کی نگرانی کرتے ہیں۔ نقل وحرکت کے لئے اچھی سواریوں کا انتظام کرتے ہیں، غرض ملائشیا کے حجاج کو انتہائی نظم وضبط کے ساتھ کامیابی سے حج کراتے ہیں۔

یہ بات حج اور عمرے کے دوران ہر کس وناکس کے مشاہدے میں آتی ہے کہ دنیا بھر سے آئے ہوئے بھانت بھانت کے حاجیوں میں ملائشیا کے حجاج کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ سب سے زیادہ منظّم اور باوقار نظر آتے ہیں، نہ وہ کبھی کسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں، نہ دھکا پیل میں ان کا کوئی حصہ ہوتا ہے۔ نہ وہ کبھی لڑتے بھڑتے یا بلند آواز سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں، اسکے بجائے وہ نہایت پرسکون اور منظّم طریقے پر خاموشی سے اپنی عبادات ادا کرتے ہیں، اور اسی نظم وضبط کے ساتھ رخصت ہوجاتے ہیں۔ ملائشیا کے حجاج کا یہ امتیاز جہاں انکی طبعی نرمی اور شرافت کا نتیجہ ہے، وہاں اس میں ,,تابونگ حاجی،، کی دی ہوئی تربیت اور اسکے بنائے ہوئے نظام کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔

,,تابونگ حاجی،، کے ذمہ داروں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں حج کی کوئی تعداد بھی مقرر نہیں ہے، بلکہ ایک شخص جتنی مرتبہ چاہے حج کرسکتا ہے۔

,,تابونگ حاجی،، میں عازمین حج کی جو رقوم جمع ہوتی ہیں ان کا استعمال کس حسنِ کارکردگی کے ساتھ کیا گیا ہے، اسکا کچھ اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ان رقوم سے ,,تابونگ حاجی،، نے مندرجہ ذیل سات بڑی تجارتی کمپنیاں قائم کی ہیں جو سو فی صد ,,تابونگ حاجی،، کی ملکیت ہیں۔

(۱) پلانٹیشن کارپوریشن (اداشدہ سرمایہ ۵ کروڑ ڈالر) جس نے چالیس ہزار ایکڑ رقبے پر پام اور کوکو کی کاشت کی ہے، اور پام آئل کے دو مل قائم کئے ہیں۔

(۲) صباح پلانٹیشن کارپوریشن (اداشدہ سرمایہ تقریبا پچیس ملین ڈالر) جس نے نو ہزار چھ سو دو ایکڑ کے رقبے پر پام اور کوکو کی کاشت کی ہے۔

(۳) پلانٹیشن ہولڈنگ (اداشدہ سرمایہ تقریبا چھبیس لاکھ ڈالر) جس نے دو ہزار پانچ سو اکتیس ایکڑ کے رقبے پر پام کی کاشت کی ہے۔

(۴) جنرل ٹریڈنگ کمپنی (اداشدہ سرمایہ دو ملین ڈالر) جو ٹکٹ ایجنسی اور عمومی تجارت کرتی ہے۔

(۵) کنسٹرکشن اینڈ ہاؤسنگ کمپنی (اداشدہ سرمایہ بیس ملین ڈالر) جو تعمیرات اور پراپرٹی ڈیولپمنٹ کی خدمات انجام دیتی ہے۔

(۶) پراپرٹی مینجمنٹ کمپنی (اداشدہ سرمایہ دو لاکھ ڈالر)

(۷) پروجیکٹ مینجمنٹ کمپنی (اداشدہ سرمایہ دس ملین ڈالر)

یہ سات کمپنیاں (جنکا مجموعی اداشدہ سرمایہ تقریبا ایک سو نو ملین ملیشین ڈالر ہے) تمام وکمال ادارۂ حج کی ملکیت ہیں، اور ان کا تمامتر نفع ادارے کے ذریعے کھاتے داروں کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی انیس بڑی کمپنیوں میں ,,تابونگ حاجی،، کے شیئرز کی ایک بہت بڑی تعداد ہے، ان میں سے بہت سی کمپنیاں ایسی ہیں جن کی دس فی صد سے زائد شیئر ہولڈنگ ,,تابونگ حاجی،، کی ہے، اور ان کے بورڈ میں ,,تابونگ حاجی،، کی نمائندگی موجود ہے، اس کے علاوہ سفرِ حج کے سلسلے کی تمامتر خدمات یہی ادارہ تجارتی بنیاد پر انجام دیتا ہے، ملک بھر میں اس ادارے کے سوا کسی اور کو سفر حج کا انتظام کرنے کی اجازت نہیں ہے، لہذا حجاج کے سفر کی خدمات سے جو آمدنی ہوتی ہے، وہ بھی ادارے کے ذریعے کھاتہ داروں ہی میں تقسیم ہوتی ہے، اس کے علاوہ یہ ادارہ مختلف جائیدادیں بھی خریدتا بیچتا رہتا ہے، اور اسکے ذریعے بھی نفع کماتا ہے، نیز یونٹ ٹرسٹ کے ذریعے دوسری کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت سے بھی

اسے قابل لحاظ نفع ہوتا ہے، اور مجھ سے ایک معروف بینک کے چیف ایگزیکیٹو نے ایک عشائیہ کے دوران یہ اعتراف کیا کہ ملک بھر میں کوئی بینک یا کوئی مالیاتی ادارہ اپنے کھاتہ داروں میں اتنا نفع تقسیم نہیں کرتا جتنا نفع ,,تابونگ حاجی،، تقسیم کرتا ہے۔

۱۹۹۴ء کے آخری مطبوعہ اعداد وشمار کے مطابق اس وقت کھاتہ داروں کی تعداد پچیس لاکھ سینتیس ہزار تھی، اور ,,تابونگ حاجی،، کے تمام نفع بخش منصوبوں سے حاصل ہونے والا مجموعی نفع (ٹیکس منہا کرنے کے بعد) اکیس کروڑ بیالیس لاکھ باون ہزار ملیشین ڈالر تھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عظیم الشان منصوبے نے نہ صرف حج کرنے والوں کو، بلکہ پوری ملکی معیشت کو کتنا بے مثال نفع پہنچایا ہے۔

''تابونگ حاجی'' کی عظیم الشان عمارت کے آڈیٹوریم میں جب ایک ریکارڈ کی ہوئی تقریر ہمیں اس ادارے کی کارکردگی کی تفصیل بتارہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ حج کے ادارے سے حاصل ہونے والے یہ نتائج اس ملک کے ہیں جس کی آبادی سوا کروڑ سے زیادہ نہیں ہے، اگر زیادہ آبادی والے مسلمان ملک، مثلاً پاکستان جس کی آبادی تیرہ کروڑ کے قریب ہے، اور جہاں حج کرنے والوں کی تعداد ملائشیا کے حجاج سے کہیں زیادہ ہے، اگر اسی قسم کے منصوبے اپنا لیں تو اس سے نہ صرف فریضہ حج کی ادائیگی آسان ہو جائے، بلکہ یہ منصوبہ ملک کی معاشی ترقی میں بھی کتنا بڑا کردار ادا کرے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کانوں میں رپورٹ دینے والے مقرر کی یہ آواز سنائی دی ,,ہم دوسرے برادر مسلم ملکوں کو یہ پیشکش کر چکے ہیں کہ اگر وہ اپنے یہاں اسی قسم کے ادارے قائم کریں تو ,,تابونگ حاجی،، اپنے تجربات کی روشنی میں ان سے تعاون کر کے خوشی محسوس کرے گا، البتہ اس منصوبے سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے خلوص، دوسرے محنت اور لگن اور تیسرے امانت اور دیانت انتہائی ضروری ہے،، دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی کہ اللہ تعالی ہمارے ملک کو بھی یہ تین بنیادی نعمتیں عطا فرمادے تو ہمارے دن بدل جائیں۔

,,تابونگ حاجی،، کے بعد ہم کوالالمپور کی عالمی اسلامی یونیورسٹی بھی گئے اس یونیورسٹی

میں اس وقت نوے ملکوں کے دس ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں، چالیس مختلف ملکوں کے اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور تمام مروجہ علوم کے ساتھ اسلامی علوم کی تعلیم کا انتظام بھی ہے، تعلیم کے مجموعی ماحول میں اسلامی مزاج و مذاق کی آبیاری کی کوشش کی جاتی ہے، اور منتظمین کا کہنا ہے کہ یہاں تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے اب اس یونیورسٹی کا نیا کیمپس تیاری کے مراحل تیزی سے طے کر رہا ہے یہ کیمپس تین ہزار ایک سو پچاس مربع کیلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے، اور اسکی تعمیر پر چار سو ملین امریکی ڈالر کی لاگت آ رہی ہے، اسکے ہاسٹل میں پندرہ ہزار طلبہ کی رہائش کا انتظام ہے، ایک ہزار رہائشی یونٹ شادی شدہ طلبہ کے لئے رکھے گئے ہیں، اور اسکی لائبریری دس لاکھ کتابوں پر مشتمل ہوگی، یونیورسٹی کے معائنے کے دوران شعبۂ اسلامی معاشیات کے طلبہ، اساتذہ اور اسکالروں سے خطاب کا بھی موقع ملا، اور خطاب کے بعد طلبہ کے سوالات سے ان کی علمی دلچسپی کا مظاہرہ ہوا۔

یہ ان چند نمایاں اداروں کا مختصر تذکرہ تھا جو حالیہ سفر ملائشیا کے دوران مجھے دیکھنے کا موقع ملا، ہر ادارے میں یقیناً بہت سی باتیں قابلِ تنقید بھی پائیں، اور اصلاحات کی بھی بڑی گنجائش نظر آئی، لیکن بحیثیت مجموعی ملائشیا جس رخ پر جا رہا ہے، وہ بڑی حد تک امید افزا اور عالمِ اسلام کے کے لئے موجب اطمینان ہے، یہ ملک ہم سے دس سال بعد آزاد ہوا، لیکن اس کی ترقی کی رفتار ہمارے لئے قابل رشک ہے، کوئی شک نہیں کہ اسکی آبادی ہمارے مقابلے میں بہت کم اور وسائل خاصے زیادہ ہیں، اور اس ترقی کے عوامل میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس سے بڑی وجہ ملک کا سیاسی استحکام، فعال اور مدبر قیادت، اور قومی یکجہتی ہے، یہاں بھی مختلف قومیتیں آباد ہیں، یہاں بھی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، یہاں بھی مختلف مذاہب کے لوگ مقیم ہیں، یہاں بھی سیاسی پارٹیاں اپنے الگ الگ منشور کے ساتھ موجود ہیں، لیکن اختلافات خواہ سیاسی ہوں یا نسلی، مذہبی ہوں یا فرقہ وارانہ، نہ وہ باہمی منافرت و عداوت کی شکل اختیار کرتے ہیں، اور نہ ملک کے وسیع تر مفادات کی راہ میں ان سے کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک سفر



دسمبر ۱۹۹۷ء

ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک سفر

اکتوبر کے اوائل میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون (ہارورڈ لا اسکول) کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا۔ جس میں مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں دسمبر تک اپنی سہولت کے مطابق کسی تاریخ میں ہارورڈ آؤں' اور اسلامی قانون کے کسی پہلو پر لیکچر دوں۔ اگر چہ موضوع کا حتمی انتخاب انہوں نے مجھ پر چھوڑا تھا' لیکن اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ یہ سال پاکستان کی گولڈن جوبلی کا سال ہے لہٰذا اگر میرا موضوع ''پاکستان اور اسلامی قانون'' ہو تو سامعین کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

میں نے یہ دعوت قبول کرتے ہوئے لیکچر کے لیے ۴/دسمبر کی تاریخ متعین کر دی۔ اس تاریخ کے تعین کے چند روز بعد مجھے ہارورڈ لا اسکول کے پروفیسر فرینک ووگل (Prof.Frank Vogel) کا پیغام موصول ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ ہارورڈ بزنس اسکول کے تعاون سے ۳/دسمبر کو ''اسلامک فائنانس'' کے موضوع پر منتخب لوگوں کا ایک ورکشاپ بھی منعقد کریں' اور آپ اس کے مہمان خصوصی ہوں۔ میں نے یہ دعوت بھی منظور کر لی' اور یکم دسمبر ۹۷ء کو امریکہ روانگی کا پروگرام بنالیا۔ یہ پروگرام اگر چہ کافی پہلے طے ہو گیا تھا لیکن جب سفر کا وقت قریب آیا تو یہ وہ وقت تھا جب ملک میں آئینی بحران اپنے شباب پر تھا' اور ملک میں پیش آنے والے نادرہ روزگار واقعات کا تماشا دنیا دیکھ رہی تھی۔ ایسے وقت میں ایک طرف تو خود اپنے دل و دماغ ان افسوسناک واقعات سے متاثر اور ملک کی غیر یقینی فضا کی وجہ سے بے چین تھے' اور دوسری طرف اس افراتفری کے وقت ایک غیر ملک میں ''پاکستان اور اسلامی قانون'' کے موضوع پر لیکچر بے وقت کی راگنی محسوس ہوتی تھی'

اس لیے مجھے اس موقع پر جانے میں تامل سا رہا، لیکن ہارورڈ کے منتظمین اس پروگرام کی تشہیر اور انتظامات کر چکے تھے اور اب نہ معذرت مناسب تھی، نہ پروگرام ملتوی کرنا۔ لہٰذا میں یکم اور ۲/ دسمبر کی درمیانی رات میں خواہی نخواہی اس سفر پر روانہ ہوگیا، اور چوبیس گھنٹے کے سفر کے بعد جس میں چند گھنٹے ایمسٹرڈیم کے قیام کے بھی شامل ہیں میں ۲ دسمبر کو امریکی وقت کے مطابق شام کے تین بجے بوسٹن کے ایئرپورٹ پر اترا۔ یہ امریکی ریاست میساچوسیٹس کا صدر مقام ہے۔ اسی کے ساتھ دریائے چارلس کے دوسرے کنارے پر اس کا جڑواں شہر کیمبرج آباد ہے، اور کیمبرج ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی واقع ہے۔

ہارورڈ امریکہ کی سب سے مشہور اور قدیم ترین یونیورسٹی ہے، اور دنیا بھر میں اس کا تعلیمی معیار مسلّم ہے۔ اس یونیورسٹی کا آغاز ۱۶۳۶ء میں ہارورڈ کالج کے قیام سے ہوا تھا۔ جان ہارورڈ نامی ایک شخص نے اپنی آدھی جائیداد اور آدھا کتب خانہ اس تعلیم گاہ کو دے دیا تھا، اس لیے یہ درسگاہ اسی کے نام سے موسوم ہوئی۔ شروع میں یہ تعلیمی ادارہ کلیسا کے ماتحت تھا لیکن انیسویں صدی میں یہ کلیسا اور حکومت دونوں سے آزاد ہو کر ایک پرائیوٹ منتخب ادارہ بن گیا۔ اس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ امریکہ کی سیاسی اور فکری تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ امریکہ کے بہت سے صدر (بشمول جان ایف کینیڈی اور روز ویلٹ) یہیں کے پڑھے ہوئے تھے۔ دنیا کی مشہور علمی شخصیتوں میں سے ولیم جیمز اور بنجامن پیٹرس جیسے لوگ یہیں کہ فارغ التحصیل ہیں۔

ہمارے ملک کی اصطلاح کے برعکس یہاں انڈر گریجویٹ تعلیمی ادارے کالج اور پوسٹ گریجویٹ ادارے اسکول کہلاتے ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے تین اسکول اپنے تعلیمی معیار کے لحاظ سے عالمی شہرت کے حامل ہیں، لا اسکول، بزنس اسکول اور میڈیسن اسکول۔ مجھے ہارورڈ لا اسکول کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا جو قانون کی تعلیم میں ساری دنیا کا نمبر ایک ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس ادارے کا ایک شعبہ "اسلامک لیگل اسٹڈیز پروگرام" کے نام سے موسوم ہے جس کے ڈائریکٹر پروفیسر فرینک ووگل اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر باربرا ایم ایک ہیں اور انہوں نے ہی

مجھے دعوت دی تھی۔

آج کل ہارورڈ یونیورسٹی کا کیمپ کئی کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے درسگاہوں اور طلبہ کے ہوسٹلوں کی عمارتیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں' کہا جاتا ہے کہ تقریباً تین بلین ڈالر مالیت کے اوقاف (endowments) اس یونیورسٹی کے تصرف میں ہیں اس کے باوجود یہاں کی تعلیم اور ہاسٹل کی رہائش کی فیس اتنی ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کا تحمل مشکل ہے۔

بوسٹن اور کیمبرج امریکہ کے شمال مشرقی ساحل کے پاس آباد ہیں' اور یہ وہ علاقہ ہے جس کو انگریزوں نے فتح کرکے پہلی بار اپنی نوآبادی بنایا تھا' لہٰذا یہ علاقہ نیو انگلینڈ کے لقب سے مشہور ہے۔ اسی لیے یہاں عمارتوں اور طرز بود و باش میں امریکن انداز کم اور انگریزی انداز زیادہ ہے۔ اپنی روایتی عمارتوں کے لحاظ سے یہ شہر امریکہ کے بجائے انگلینڈ کا معلوم ہوتا ہے۔

میرے قیام کا انتظام میزبانوں نے ہارورڈ ہی کے کیمپس میں واقع ہارورڈ فیکلٹی کلب میں کیا تھا۔ عام ہوٹلوں کے مقابلے میں اس کلب کی فضا نسبتاً صاف ستھری اور بہت سی خرافات سے خالی تھی۔ ماحول بھی علمی تھا' اور رہائش کی سہولیات بھی عام ہوٹلوں سے بہتر' ہارورڈ کے مڈل ایسٹرن' اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر ڈان بابائی نے کراچی ہی میں فیکس کے ذریعہ مجھ سے اپنی ایک ریسرچ کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے وقت لیا ہوا تھا۔ چنانچہ پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد شام ۷ بجے وہ میری قیام گاہ پر آ گئے' اور کچھ دیر ان کے ساتھ گفتگو رہی۔ انہوں نے یہ بتایا کہ ۳ اور ۴ دسمبر دونوں دن کے پروگراموں کی ہارورڈ کے متعلقہ حلقوں میں خاصی تشہیر کی گئی ہے۔ اور حاضرین ان میں بڑی دلچسپی سے شریک ہوں گے۔

۳/ دسمبر کی سہ پہر میں ''اسلامک فائنانس'' کے موضوع پر ورکشاپ ہونے والا تھا لیکن ہارورڈ کے مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کے شعبے میں اسلامک بینکنگ کے لیے ڈاٹا بیس تیار کرنے کا ایک پروگرام عرصے سے جاری ہے۔ اس کے ڈائریکٹر ناظم علی ایک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ انہوں نے بھی مجھ سے کراچی میں رابطہ کرکے مجھے یہ پروگرام دیکھنے کے لیے مدعو کیا تھا' اور ۳ دسمبر کی صبح کا وقت میں نے اس کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ چنانچہ صبح ساڑھے نو بجے وہ مجھے

اپنے ساتھ اپنے مرکز میں لے گئے۔ اس پروگرام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ''اسلامی بینکنگ'' جس کی طرف دنیا بھر میں اور بالخصوص عالم اسلام میں خاصی رفتار سے پیش قدمی ہو رہی ہے اس کے بارے میں جملہ معلومات اور اسلامی مالیاتی اداروں کے بارے میں تازہ ترین تفصیلات ایک کمپیوٹر پروگرام میں جمع کی جائیں۔ اس پروگرام کا آغاز دسمبر ۱۹۹۵ء میں ''دارالمال الاسلامی'' جنیوا کے مالی تعاون سے ہوا تھا۔ اور اب اس نے اسلامی بنکاری سے متعلق ایک ایسا سافٹ ویئر تیار کرلیا ہے جس میں اسلامی بنکاری کے بارے میں تمام دستیاب معلومات یکجا ہیں۔ یعنی اس کے ذریعے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ''اسلامی بنک'' اور مالیاتی ادارے کن کن بنیادوں پر سرمایہ کاری کررہے ہیں؟ دنیا بھر میں کتنے مالیاتی ادارے اسلامی اصولوں پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ وہ کہاں کہاں واقع ہیں؟ ان کے سرمائے کی مقدار ان کے بڑے بڑے اور اہم سودے کیا ہیں؟ سرمایہ کاری کے جن اسلامی اصولوں کی یہ ادارے پیروی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کی شرعی تفصیلات کیا ہیں؟ غرض اسلامی بنکاری کے سلسلے میں ہر پہلو سے جامع اور مکمل معلومات اس پروگرام میں اس طرح مہیا کی گئی ہیں کہ چند لمحوں میں ہر مطلوب تفصیل پوری وضاحت سے اسکرین پر آجاتی ہے۔ ڈاکٹر ناظم علی نے اس پروگرام کا ایک ایک عمل تفصیل سے دکھایا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی بنکاری کے شعبے میں نہایت مفید دلچسپ اور جامع پروگرام ہے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ ڈاکٹر ناظم علی اور ان کے رفقاء جنہوں نے یہ پروگرام تیار کیا' یقیناً اس کارنامے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سہ پہر کو دو بجے سے ''اسلام کے مالیاتی نظام'' کے موضوع پر ورکشاپ تھا جس کے مہمان خصوصی کے طور پر مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ دراصل جب سے مشرق وسطیٰ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں اسلامی مالیاتی ادارے قائم ہونے شروع ہوئے ہیں' مغرب کے علمی حلقوں میں اسلامی بینکنگ کو سمجھنے اور مالیاتی حلقوں میں اس پر عمل کرکے روپے کی اس نئی منڈی سے استفادہ کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اسی رجحان کے زیر اثر ہارورڈ لا اسکول کے پروفیسر فرینک ووگل اور ہارورڈ بزنس اسکول کے پروفیسر سیموئیل ہیز نے ایک کتاب مرتب کی

ہے جس کا نام ہے:

Islamic Law and Finance: Religion, Risk and Return.

اس کتاب میں انہوں نے اسلامی بنکوں اور مالیاتی اداروں کے بنیادی تصورات' ان کے طریق کار اور ان کے محاسن وعیوب کو واضح کرنے کے علاوہ اس بات کا جائزہ بھی لیا ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی بینکنگ کی ترقی کے کیا امکانات ہیں؟ اور وہ عالمی منڈیوں میں اپنا مقام پیدا کرنے کی کس درجہ صلاحیت رکھتی ہے؟ نیز اس کتاب کے ایک باب میں انہوں نے بنکاری کی بعض جزئیات کے لیے ایسے طریقے تجویز کیے ہیں جو ان کے خیال میں نئے ہیں' اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہونے کے باوجود ابھی' اسلامی بنکوں نے اختیار نہیں کئے۔ اس کتاب کا مسودہ فرینک ووگل نے پہلے ہی میرے پاس بھیج دیا تھا اور خاص طور پر اس کے آخری حصے کے بارے میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کروں۔ میں نے سفر کے دوران طیارے میں اس کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے بڑی حد تک متعلقہ فقہی اصولوں کو سمجھ کر یہ کتاب لکھی ہے اور فقہ کی فہم کی حد تک اس میں غلطیاں بہت کم ہیں' البتہ بعض تجاویز جو انہوں نے نئی (innovative) سمجھ کر پیش کی تھیں' وہ دراصل نئی نہ تھیں' عالم اسلام کے بعض حصوں میں ان پر عمل ہو رہا ہے' اور بعض تجاویز کے عملی اطلاق میں متعدد امور قابل اعتراض تھے۔

یہ ورکشاپ درحقیقت انہی تجاویز پر گفتگو کے لیے میری موجودگی میں اس لیے منعقد کیا گیا تھا کہ ان کے بارے میں میری رائے بھی معلوم کی جا سکے۔ ورکشاپ میں امریکہ اور بیرون امریکہ سے تقریباً تیس منتخب افراد جو مالیات کے امور سے متعلق تھے' مدعو کیے گئے تھے۔ پروفیسر فرینک ووگل نے ایک ایک کر کے اپنی تجاویز پیش کیں' حاضرین نے عملی نقطہ نظر سے ان پر تبصرہ کیا اور بالآخران کے شرعی پہلوؤں پر اظہار خیال کیلئے مجھ سے فرمائش کی گئی۔ میں نے اپنی بادی النظری رائے ان کے سامنے بیان کی جس کی بنیاد پر انہوں نے بعض تجاویز میں ردوبدل کی اور بعض سے دستبرداری کا اظہار کیا۔

یہ ورکشاپ رات ۸ بجے تک جاری رہا۔ بعد میں عشائیہ بھی تھا جس کے دوران کھانے

کی میز پر بھی گفتگو جاری رہی۔ کھانے میں چونکہ میرے علاوہ اور بھی بہت سے مسلمان شریک تھے اس لیے میز بانوں نے صرف سبزیوں، مچھلی اور حلال مشروبات تک ہی عشائیے کو محدود رکھا تھا۔

اگلے روز (۴/دسمبر کو) میرے لیکچر کے لیے شام ۴ بجے کے وقت اعلان کر دیا گیا تھا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں مغرب سوا چار بجے ہو رہی ہے اس لیے میں نے منتظمین سے کہا کہ لیکچر مغرب کی نماز کے بعد ہی شروع ہونا چاہیے، منتظمین نے اسے بخوشی قبول کرلیا، میری فرمائش پر انہوں نے لیکچر ہال کے ساتھ ہی ایک کمرے میں نماز کا بھی انتظام کر دیا۔ اس سے پہلے ہارورڈ لا اسکول اور اس کے اسلامک لیگل اسٹیڈیز پروگرام کا معائنہ بھی کرایا گیا اور جب میں لیکچر ہال پہنچا تو وہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد بھی پہلے سے موجود تھی، جو نہ صرف ہارورڈ بلکہ میساچوسیٹس کے مختلف مقامات سے لیکچر کی اطلاع پا کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ملحقہ کمرے میں نماز کے لیے صفیں بچھائی گئیں میری فرمائش پر ایک مقامی مسلمان نے اذان کہی، اور مغرب کی نماز با جماعت ادا کی گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہارورڈ کے کسی لیکچر ہال میں پہلی بار اذان اور نماز کا یہ منظر دیکھنے میں آیا۔

نماز مغرب کے بعد ہم لیکچر ہال میں داخل ہوئے۔ حاضرین میں زیادہ تر ہارورڈ کے مختلف شعبوں کے طلبہ اور اساتذہ شامل تھے جن میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ کچھ لوگ ہارورڈ کے باہر سے بھی آئے ہوئے تھے اور چند افراد ایسے بھی تھے جو سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے پہنچے تھے۔

میں نے اپنے لیکچر میں جس کا عنوان ''پاکستان اور اسلامی قانون'' طے کیا گیا تھا پہلے تو نظریۂ پاکستان کی تشریح کی پھر اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی کہ آج کے دور میں جب کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں سیکولر ڈیموکریسی کا سکہ چل رہا ہے۔ پاکستان میں اسلامی قانون کی بات کیوں کی جاتی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس وقت میرا تخاطب ان لوگوں سے نہیں جو خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتے، لیکن اگر کوئی شخص خدا پر یقین رکھتا ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ''ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں'' (واضح رہے کہ آج بھی امریکہ کے ہر ڈالر پر یہ فقرہ چھپا ہوا ہے

کہ ''ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔'') تو یہ بات قطعی غیر منطقی اور نامعقول ہوگی کہ خدا کو کائنات کا خالق بھی مانا جائے اور اس زمین پر اس کی حاکمیت کا انکار کر کے اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی معاملات میں اس کے احکامات کا داخلہ بھی ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اگر خدا موجود ہے اور کائنات پر اس کی حکمرانی قائم ہے، تو زمین پر بھی اسی کی حکمرانی چلنی چاہیے اور زمین کو اس کی حاکمیت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب ایک مرتبہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حاکمیت اعلیٰ (Soveregnty) اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین اسی کے احکام کے تابع ہونے چاہئیں۔

پھر میں نے قدرے تفصیل سے عرض کیا کہ جس طرح دنیا کی ہر چیز حسی مشاہدے سے معلوم نہیں ہوسکتی، یعنی ایک حد پر جاکر مشاہدہ کام نہیں دیتا بلکہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح عقل کی رہنمائی بھی لامحدود نہیں بلکہ ایک حد پر جاکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی رہنمائی درکار ہوتی ہے اور اسی وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکامات معلوم ہوتے ہیں۔ وحی الٰہی کی محفوظ ترین شکل ہمارے پاس قرآن کریم ہے اور اس کے بعد وہ تشریحات ہیں جنہیں دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کے ساتھ بھیجا گیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو زمین پر نافذ کرنے کے لیے قرآن وسنت ہی بنیادی سرچشمے ہیں جن کی اساس پر اسلامی قانون استوار ہے لہٰذا زمین پر اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی خالقیت اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا منطقی تقاضا ہے اور خاص طور پر پاکستان کے لیے اس بنا پر ناگزیر ہے کہ متحدہ ہندوستان سے اس کی علیحدگی کی بنیادی وجہ جواز بھی یہی تھی کہ مسلمان یہاں دوسروں کے تسلط سے آزاد ہوکر اپنا نظریہ حیات نافذ کرسکیں۔

اس کے بعد میں نے ان بہت سی غلط فہمیوں کی حقیقت واضح کی جو خاص طور پر مغربی ذرائع ابلاغ اسلامی قانون کے بارے میں عموماً پھیلاتے رہتے ہیں، پھر پچھلی نصف صدی میں پاکستان میں اسلامی قانون کے تعلق سے جو کوششیں ہوئی ہیں ان کا تفصیلی تذکرہ کیا اور اس راہ میں جو رکاوٹیں پیش آتی رہی ہیں، ان کا تجزیہ اور مستقبل کے امکانات کا مختصر جائزہ پیش کیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے لیکچر کے بعد قریب قریب اتنا ہی وقت حاضرین کے سوالات اور

ان کا جواب دینے میں صرف ہوا۔ حاضرین کے سوالات سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے لیکچر کے دقیق نکات کو بھی اچھی طرح سنا اور سمجھا ہے۔ زیادہ تر سوالات اسلامی ریاست میں خواتین اور غیر مسلموں کے حقوق، فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے دائرہ اختیار اور مختلف شعبوں میں اسلامی قوانین کے عملی نتائج سے متعلق تھے۔ حاضرین نے کھل کر اپنے شکوک و شبہات پیش کئے، الحمد اللہ اطمینان اور بے تکلفی کے ماحول میں تمام سوالات کا مفصل جواب دیا گیا۔ یہاں تک کہ جب بہت دیر گزر گئی تو پروفیسر فرینک ووگل نے جو خود بھی بہت سے سوالات کر چکے تھے، بیچ میں مداخلت کر کے کہا کہ آج کی نشست میں ہمارے بہت سے سوالات کا جواب مل چکا ہے جن سے ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ اب چونکہ کافی دیر گزر چکی ہے لہذا ہم یہ سلسلہ مزید دراز کرنے کے بجائے یہ فرمائش کرتے ہیں کہ مہمان مقرر جو کثرت سے امریکہ آتے رہتے ہیں، آئندہ جب کبھی امریکہ کے جس کسی خطے میں یہ آئیں وہ ایک دن ہمارے لیے ضرور نکالیں جس میں ہم مختلف موضوعات پر ان کے لیکچرز کا اہتمام کریں۔

لیکچر کے اختتام پر حاضرین آپس میں گھل مل گئے اور بحمد اللہ انفرادی ملاقاتوں میں بعض حضرات نے اپنے اس تاثر کا اظہار کیا کہ آج کی نشست میں ان کے ذہن سے شکوک و شبہات کے بہت سے کانٹے دور ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مسلمان حاضرین بہت خوش تھے کہ جن بعض سوالات سے انہیں یہاں بکثرت سابقہ پیش آتا رہتا ہے ان کا مفصل اور تشفی بخش جواب مل گیا۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ نے ایک تنظیم "ہارورڈ اسلام سوسائٹی" کے نام سے قائم کی ہوئی ہے۔ انہی کی کوششوں سے ایک ہوسٹل کے تہ خانے میں انہیں یونیورسٹی کی طرف سے ایک نماز کی جگہ بنانے کی اجازت ملی جس میں پانچوں وقت نماز با جماعت کا انتظام ہے۔ اس سوسائٹی کے طلبہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس نماز کی جگہ آ کر ان سے خطاب کروں اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات معلوم کر کے ان میں ان سے تعاون کروں۔ چنانچہ لیکچر کے بعد میں ان کے ساتھ گیا۔ یہ ایک ہوسٹل کے تہ خانے میں بنا ہوا ایک کمرا ہے جسے وہ اس وقت نماز گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں ہم نے عشاء کی نماز وہیں پر با جماعت ادا کی۔ نماز کے بعد

مختصر خطاب بھی ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نوجوان جنہیں میں نے دینی جذبے سے معمور پایا' نہایت بے سروسامانی کے عالم میں بڑا قابل قدر کام کررہے ہیں۔ پنج وقتہ نماز کے علاوہ جمعہ کے دن یہ یونیورسٹی کی کسی بڑی جگہ پر نماز جمعہ کا انتظام کرتے ہیں۔ رمضان میں اسی تہ خانے میں وہ ہارورڈ کے مسلمان طلبہ کیلئے حلال کھانے سے افطار کا انتظام کرتے ہیں، تراویح بھی باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ انہی کی کوششوں سے امتحانات وغیرہ کے مواقع پر نیز بعض کلاسوں میں نماز اور رمضان میں افطار کے وقفے مسلمان طلبہ کو دیئے جاتے ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی چھٹی بھی یونیورسٹی کی سطح پر منظور ہورہی ہے یہ نووارد مسلمان طلبہ کی خدمت اور انہیں مانوس کرنے کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ اسی تہ خانے میں وقتاً فوقتاً دینی تقریریں کراتے اور مذاکرے منعقد کرتے ہیں' ایک پندرہ روزہ نیوز لیٹر نکالتے ہیں جس میں دینی معلومات فراہم کی جاتی ہیں' ان میں سے بعض طلبہ بوسٹن شہر کے دوسرے مسلمانوں کے بچوں کو قرآن کریم وغیرہ کی تعلیم دینے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہارورڈ میں پڑھنے والے مسلمانوں کو ایک پاکیزہ دینی ماحول فراہم کرتے ہیں جو انہیں بھٹکنے سے بچاسکے۔

لیکن فی الحال یہ لوگ جگہ کی تنگی کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ اس تہ خانے میں کل تیس آدمی جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں لہٰذا یہ اس فکر میں ہیں کہ ہارورڈ یارڈ میں کوئی وسیع جگہ لے کر وہاں ایک مسجد اور اسلامی مرکز تعمیر کریں جس پر تقریباً ۵ ملین ڈالر کی لاگت کا تخمینہ ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے اس قسم کے مراکز یونیورسٹی میں قائم ہیں۔ مگر مسلمانوں کا کوئی ایسا مرکز نہیں ہے جو اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ یقیناً یہ لوگ پورے عالم اسلام کی طرف سے تعاون کے مستحق ہیں' یہ یونیورسٹی سے اس سلسلے میں زمین لینے کی بات چیت کررہے ہیں اور فی الحال چندے کی رقوم وصول کرنے کے بجائے ان کی اپیل صرف یہ ہے کہ اہل خیر مسلمان جتنا جتنا تعاون کرسکتے ہیں اس کی مقدار سے ان کو مطلع کردیں تاکہ اس کی بنیاد پر یہ بات چیت کرسکیں ان کا پتہ یہ ہے:

Mustafa Muhsin Siddiqui
247 Kirkland, Mail Center
Cambridge, Massachusetts 02138 U.S.A
Ph:(617) 493-4866 E-mail:Siddiqui @ fas. harvard. edu.

اگلی صبح (۵/ دسمبر کو) میں اٹلانٹا روانہ ہو گیا۔ اور تین گھنٹے کی پرواز کے بعد اٹلانٹا کے وسیع وعریض ایئرپورٹ پر اترا۔ اٹلانٹا امریکی ریاست جورجیا کا صدر مقام ہے' اور امریکہ کے مشرقی علاقوں کے درمیان واقع ہونے کی بنا پر اسے خاصی اہمیت حاصل ہے اور یہ امریکہ کے جنوب مشرقی حصے کا تجارتی اور مواصلاتی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تقریباً بیس ڈگری دینے والے تعلیمی ادارے ہیں۔ آج کل عالمی شہرت یافتہ سی این این کا ہیڈکوارٹر بھی یہیں ہے۔ اور مشہور زمانہ کوکا کولا فیکٹری کا ہیڈکوارٹر بھی۔ اصل شہر کی آبادی پانچ لاکھ سے اوپر ہے لیکن آس پاس کی آبادیاں ملا کر تقریباً تین ملین۔ یہاں تقریباً پچاس ہزار مسلمان آباد ہیں جن میں مقامی سیاہ فام اور سفید فام نومسلم بھی ہیں' اور دنیا کے مختلف حصوں سے آ کر آباد ہونے والے مسلمان بھی۔ اٹلانٹا اور اس کے مضافات میں تقریباً سترہ مسجدیں ہیں۔ جن میں سب سے بڑی مسجد ''الفاروق'' ہے جو وسط شہر میں واقع ہے' اور اسی مسجد کے امام مولانا زاہد عبداللہ صاحب جو مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور اس کی انتظامیہ جو جناب وارثی صاحب کی سربراہی میں کام کر رہی ہے، میری میزبان تھی، اور ان سے میں نے کئی ماہ پہلے سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ امریکہ کے آیندہ سفر میں چند روز ان کے ساتھ گزاروں گا۔

امریکہ کے تقریباً ہر خطے میں مسلمانوں کا دینی شعور جو تیزی سے ترقی کر رہا ہے وہ ہم پاکستانیوں کے لیے قابل رشک ہے۔ ۱۹۷۸ء کے بعد سے یہ میرا امریکہ کا نواں سفر تھا' اور میں نے ہر سفر میں مسلمانوں کا دینی جوش وخروش پہلے سے زیادہ پایا ہے۔ اٹلانٹا میں بھی اس جوش وخروش کے بڑے ایمان افروز مناظر دیکھنے میں آئے۔ یہاں کے مسلمان ماشاء اللہ خاصے منظّم اور باہم مربوط ہیں۔ مسجد ''الفاروق'' کے ساتھ ابتدائی دینی تعلیم کا ایک مدرسہ بھی ہے' اور ثانوی سطح تک عصری تعلیم کا ایک اسکول بھی، جہاں اسلامی روایات کی فضا میں بچوں کو عصری تعلیم دینے کا انتظام ہے۔ طلبہ کے لیے ایک ہوسٹل بھی ہے اور اس میں کیلی فورنیا تک کے طلبہ مقیم ہیں۔ یہاں امریکی نژاد نومسلموں کی بھی خاصی تعداد نماز پڑھنے آتی ہے۔ ایک سفید فام امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی جو قرآن کریم حفظ کر رہا ہے، اور پندرہ بیس میل کی مسافت سے دن میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے بس یا ریل میں سفر کر کے آتا

ہے۔ میرے چار روزہ قیام کے دوران کئی بڑے بڑے اجتماعات ہوئے جن میں مقامی مسلمانوں کے علاوہ لوگ سینکڑوں میل دور سے آ آ کر شریک ہوئے۔ دین کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کے جذبے کا مظاہرہ تقریروں میں شرکت سے زیادہ اس وقت ہوتا تھا جب انہیں سوالات کا موقع دیا جاتا۔ وہاں نوجوانوں کی زبان سے دین کے بارے میں وہ سوالات سامنے آتے ہیں جن کا ہم یہاں کے نوجوانوں سے تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اجتماعات کے علاوہ بھی میرے چار روزہ قیام میں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہا' اور سوالات کا سلسلہ واپسی میں ایئرپورٹ روانگی تک منقطع نہیں ہوا۔ شدید مصروفیت کے عالم میں چار دن ہوا کی طرح گزر گئے' اور ۸/ دسمبر کو میں ان حضرات کی محبت' خلوص اور دینی جذبے کا انمٹ نقش لے کر واپس ہوا۔

ایک ہفتہ آئرلینڈ

اور آکسفورڈ میں



اکتوبر ۲۰۰۰ء

ایک ہفتہ آئر لینڈ اور آکسفورڈ میں

مغرب کے تقریباً ہر ملک میں عالم اسلام کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔جس نے انہی ملکوں کو اپنا وطن بنالیا ہے اور ان کی وجہ سے ان تمام مقامات پر اسلامی شعائر کا مظاہرہ تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے' اور اسلامی ثقافت کے آثار اب یہاں اجنبی نہیں رہے۔اسی کے ساتھ ساتھ ان ممالک کی مجموعی لادینی فضا میں مسلمانوں کو بہت سی مشکلات بھی درپیش ہیں جن پر قابو پانے کیلئے یہ حضرات خاصی تندہی سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ان کے مسائل میں ایک بہت بڑا مسئلہ اپنے اور اپنی نسلوں کے اسلامی تشخص کی حفاظت ہے۔بدقسمتی سے مسلمانوں کی کچھ تعداد ایسی بھی ہے جو ان مغربی ممالک کی ثقافت میں اس بری طرح مدغم ہوگئی ہے کہ اس نے اپنی اسلامی پہچان یا تو بالکل گم کردی ہے' یا صرف نام کی حد تک وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتی سمجھتی ہے' لیکن اس کی عملی زندگی میں نہ اسکا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے نہ اسے یہ فکر ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی اس پونجی کو کیسے دوبارہ حاصل کیا جائے۔لیکن دوسری طرف ایسے مسلمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے،جس نے نہ صرف اپنی اسلامی پہچان کو باقی رکھا ہے' بلکہ اسے ان ملکوں میں منوایا ہے' اسے یہ فکر ہے کہ وہ ان غیر اسلامی ملکوں میں رہتے ہوئے بھی اپنی زندگیوں کو شریعت کے تابع رکھے' چنانچہ اس کے طرز عمل میں حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز نمایاں نظر آتی ہے' بلکہ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو مسلمان ملکوں میں رہتے ہوئے اپنے دین کے بارے میں اتنے فکر مند نہیں تھے' مغربی ملکوں میں پہنچ کر زیادہ فکر مند ہوگئے ہیں۔

ادھر پوری دنیا میں بالعموم اور مغربی ملکوں میں خاص طور پر زندگی کا ڈھانچہ اس تیزی

سے بدل رہا ہے کہ وہاں نت نئے مسائل روز مرہ پیدا ہوتے رہتے ہیں ان میں سے بعض مسائل وہ ہیں جن کا پہلے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خود میرے پاس روزانہ کی ڈاک میں اس قسم کے سوالات بکثرت آتے رہتے ہیں' مغربی ممالک کے مسلمان باشندے قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا شرعی حکم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مسائل کے جواب کیلئے تحقیق ونظر کی ضرورت ہے' عالم اسلام کے مختلف اہل علم ان پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور طبعی طور پر بعض اوقات ان اہل علم کے نتائج تحقیق میں اختلاف بھی ہوتا ہے اور بعض ادارے ایسے بھی قائم ہیں جہاں ان مختلف آراء اور ان کے دلائل پر غور کر کے کوئی اجتماعی رائے قائم اور پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انہی اداروں میں سے ایک ادارہ یورپ کی سطح پر ۱۹۹۷ء میں قائم ہوا ہے۔ جو دراصل عرب علماء نے قائم کیا ہے' اس کا عربی نام المجلس الأوربی للافتاء والبحوث اور انگریزی نام (European Council for Fatwa and Research) ہے اور اسکے صدر عرب دنیا کے مشہور عالم شیخ یوسف القرضاوی اور مختلف یورپی ممالک کے اسلامی مراکز کے اہل علم سربراہان اسکے رکن ہیں۔ جولائی کے آغاز میں ایک اجتماع میں شرکت کیلئے میں لندن میں تھا' شیخ یوسف القرضاوی نے (جو میری طالب علمانہ جراتوں کے باوجود مجھ پر مدت سے بہت مہربان ہیں) اس موقع پر فرمائش کی کہ "المجلس الأوربی" کا جو اجتماع ۲۸/اگست سے یکم ستمبر ۲۰۰۰ء تک آئرلینڈ کے شہر ڈبلن میں منعقد ہو رہا ہے' میں اس میں شریک ہوں۔ اگرچہ اس میں شرکت کا مطلب یہ تھا کہ دو ماہ کے عرصے میں' میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے یورپ کے تین سفر کروں جو دارالعلوم میں صحیح بخاری کے درس کی ذمہ داری کے ساتھ میرے لئے آسان نہ تھا' لیکن شیخ قرضاوی اور بعد میں کونسل کے سیکریٹری جنرل شیخ حسین حلاوہ کے بار بار تقاضوں کے نتیجے میں، میں نے اس سفر کی ذمہ داری قبول کر لی۔

۲۷/اگست کی رات کو میں کراچی سے روانہ ہوا اور دبئی کے راستے برٹش ایرویز سے صبح ساڑھے چھ بجے لندن اترا۔ اور وہیں سے ایک آئرش طیارے کے ذریعے نو بجے صبح آئرلینڈ کے دارالحکومت ڈبلن پہنچا۔ ڈبلن کا اسلامی مرکز اس کانفرنس کی میزبانی کے فرائض انجام دے

رہا تھا۔ چنانچہ اس کے نمائندے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے دارالعلوم کے ایک فارغ التحصیل عالم مولانا اسماعیل صاحب جو یہاں کے ایک اور اسلامی مرکز کے ذمہ دار ہیں اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لائے ہوئے تھے اور متعدد دوسرے حضرات شامل تھے۔ تقریباً سولہ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد اس روز شام تک آرام کا وقفہ تھا جس کا بیشتر وقت اپنی قیام گاہ اسٹیلوگران پارک ہوٹل میں گذرا۔

عصر کے بعد کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا۔ ہوٹل سے تقریباً پندرہ منٹ کے فاصلے پر اسلامک کلچرل سنٹر آف آئرلینڈ کی عالیشان عمارت ہے، جو بڑی خوشنما اور کشادہ مسجد، بچوں کی تعلیم کے مدرسے اور نشرو اشاعت کے ایک مرکز پر مشتمل ہے۔ یہ وسیع عریض عمارت دبئی کے شیخ راشد المکتوم کے خرچ پر تعمیر ہوئی ہے، اور اس وقت آئرلینڈ کا سب سے بڑا اسلامی مرکز یہی ہے جس کی سربراہی مصر کے شیخ حلاوہ کررہے ہیں اسی مرکز میں ایک کانفرنس ہال بھی ہے جس میں چار دن تک مذکورہ یورپین کونسل کا اجتماع منعقد ہوتا رہا۔ عصر سے مغرب تک شیخ یوسف القرضاوی کی صدارت میں افتتاحی اجلاس جاری رہا جس میں رسمی تقاریر کے علاوہ کانفرنس میں زیر بحث آنے والے موضوعات کا تعین کیا گیا اور جن حضرات نے مقالے لکھے ہوئے تھے ان کی تحریریں تقسیم کی گئیں۔

آئرلینڈ کے ایک پاکستانی نژاد مسلمان تاجر جناب غلام باری صاحب کا شمار یہاں کے چند گنے چنے ممتاز تاجروں میں ہوتا ہے ان کے تجارتی اسٹورز ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں مسلمان برادری کی خدمت اور دینی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائی ہے، انہوں نے یہاں اسلامی مراکز اور تعلیم گاہوں کے قیام میں بھرپور حصہ لیا ہے، وہ استقبال کیلئے ائیر پورٹ آئے تھے، اور اسی وقت انہوں نے بتایا تھا کہ وہ کسی ضرورت سے پاکستان جانے والے تھے، مگر انہوں نے میری آمد کی وجہ سے اپنا سفر ایک دن کیلئے مؤخر کیا، اور آج رات وہ اپنے مکان میں عشائیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق مغرب کے بعد مجھے ان کے مکان پر جانا تھا۔ ان دنوں یہاں مغرب کی نماز تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہو رہی تھی، چنانچہ مغرب کے بعد ان کے مکان پر پہنچتے پہنچتے نو بجے کا وقت ہو

گیا۔انہوں نے ڈبلن کے خاص خاص احباب کو مدعو کیا ہوا تھا۔ایک غیر مسلم ملک میں کسی مسلمان کے اثر ورسوخ کا یہ انداز دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، بالخصوص جبکہ اللہ تعالی نے اسے خدمت خلق اور خدمت دین کی بھی توفیق عطا فرمائی ہو۔

اگلی صبح نو بجے سے کانفرنس کی عملی نشستیں شروع ہوئیں۔پہلی نشست کی صدارت، صدر سوڈان کے مشیر شیخ علی الامام نے کی۔شیخ علی الامام سوڈان کے علمی اور دینی حلقوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔وہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انہوں نے قرآن کریم کی قرأتوں کے موضوع پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے، جس میں قرآن کریم کی اصلیت کے بارے میں مستشرقین کے اٹھائے ہوئے شبہات کا مفصل جواب دیا ہے، وہ عربی کے علاوہ انگریزی اور جرمنی زبانوں سے بھی واقف ہیں اور ان کی آخری کتاب قرآن کریم کی ایک مختصر تفسیر ہے۔انہوں نے اپنی یہ دونوں کتابیں بھی بڑی محبت سے مجھے پیش کیں، خاص طور سے اول الذکر کتاب نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

کانفرنس کی اس پہلی نشست میں وہ سوالات زیر بحث آئے جو یورپ کے مختلف خطوں سے مسلمانوں نے کونسل کو ارسال کئے تھے۔ظہر تک مختلف سوالات کے جواب تیار کئے گئے۔دو بجے نماز ظہر اور کھانے کا وقفہ ہوا، پھر شام چھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک دوسری نشست میری صدارت میں ہوئی جس میں باقی ماندہ سوالات کے جواب پر بحث ہوتی رہی اور باقی ماندہ سوالات کا جواب تیار کیا گیا۔

مغرب کی نماز مجھے ایک اور اسلامی مرکز میں پڑھنی تھی۔یہ مرکز ڈبلن شہر کے وسط میں واقع ہے اور اس میں ایک مصلی (عارضی مسجد) اور مدرسہ نور الاسلام کے نام سے بچوں کی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم ہے۔یہ مدرسہ ہمارے مولانا محمد اسماعیل صاحب کی سربراہی میں کام کر رہا ہے۔مولانا اسماعیل صاحب نوجوان عالم ہیں وہ برطانیہ میں پیدا ہوئے، جنوبی افریقہ میں درس نظامی کی تکمیل کی اور بالآخر ہمارے دارالعلوم کراچی میں دو سال تک فتوی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد برطانیہ واپس آئے۔آئرلینڈ کے مسلمانوں نے انہیں ڈبلن بلایا اور شروع میں وہ شیخ حسین حلاوہ کے ساتھ اسلامک کلچرل سنٹر سے وابستہ رہے۔پھر غلام باری صاحب

کی دعوت پر انہوں نے وسط شہر میں یہ اسلامی مرکز قائم کیا جہاں وہ تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مدرسے میں مستقل تدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ وہ ڈبلن کے مشہور ٹرنٹی کالج میں اسلامی موضوعات پر ہفتہ وار لیکچر بھی دیتے ہیں جس میں مسلمان اور غیر مسلم طلبہ شریک ہوتے رہتے ہیں۔ ڈبلن کے دوسرے مقامات اور آئرلینڈ کے دوسرے شہروں میں بھی ان کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ وہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں روانی سے تقریر کرتے ہیں، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ انہوں نے اپنی نوعمری کے باوجود مشکل حالات میں بڑی ثابت قدمی اور حکمت کے ساتھ لوگوں کو مانوس کیا ہے، ان کی رہنمائی سے یہاں کے مسلمان فیض یاب ہو رہے ہیں جتنے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان سب کو انکی تعریف میں رطب اللسان اور ان کی خدمات کیلئے ان کا ممنون پایا۔

مغرب کی نماز کے بعد انہی کے مدرسہ نور الاسلام میں میرا خطاب اردو اور انگریزی میں ہوا، مردوں کے علاوہ خواتین بھی سامعین میں شامل تھیں۔ آئرلینڈ میں ہندوستان یا پاکستان کے علماء کی آمد نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے میری تمام باتوں کو ان سب حضرات نے قدر کے ساتھ سنا، اور غیر معمولی محبت کا معاملہ فرمایا۔ پہلے سے اعلان نہ ہونے کی بنا پر اجتماع کوئی بہت بڑا نہیں تھا، لیکن جتنے لوگ تھے، وہ دین کی عظمت و محبت لیکر آئے تھے اس لئے بفضلہ تعالیٰ بحیثیت مجموعی اسے مفید سمجھا گیا۔

کانفرنس اگلے روز بھی مغرب تک جاری رہی۔ اور مغرب کی نماز کیلئے مجھے ڈبلن کی قدیم ترین مسجد کے سوڈانی امام شیخ یحیٰی صاحب نے مدعو کیا تھا، چنانچہ نماز مغرب وہاں ادا کی۔ یہ ڈبلن کی پہلی باقاعدہ مسجد ہے جو ایک چرچ کی عمارت خرید کر یہاں کے مسلمانوں نے تعمیر کی تھی۔ اور اسلامک کلچرل سنٹر کی تعمیر سے پہلے تک ڈبلن کا سب سے بڑا اسلامی مرکز اسی مسجد میں واقع تھا یہ بھی خاصی کشادہ مسجد ہے، اور اسکے ساتھ مدرسہ اور اسلامک فاؤنڈیشن آف آئر لینڈ کے نام سے نشر و اشاعت کا اسلامی مرکز بھی ہے۔ چونکہ اس مسجد کے آس پاس زیادہ تر عرب حضرات آباد ہیں، اس لئے اس میں نمازیوں کی اکثریت عرب ہے۔ چنانچہ یہاں عربی میں میرا خطاب ہوا، جس کے بعد مسجد ہی کے ایک حصے میں ہمارے دوست ڈاکٹر نوید صاحب

نے عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ ڈاکٹر نوید صاحب پورے سفر میں میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔ وہی اپنی گاڑی میں مختلف مقامات پر لیجاتے رہے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ عشائیہ ان کے گھر پر ہو لیکن چونکہ ان کا گھر دور تھا اس لئے انہوں نے میری مصروفیت اور سہولت کے پیش نظر مسجد کے ساتھ ہی عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں بہت احباب شریک تھے۔ عشائیہ کے بعد ڈاکٹر نوید صاحب نے ڈبلن شہر کا ایک طائرانہ نظارہ کرانے کے بعد مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔

جمعرات کانفرنس کا آخری دن تھا' ڈبلن کے سفر میں ایک کشش مجھے اس وجہ سے تھی کہ یہاں قدیم عربی کتابوں اور مخطوطات کی ایک لائبریری چیسٹر بیٹی (Chester Beatty) دنیا بھر میں مشہور ہے' میں اسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن پچھلے تین روز کی پے در پے مصروفیات میں یہ شوق پورا کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ آج صبح کے وقت کانفرنس کی ڈرافٹنگ کمیٹیوں کی میٹنگ تھی جو ہوٹل ہی میں ہونی تھی' میں اس میٹنگ سے ۱۰ بجے صبح تک فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد کانفرنس کے عام اجلاس میں شرکت اتنی ضروری نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے مولانا اسماعیل صاحب اور ڈاکٹر شہزاد صاحب سے طے کیا ہوا تھا کہ وہ دس بجے آ کر مجھے لائبریری لے جائیں۔ وہ حسب وعدہ تشریف لے آئے۔ آئرلینڈ میں ماشاء اللہ پاکستانی نژاد ڈاکٹر حضرات بڑی تعداد میں آباد ہیں' ڈاکٹر شہزاد صاحب بھی ایک قابل ڈاکٹر ہیں جو آئرلینڈ کی فوج میں ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کی دینی اور سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش ہیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے پیشکش کی تھی کہ وہ مجھے لائبریری لیکر جائینگے۔

ڈبلن سے تقریباً تین گھنٹے کے فاصلے پر آئرلینڈ کا ایک اور شہر گالوے آباد ہے' وہاں بھی ایک مسجد' مدرسہ اور اسلامی مرکز ہے جس کی سربراہی مولانا محمد الیاس صاحب کے سپرد ہے' مولانا محمد الیاس صاحب بھی ہمارے دارالعلوم کراچی کے فارغ التحصیل ہیں' ان کا وطن برطانیہ ہے' لیکن وہ اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے دارالعلوم آئے' اور دورۂ حدیث کے بعد ہمارے یہاں سے فراغت حاصل کی' ہمارے یہاں دورۂ حدیث کی جماعت عموماً ڈھائی سو کے لگ بھگ طلبہ پر مشتمل ہوتی ہے' اس لئے درس کے دوران ہر ہر طالب علم سے انفرادی رابطہ مشکل ہوتا ہے۔

خاص طور سے ایسے طلبہ جو پچھلی صفوں میں بیٹھتے ہیں اور سوال و جواب میں زیادہ حصہ نہیں لیتے، انہیں یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے مولانا الیاس صاحب بھی ایسے ہی خاموش طبع طالب علم تھے جن کی صلاحیتوں کا اس وقت اندازہ نہیں ہو سکا جب وہ ہمارے یہاں زیر تعلیم تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان کے جوہر کھلے۔ ماشاء اللہ وہ گالوے میں دینی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، انہوں نے یہاں کے بچوں کے لئے انگریزی میں متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں، مطالعے کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور ڈبلن میں میرے قیام کے دوران وہ ڈبلن ہی میں مقیم رہے اور ہر پروگرام میں اپنی خاموش طبعی کے ساتھ شریک۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چیسٹر بیٹی کے علاوہ یہاں ایک اور لائبریری بھی قابل دید ہے۔ لوگ چیسٹر بیٹی کی شہرت کی وجہ سے وہاں تو بکثرت جاتے ہیں لیکن اس لائبریری کے بارے میں لوگوں کو اتنی معلومات نہیں ہیں، اس لئے وہاں سیاحوں کی آمد کم ہوتی ہے۔ مولانا الیاس صاحب نے مشورہ دیا کہ پہلے اس لائبریری کو دیکھ لیا جائے۔

مارش لائبریری

اس لائبریری کا نام آرچ بشپ مارش لائبریری ہے۔ یہ ایک پرانے چرچ کی عمارت میں واقع ہے، اور یہ ڈبلن کے آرچ بشپ مارش نے ۱۶۹۶ء میں قائم کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ یہ ڈبلن کی سب سے پہلی پبلک لائبریری ہے۔ آرچ بشپ مارش نے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ان کتابوں کے حصول پر صرف کیا آئرلینڈ کی حکومت نے اسے بطور خاص اپنی اصلی شکل میں محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہے چنانچہ عمارت اور اس کے تمام کمرے بھی پرانے طرز کے ہیں الماریاں بھی پرانی لکڑی کی ہیں اور تمام کتابیں بھی حتی الامکان قدیم جلدوں میں مجلد رکھی گئی ہیں، اور لائبریری کے ہال میں داخل ہونے کے بعد انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ چار سو سال پہلے کے دور میں داخل ہو گیا ہے، لائبریری میں ایک دلچسپ حصہ وہ ہے جسے Study cage یعنی ''مطالعے کے پنجرے'' کا نام دیا گیا ہے۔ جو لوگ لائبریری میں مطالعے کیلئے آتے، انہیں اس حصے میں ایک پنجرہ نما دروازے کے پیچھے الماریوں کے سامنے بٹھا دیا جاتا اور دروازے پر تالا

ڈال دیا جاتا تھا' تاکہ وہ مطالعے کے بعد کتابیں چرا کر نہ لے جاسکیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کتابوں کی چوری کا رواج خاصا عام تھا' لائبریری میں اسکے بانی آرچ بشپ مارش کی ایک تحریر فریم میں لگی ہوئی ہے جس میں اس نے اپنی ایک بھتیجی کے بارے میں شکوہ کیا ہے کہ ''وہ خدا کے خوف سے بے نیاز ہو کر کسی شخص کے ساتھ فرار ہوگئی ہے' اور جاتے ہوئے اپنے ساتھ کتب خانے سے کچھ کتابیں بھی چوری کر کے لے گئی ہے''۔

اس کتب خانے میں اس وقت سولہویں اور سترہویں صدی کی مطبوعہ کتابوں کا بڑا نایاب ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں لاطینی' انگریزی' عربی' یونانی' سریانی' عبرانی' عرامائی' کسدی (Chaldaic)' حبشی' فارسی اور ترکی زبانوں کی کتابیں شامل ہیں' آرچ بشپ مارش نے شروع میں یہاں مشرقی کتب کے قلمی نسخوں کا بھی بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا' اور اس غرض کیلئے ہالینڈ کے شہر لیڈن سے بڑے مخطوطات منگوائے تھے' لیکن بعد میں اس نے دیکھا کہ ڈبلن میں ان کی قدر نہیں پہچانی جارہی' لہٰذا اس نے وہ مخطوطات آکسفورڈ کی بوڈلین (Bodleian) لائبریری کو دیدیئے۔

لائبریری کے انچارج عملے نے بڑے شوق و ذوق سے لائبریری کا معائنہ کرایا۔ مولانا الیاس صاحب نے انہیں میری آمد کی پہلے سے اطلاع دی ہوئی تھی' اس لئے انہوں نے چند نادر کتب مجھے دکھانے کیلئے الگ سے نکال کر رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک قرآن کریم کا نسخہ تھا جو ۱۶۹۴ء میں جرمنی کے ایک مستشرق ابراھام ھنکلمین (Hinckelman) نے ھیمبرگ سے شائع کیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک مغربی ملکوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ قرآن کریم کا پہلا مطبوعہ ایڈیشن ہے' لیکن بعد میں اٹلی کے شہر وینس میں طبع شدہ ایک نسخہ دریافت ہوا جو ۱۵۳۰ء میں چھاپا گیا تھا' اس کے بعد سے اسی کو پہلا مطبوعہ قرآن کا نسخہ سمجھا جانے لگا۔ قرآن کریم کے اس نسخے کے ساتھ لاطینی زبان میں اس کا مختصر ترجمہ بھی موجود ہے۔

اسلام کے بارے میں ایک اور دلچسپ کتاب شمالی ہالینڈ کے ایک مستشرق ایڈرین ریلینڈ (Adrian Reland) کی ہے اسکا لاطینی نام De religione

Mohammedica libriduo ہے۔ ریلینڈ اصل میں فلسفے کا طالب علم تھااور اس نے اس کتاب میں لاطینی اور عربی زبان میں اسلام کے بنیادی عقائد واحکام کا تعارف کرایا ہے اور اسلام کے عقائد اور تعلیمات کے بارے میں جو غلط الزامات لگائے گئے ہیں' انکی تردید کی ہے۔

انگریزی زبان میں قرآن کریم کے سب سے پہلے مترجم جارج سیل (George Sale) کے مشہور و معروف ترجمے کا سب سے پہلا ایڈیشن بھی یہاں موجود ہے جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا تھا' اور اس کے سرورق پر اس دور کے حرم مکی کی ایک تصویر بھی شائع شدہ ہے' جس سے اس زمانے کے مکہ مکرمہ کا ایک تصور انسان قائم کرسکتا ہے۔

عربی نحو (گرامر) کی مشہور کتاب اجرومیہ کا ایک نسخہ بھی ہم نے دیکھا جو ۱۶۱۷ء میں ہالینڈ کے مستشرق اری پے نیوس (Erpenius) نے لیڈن سے شائع کیا تھا۔ ابن سینا کے قانون اور علامہ محمد ادریسی کی جغرافیہ پر مشہور کتاب "نزهة المسالک" کا لاطینی ترجمہ بھی لائبریری میں موجود ہے جو ۱۵۹۲ء میں طبع ہوا تھا۔

چونکہ یہ ایک عیسائی آرچ بشپ کی لائبریری ہے' اس لئے مجھے خیال تھا کہ اس میں بائبل کے قدیم نسخے اور اسکی وہ پرانی شروح بھی دستیاب ہونی چاہئیں' جنہیں میں اس وقت سے تلاش کرتا رہا ہوں جب میں نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب "اظہار الحق" پر کام کیا تھا۔ بائبل کے قدیم نسخے تو بہت سے ملے' لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ پوری شرح کوئی دستیاب نہیں ہوسکی۔ لائبریری کی فہرست کمپیوٹرائزڈ ہے لیکن کمپیوٹر کی مدد سے نہ میں کوئی شرح دریافت کرسکا' نہ لائبریری کا عملہ۔ بالآخر میں نے فرمائش کی کہ کمپیوٹر میں فہرست ڈالنے سے پہلے لائبریری کے جو پرانے رجسٹر ہونگے' ان میں تلاش کی جائے۔ متعلقہ خاتون نے میری اس فرمائش کو قبول کیا اور میرے سامنے پرانے رجسٹر لاکر رکھ دیئے۔ ان رجسٹروں میں کم از کم بائبل کے متفرق حصوں کی شروح مل گئیں اور ان کے دریافت ہونے پر وہ خاتون کہنے لگیں "کمپیوٹر کتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے' آدمی کی کمی پوری نہیں کرسکتا"۔ لیکن جن کتابوں کی مجھے

تلاش تھی وہ یہاں بھی مجھے نہ مل سکیں، خاتون نے وعدہ کیا کہ وہ تلاش جاری رکھیں گی اور اگر مل گئیں تو مجھے ای میل کے ذریعے مطلع کردیں گی۔

جس زمانے میں، میں ''اظہار الحق'' پر کام کر رہا تھا اور عیسائیت میرے مطالعے کا خاص موضوع تھا، اگر اس زمانے میں مجھے ایسی لائبریری مل جاتی اور اس سے استفادے کے وسائل میسر ہوتے تو میں کئی مہینے اس میں گذار دیتا۔ لیکن اظہار الحق پر کام، میں نے ایسی بے وسیلگی کے عالم میں کیا کہ پاکستان میں دستیاب کتب سے استفادے کیلئے بھی مجھے روزانہ شام کو دارالعلوم کورنگی سے بس میں لٹک کر شہر کی لائبریریوں میں جانا پڑتا تھا۔ اب یہ لائبریری موجود تھی جہاں سے یقیناً عیسائیت پر بہت سا کام کیا جاسکتا ہے، اب الحمدللہ، ایسے وسائل بھی میسر ہیں کہ میں جتنا چاہوں، یہاں ٹھہر سکوں، لیکن اوقات مختلف ذمہ داریوں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ کچھ کرنا ممکن نہیں اور اس وقت تو میرے پاس بہت ہی محدود وقت تھا، اس لئے لائبریری سے استفادے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں تھا کہ یہاں کے انچارج نے اپنا ای میل ایڈریس مجھے دیدیا کہ ضرورت کے وقت ان سے رابطہ ہو سکے۔ لیکن یہ تفصیل اس لئے لکھ رہا ہوں کہ عیسائیت کے موضوع پر کام کرنے والے اس لائبریری کے قدیم ذخیرے سے استفادہ کرسکیں تو ضرور کریں۔

چیسٹر بیٹی لائبریری

مارش لائبریری کے بعد ہم چیسٹر بیٹی کی مشہور لائبریری میں پہنچے۔ یہ وسط شہر کی ایک بلند و بالا عمارت میں واقع ہے۔ یہ لائبریری بھی اس کے بانی کے نام سے موسوم ہے، انہیں سر الفریڈ چیسٹر بیٹی (Sir Alfred Chester Beatty) کہا جاتا ہے، ان کی قائم کردہ یہ لائبریری صرف مذاہب عالم کی کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے جس میں اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندو مذہب، بدھ مت، جین، سکھ، تاؤ، شنٹو، ہر مذہب کا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کتابیں عربی، لاطینی، انگریزی، فارسی، ترکی، اردو، ہندی اور نہ جانے کتنی زبانوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ عربی مخطوطات کا بھی یہاں بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کا صرف کیٹلاگ (فہرست) آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس لائبریری میں آنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ یہاں بعض قدیم عربی کتب کے

مخطوطات اصلی شکل میں دیکھنے کا موقع مل سکے۔لیکن یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخطوطات کا ذخیرہ مستقل طور پر کھلا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کیلئے پہلے سے تاریخ ' وقت اور کتابوں کا تعین کرنا پڑتا ہے' اس کے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہیں ہے البتہ عام لوگوں کی دلچسپی کیلئے انہوں نے ایک شوروم ایسا بنایا ہوا ہے جس میں خطاطی کے مختلف نمونوں کی نمائش کی جاتی ہے' چنانچہ یہاں ایک شوکیس میں دسویں صدی عیسویں (یعنی تقریباً تیسری صدی ہجری) کا لکھا ہوا قرآن کریم کا ایک نسخہ موجود ہے جو اندلس میں لکھا گیا تھا' اور اب بھی اسکی آب وتاب اور خطاطی کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی ۔اسکے سوا اس شوروم میں میری دلچسپی کی کوئی چیز نہ تھی ۔البتہ لائبریری کی عربی کتب کا کیٹلاگ جو آٹھ جلدوں میں ہے' یہاں نسبتہً کم قیمت پر دستیاب تھا' اس لئے میں نے وہ غنیمت سمجھ کر خرید لیا' اس کیٹلاگ میں تمام مخطوطات کا تعارف بھی ہے، اور اسکے صفحات کی تصاویر بھی موجود ہیں ان میں سے بہت سے مخطوطات خود مصنفین کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

ڈبلن کے ان دو کتب خانوں کی سیر بڑی دلچسپ رہی' اپنے اسلاف کی کتابوں کے یہی وہ عظیم ذخیرے ہیں جو یورپ کے مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کو دیکھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

وہ حکمت کے خزانے ' وہ کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں جا کے یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

یہ سوال عام ذہنوں میں بکثرت پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابیں اتنی بڑی تعداد میں یورپ کیسے پہنچیں؟ اور ان غیر مسلم قوموں نے ان کا اتنا تحفظ کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب اگرچہ تفصیل کا محتاج ہے اور یہ مختصر سفر نامہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا' لیکن چونکہ وہ جواب ہمارے لئے بہت سی عبرتیں رکھتا ہے' اس لئے اختصار کے ساتھ اس کی طرف اشارہ مناسب ہے۔

سولھویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا بھر میں علم وفن کے سب سے بڑے مراکز عالم اسلام میں تھے' اس وقت غیر مسلم یورپ علم وہنر اور فن وحکمت سے بحیثیت مجموعی اتنا آشنا نہیں

تھا اور اس معاملے میں عالم اسلام کا محتاج تھا۔ یورپ کے حکمران اپنے شہزادوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کیلئے اندلس بھیجا کرتے تھے۔ لیکن شامت اعمال سے جب مسلمانوں کی اپنی بدعملی سے ان کا سیاسی زوال ہوا تو عالم اسلام کا علمی سرمایہ فاتحین یورپ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ اندلس کے زوال کے بعد وہاں برسر اقتدار آنے والی عیسائی حکومت تو اس درجہ متعصب اور علم دشمن تھی کہ اس نے مسلمانوں کے کتب خانے نذر آتش کر دیئے اور علم و حکمت کے نہ جانے کتنے خزانے غرناطہ کے چوراہوں پر مہینوں تک جلتے رہے۔ لیکن ہمارے اسلاف نے ہر موضوع پر تالیفات کا جو ذخیرہ تیار کیا تھا وہ اسکے باوجود تمام تر فنا نہ ہو سکا۔ کچھ علم دوست لوگوں نے اس وقت بھی مسلمانوں کی کتابیں چوری چھپا کر رکھیں جب ایسی علم دوستی عیسائی تفتیش (Enquisition) کے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی اور پھر رفتہ رفتہ جب یورپ میں وسیع المشربی کا چرچا ہوا تو ان کتابوں سے استفادے کا خصوصی اہتمام کیا گیا، یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جن لوگوں نے عیسائی جکڑ بند کے بندھن توڑے، انہوں نے مسلمانوں کے اس عظیم ورثے سے استفادہ کیا۔ مارش لائبریری کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں اس کے مطبوعہ کیٹلاگ میں ابن سینا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''ابن سینا نے طب، ریاضی، منطق، فلکیات اور فلسفے پر سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں، اسکی مشہور کتاب ''قانون الطب'' کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں ''حکمت کا خزانہ'' قرار دیا گیا اور وہ سترہویں صدی کے وسط تک نصابی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی''۔

(The Wisdom of the East:Marsh's Oriental Books p.17)

لہٰذا اسلافِ امت کی یہ کتابیں چونکہ یورپ کیلئے عظیم محسن کی حیثیت رکھتی تھیں، اس لئے نشأۃ ثانیہ کے بعد کے یورپ نے انہیں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ ان کتب کا بڑا ذخیرہ تو وہ ہے جو یورپی قوموں نے عالم اسلام کے مختلف ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں سے بزور شمشیر حاصل کیا اور یورپ کے کتب خانے اچھی طرح دیکھنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بہت بڑا ذخیرہ وہ بھی ہے جو ان لوگوں نے مسلمانوں سے خریدا۔ یہ مسلمانوں کے علمی

انحطاط اور معاشی بدحالی کا زمانہ تھا اس لئے بہت سے نایاب ذخیرے غیر مسلموں کو فروخت کرنے میں لوگوں کو باک نہ ہوا شروع میں ان کتابوں سے اہل یورپ کے شغف کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی نشأۃ ثانیہ میں ان کتابوں کا بڑا اہم کردار تھا' علم دشمنی کا تاریک دور ختم ہوا تو یورپ میں علم دوستی کا ایسا رجحان پیدا ہوا کہ انہوں نے ہر علم وفن کی قدر پہچاننے اور اسکے تحفظ کیلئے ہر ممکن کوشش کی' ہر علم وفن میں اختصاص رکھنے والے (Specialized) اسکالرز پیدا کئے' خواہ عملی زندگی سے علم کے اس گوشے کا کوئی تعلق بھی نہ ہو۔ مسلمانوں کے دینی علوم کے تحفظ کے پیچھے ایک تو عامل یہ تھا، دوسرے بہت سے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو فکری تحریکیں پروان چڑھانی منظور تھیں' ان کی تقویت کیلئے علمی اسلحہ انہی مستشرقین نے فراہم کیا جو اسلامی علوم کے مطالعے اور تحقیق کیلئے وقف تھے۔

بہر صورت اسباب کچھ بھی ہوں قدیم علمی ورثے کی حفاظت یورپ نے خوب کی' یہانتک کہ بظاہر وہ پرانی کتب جنہیں دیکھنے والے بھی اب وہاں خال خال ہی ہونگے' زرکثیر صرف کرکے بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی ہیں اور انہیں زمانے کے تھپیڑوں سے بچانے کیلئے جدید ترین تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ ڈبلن کی لائبریریوں کو پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعہ براہ راست مرکزی حکومت نے اپنے زیر انتظام رکھا ہوا ہے۔ الحمدللہ' اب عالم اسلام کے مختلف خطوں میں اچھی لائبریریاں قائم کرنے کا اہتمام ہو رہا ہے بالخصوص شرق اوسط کے ممالک میں اس سلسلے میں بہت پیش رفت ہوئی ہے، اور اب یورپ کے مختلف ملکوں سے نادر مخطوطات کی کاپیاں جدید آلات کے ذریعے عالم اسلام کے مختلف ملکوں' مثلاً سعودی عرب' امارات' مصر' ترکی اور شام وغیرہ میں محفوظ کرلی گئی ہیں۔ لیکن ہمارا ملک پاکستان اس معاملے میں بہت پیچھے ہے' ملک بھر میں کوئی ایک لائبریری بھی شاید ایسی نہیں ہے جو بین الاقوامی معیار کے مطابق ہو۔ بلکہ ہمارے ملک کے دور افتادہ دیہات میں کتابوں کے بڑے نادر ذخیرے موجود ہیں' سندھ کے پیر جھنڈو کا کتب خانہ اپنی ثروت کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کے علاوہ بھی سندھ اور پنجاب کے بعض کتب خانے اپنی نظیر آپ ہیں' لیکن ان کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہیں، یہ کتب خانے پرانے علم دوست لوگوں نے قائم کئے تھے'

انفرادی طور پر وہ اپنی وسعت کی حد تک انہیں محفوظ بھی رکھتے رہے، مگر وہ حفاظت کے جدید آلات سے محروم ہیں، اور میں نے ان میں سے بعض کتب خانوں میں خود مشاہدہ کیا ہے کہ بہت سی نادر کتابیں دیمک اور موسم کے اثرات سے خراب ہورہی ہیں۔ میں نے متعدد مرتبہ حکام کو اس طرف توجہ دلائی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے وزیر مذہبی امور خود ایک اسکالر ہیں، اور ان کی علم دوستی شک وشبہ سے بالاتر ہے، اگر وہ حکومت کو یہ یقین دلا سکیں کہ ایک ترقی پذیر ملک کی اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی لائبریریوں کو مفید اور مستحکم بنائے اور اسکے لئے وسائل مہیا کرے تو شاید ہمارے ملک کے یہ خزانے زمانے کی دستبرد سے بچ جائیں۔

کتب خانوں سے فارغ ہوئے تو ڈاکٹر شہزاد صاحب نے ڈبلن کی بھی تھوڑی سی سیر کرائی، یہ شہر دریائے لفی (Liffey) کے دونوں طرف آباد ہے، اور شہر کا وسطی حصہ اسی دریا کے کناروں پر واقع ہے، یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح ڈبلن بھی ایک خوبصورت شہر ہے، مگر یہاں رومن کیتھولک مذہب والوں کی اکثریت ہے، اسلئے روایات کی پابندی میں وہ یورپ کے دوسرے شہروں سے بھی زیادہ ممتاز ہیں۔

آئرلینڈ ۱۹۲۱ء تک برطانیہ کا حصہ تھا، ۱۹۲۱ء کے ایک ایکٹ کے ذریعے اسے ایک آزاد ریاست تسلیم کیا گیا، مگر وہ دولت مشترکہ کا حصہ بنا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں دولت مشترکہ سے بھی اسکا آخری تعلق ختم ہوگیا، اور وہ ایک مستقل جمہوریہ کی شکل اختیار کر گیا۔ آئرلینڈ درحقیقت برطانیہ کے مغرب میں ایک جزیرہ ہے، جو شمالی اور جنوبی آئرلینڈ پر مشتمل ہے۔ جنوبی آئرلینڈ برطانیہ سے الگ ہوکر مذکورہ بالا طریقے پر مستقل ملک بن چکا ہے اور اسے ری پبلک آف آئرلینڈ کہتے ہیں، اور اس کا دارالحکومت ڈبلن ہے، لیکن شمالی آئرلینڈ جس کا بڑا شہر بلفاسٹ ہے ابھی تک برطانیہ کے ماتحت ہے اور وہاں پر آزادی کی تحریکیں چلتی رہتی ہیں اور اس لحاظ سے برطانیہ اور آئرلینڈ میں چشمک بھی ہے، لیکن دونوں ملکوں نے باہمی مسافروں کی آمدورفت کیلئے اتنی سہولتیں مہیا کی ہوئی ہیں کہ وہ گہرے دوست معلوم ہوتے ہیں، دونوں ملکوں کے درمیان فضائی سفر ملکی سفر کی طرح ہوتا ہے جس میں امیگریشن اور ویزا وغیرہ کے مراحل سے

گذرنا نہیں پڑتا۔

آئرلینڈ کی زبان (آئرش) الگ ہے، لیکن انگریزی بھی مساوی طور پر بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہے۔ ملک کا زیادہ تر دارومدار زراعت پر تھا، اسی لئے اسے کسانوں کا ملک کہا جاتا تھا مگر اب صنعت میں بھی ترقی ہوئی ہے، پہلے اس کا شمار یورپ کے نسبتہً پسماندہ ملکوں میں ہوتا تھا، مگر اب کچھ عرصے سے مستحکم معاشی پالیسیوں کے نتیجے میں یہ تاثر زائل ہورہا ہے اور ملک معاشی طور پر ترقی کررہا ہے آئرش سوسائٹی پر ابھی تک مذہب کی گرفت دوسرے یورپی ممالک کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ ہے، بیشتر آبادی رومن کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل ہے، اور برطانیہ کی پروٹسٹنٹ آبادی سے فرقہ وارانہ بنیاد پر بھی اسکے اختلافات چلتے رہتے ہیں۔ معاشرے میں مذہب کے بقا کی وجہ سے ابھی یہ ملک بے حیائی اور عریانی کے اس سیلاب سے نسبتہً کم متاثر ہوا ہے جس نے پوری مغربی دنیا کو لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

آئرلینڈ میں مسلمان بھی ہزاروں کی تعداد میں آباد ہیں جن میں پاکستانی حضرات کی تعداد بھی بہت بڑی ہے۔ ان میں تجارت پیشہ بھی ہیں اور ملازمت پیشہ بھی۔ پاکستانی ڈاکٹر حضرات کی یہاں بڑی قدر ہے، اور وہ اچھے مناصب پر فائز ہیں۔ عربوں کی تعداد بھی بہت ہے بیشتر مسلمان یہاں ماشاءاللہ خوشحال ہیں اور مقامی لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ بحیثیت مجموعی اچھا ہے۔

جمعرات کی شام کو کانفرنس کا آخری عملی اجلاس تھا، جو مغرب کے بعد بھی عشاء تک جاری رہا، عشاء کے بعد جو یہاں رات ساڑھے دس بجے ہورہی تھی ایک دوست کے گھر پر کھانا تھا جہاں سے رات کے بارہ بجے ہوٹل واپسی ہوئی، جمعہ کی صبح نو بجے میں ہوٹل سے روانہ ہوا، اور برٹش مڈلینڈ کے طیارے کے ذریعے ساڑھے بارہ بجے لندن پہنچا۔ برطانیہ میں بعض حضرات عام مسلمانوں کیلئے اسلامی طریقے پر سرمایہ کاری کا ایک ادارہ قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں، ہفتے کی صبح مجھے اس میں شرکت کرنی تھی۔ جمعہ کی یہ شام کئی روز کے مسلسل سفر اور مصروفیات کے بعد فرصت کی ملی، تھکن سے جسم چور تھا۔ دریائے ٹیمز کے کنارے ٹاور برج سے متصل تھسل ہوٹل میں قیام ہوا۔ قریب ہی ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں اپنے میزبانوں

کے ساتھ کھانا کھا کر میں نے ہوٹل میں آرام کیا۔ چند گھنٹے مجھے یکسوئی کیلئے درکار تھے، لندن کے کسی دوست کو میری آمد کی اطلاع نہ تھی، اس لئے یکسوئی کے ان لمحات میں آرام کے ساتھ کچھ کام بھی ہوگیا۔ رات سکون سے گذری۔ صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ہوٹل ہی میں میٹنگ رہی، یہ ستمبر کی دوسری تاریخ تھی، اور اگلے دن مجھے اسلامک ریسرچ کے آکسفورڈ سینٹر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک سمپوزیم میں شرکت کرنی تھی، جس کیلئے بارہ بجے دوپہر میں آکسفورڈ روانہ ہوگیا۔

آکسفورڈ میں

آکسفورڈ لندن سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے، یہ ایک چھوٹا شہر ہے مگر اپنی یونیورسٹی کی وجہ سے عالمی شہرت کا حامل ہے۔ جسکا تعلیمی معیار دنیا بھر میں مسلم ہے، یہاں اسلامک اسٹیڈیز کی اسکالرشپ کیلئے ایک مرکز عرصے سے کام کر رہا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ اس مرکز کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر تھے اور سعودی عرب کی معروف شخصیت جناب عبداللہ عمر نصیف اسکے نائب صدر تھے۔ حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد اب عبداللہ عمر نصیف صاحب ہی اسکے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ یہ ادارہ برونائی کے سلطان حسن بلقیا کی طرف سے ہر سال کسی شخصیت کو اسکی اسلامی خدمات کی بنا پر انعام بھی دیتا ہے۔ ایک مرتبہ اس انعام کے تعین کے لئے جج کی حیثیت میں، میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں مرکز کے ڈائریکٹر فرحان نظامی، جو ہندوستان کے مشہور مصنف جناب خلیق احمد نظامی کے صاحبزادے ہیں، اپنی محبت کی بنا پر مجھے متعدد مرتبہ مرکز میں حاضری کی دعوت دیتے رہے ہیں، لیکن مصروفیات کی وجہ سے صرف ایک بار ہی حاضر ہوسکا۔ اس مرتبہ انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے کیلئے ایک عالمی سمپوزیم کا اہتمام کیا، جس میں شرکت کا میں نے وعدہ کرلیا تھا۔

میں دو بجے کے قریب آکسفورڈ پہنچا، شام کو مرکز میں مہمانوں کے اعزاز میں عشائیہ کا انتظام تھا۔ عشائیہ کیلئے نکلنے لگے تو دارالعلوم دیوبند (وقف) کے مہتمم حضرت مولانا محمد سالم

قاسمی صاحب کا میرے کمرے میں فون آیا۔ان سے ملاقات نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی‘ عشائیہ پر پہنچے تو وہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا محمد رابع ندوی صاحب تشریف فرما تھے جو حضرت مولانا علی میاں صاحب قدس سرہ کے بھانجے ہیں اور ان کے خلف صالح کی حیثیت سے حضرت مولانا کے مشن کی ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر ہیں۔ البعث الاسلامی کے ایڈیٹر جناب مولانا واضح رشید صاحب ندوی بھی تشریف فرما تھے۔ان حضرات سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔حضرت مولانا محمد رابع صاحب زیدمجدہم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی ان کے انداز واداور لباس کے انداز کو دیکھ کر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ یاد آ گئے۔ابھی تقریباً ایک ماہ قبل انگلینڈ کے شہر ڈیوزبری میں حضرت مولاناؒ کے تذکرے کیلئے احقر کے زیر صدارت ایک جلسہ عام منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان‘ پاکستان‘یورپ‘امریکہ اور کویت سے بہت سے حضرات شریک ہوئے تھے۔اس اجتماع میں مجھے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز فکر وعمل پر ایک مفصل خطاب کرنے کا موقع ملا تھا جو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے نقل ہو کر اب الگ بھی شائع ہو رہا ہے۔الحمدللہ‘ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس خطاب میں احقر نے حضرت مولاناؒ کی علمی‘عملی اور دعوتی زندگی سے ملنے والے سبق کو خصوصی طور سے واضح کرنے کی کوشش کی تھی‘اور ان کے خصوصی مزاج اعتدال کی خصوصیات بیان کی تھیں۔برطانیہ کے بیشتر اہل علم وہاں موجود تھے‘اور اس خطاب کا بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا۔اجتماع کے شرکاء کی طرف سے میرے پاس خطوط آئے کہ اسے جلد شائع ہونا چاہیے۔مولانا واضح رشید صاحب ندوی دامت برکاتہم نے بتایا کہ مولانا سلمان ندوی صاحب کے توسط سے‘جو اس اجتماع میں تشریف فرما تھے‘اس خطاب کا چرچا ہندوستان میں بھی پہنچا اور اسے حضرت مولاناؒ کے مزاج ومذاق کی صحیح تفسیر قرار دیا گیا‘فللہ الحمد۔

سمپوزیم کے شرکاء میں ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کے علاوہ ہمارے عرب دوستوں میں کویت کے شیخ خالد المذکور‘شام کے ڈاکٹر عبدالستار ابوغدہ‘عراق کے ڈاکٹر محی الدین قرہ داغی اور رابطہ الادب الاسلامی دمشق کے ڈاکٹر ابوصالح بھی تشریف فرما تھے۔ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف

کی خواہش پر ایک اجلاس کی صدارت بھی احقر کے سپرد کی گئی۔ شیخ یوسف القرضاوی نے اپنا مقالہ "سفیر العجم الی العرب" کے عنوان سے لکھا تھا جو انکی غیر موجودگی میں ہمارے دوست ڈاکٹر محی الدین قرہ داغی نے پڑھا تھا، شیخ یوسف القرضاوی نے اس مقالے میں حضرت مولاناؒ کو عربوں کی طرف اہل عجم کا سفیر قرار دیا اور ان اثرات کو واضح کیا جو حضرت مولاناؒ کی تصانیف، تقاریر اور سب سے بڑھ کر انکی عملی زندگی نے عرب دنیا پر مرتب کئے۔ شیخ قرضاوی نے جن الفاظ میں حضرت مولاناؒ کو خراج عقیدت پیش کیا، وہ یقیناً غیر معمولی تھے اور عرب کی ایک ممتاز شخصیت کی طرف سے حضرت مولاناؒ کے مقام بلند کا یہ اعتراف ہم برصغیر کے مسلمانوں کیلئے یقیناً بڑے فخر کی بات ہے۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب مدظلہم کا مقالہ بھی "مشكلة وَلا اباحسن لها" کے عنوان سے بہت خوب تھا۔ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مدظلہم نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں حضرت مولاناؒ کی اجتماعی فکر پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر ابو صالح نے رابطۃ الادب الاسلامی کے ذریعے اسلامی ادب پر حضرت مولاناؒ کی خدمات کے مختلف گوشے واضح کئے اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑے، علامہ خالد محمود صاحب نے بھی اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرمایا اور حاضرین کی داد و تحسین سے ہال گونج اٹھا۔

اکثر تقاریر عربی میں اور کچھ اردو میں ہوئیں۔ ڈاکٹر فرحان نظامی صاحب نے مجھ سے دونوں زبانوں میں خطاب کی فرمائش کی جس کی مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ مقررین کی کثرت کی بناء پر یہاں کسی تفصیلی خطاب کا موقع تو نہ تھا لیکن میں نے اختصار کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی دعوتی زندگی کے ان خصائص کا ذکر کیا جو میری ناچیز رائے میں ان کی دعوت میں غیر معمولی تاثیر کا سبب بنے اور جن کی وجہ سے ان کی بات کو عالمگیر طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے میری ڈیوزبری کی تقریر کا خلاصہ کہنا چاہئے جو انشاء اللہ عنقریب شائع ہو رہی ہے[1] اور اس میں دین کا کام کرنے والوں کیلئے اہم پیغام ہے۔

---

[1] یہ تقریر "البلاغ" شعبان ۱۴۲۱ھ کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔ ناشر

کچھ عرب شعراء نے حضرت مولانا کے بارے میں قصیدے کہے تھے، وہ بھی سنائے گئے اور انہوں نے عربی داں حضرات پر ایک سماں طاری کر دیا۔

اس مرتبہ میرے پاس برطانیہ کے قیام کا یہی ایک دن تھا اور کراچی جلد پہنچنے کی وجہ سے کہیں اور جانا ممکن نہ تھا۔ لیکن جن چند حضرات کو احقر کی حاضری کا علم ہوا، وہ دور دور سے سفر کر کے آکسفورڈ پہنچ گئے تھے، مولانا ابراہیم راجا جو دارالعلوم بری کے قابل اساتذہ میں سے ہیں اور مطالعہ و تحقیق کا خاص ذوق رکھتے ہیں، اور مجھ پر انکے کرم اور محبت کا یہ عالم ہے کہ میں برطانیہ کے آس پاس جہاں بھی ہوں ہمیشہ طویل سفر کر کے پہنچ جایا کرتے ہیں اس مرتبہ بھی بلیک برن سے چار گھنٹے کا سفر کر کے ہفتے کے دن ہی پہنچ گئے تھے، اور اگلے دن تک ساتھ رہے ہمارے ایک بہت مخلص دوست مولانا محمد دیدات صاحب دارالعلوم بری کے ناظم کتب خانہ ہیں، اور سالہا سال سے مجھ سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں، انہیں کتابوں کا خاص ذوق ہے، اور اپنی محبت سے وقتاً فوقتاً نئی کتابیں یا قلمی نسخوں کی تصویریں بھیجتے رہتے ہیں انہوں نے مولانا ابراہیم کے ذریعے حدیث کی مشہور کتاب المصابیح پر (جو مشکوۃ المصابیح کی اصل ہے) علامہ تورپشتیؒ کی بہترین شرح کا قلمی نسخہ ارسال فرمایا جو ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ یہ میرے لئے ایک عظیم نعمت تھی۔ یوکے اسلامک یوتھ فورم کے سربراہ جناب مولانا سلیم دھورات صاحب جو ماشاءاللہ یہاں کے نوجوانوں میں بڑا قابل قدر تعلیمی، دعوتی اور سماجی کام کر رہے ہیں، لیسٹر سے سفر کر کے تشریف لائے اور میری تقریر میں شرکت اور مختصر ملاقات کے بعد فوراً روانہ ہو گئے۔ مفتی ریاض الحق صاحب برمنگھم کے اسلامی مرکز کے سربراہ ہیں، وہ سمپوزیم کے ختم ہونے کے بعد پہنچ سکے، مگر الحمدللہ ان سے ملاقات ہو گئی۔ ڈیوزبری کے مولانا یعقوب اسماعیل منشی صاحب جو برطانیہ کے معروف علماء میں سے ہیں اور تحقیقی کام کرتے رہتے ہیں، وہ بھی سمپوزیم میں شرکت کیلئے تشریف لائے تھے، ان سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

آکسفورڈ چھوٹا سا شہر ہے مگر اس میں تین مسجدیں ہیں ان میں مدینہ مسجد سب سے بڑی سمجھی جاتی ہے جہاں بچوں کی تعلیم کا مدرسہ بھی ہے اور اسلامی مرکز بھی۔ اس کے سربراہ مولانا محمد جمیل صاحب سکھر کے باشندے اور مدرسہ اشرفیہ سکھر کے فارغ التحصیل ہیں، وہ عرصہ دراز

سے یہاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سمپوزیم میں وہ بھی شریک تھے، اور انہوں نے فرمائش کی کہ تھوڑی دیر کیلئے ان کی مسجد کی زیارت کی جائے' چنانچہ عصر کی نماز میں نے وہاں پڑھی' حاضرین کی فرمائش پر مختصر خطاب بھی ہوا۔ مرکز کی دینی سرگرمیاں دیکھ کر مسرت ہوئی واپسی پر مولانا جمیل صاحب نے آکسفورڈ شہر کا دورہ بھی کرایا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی شروع میں ایک مذہبی تعلیم کے ادارے کے طور پر شروع ہوئی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اس میں تمام علوم کی تعلیم کا انتظام ہوا اور سترہویں صدی کے بعد اس نے حقیقی ترقی شروع کی، یہاں تک کے وہ عالمی شہرت کا ادارہ بن گیا، مگر یہ یونیورسٹی اس لحاظ سے ایک منفرد یونیورسٹی ہے کہ اس کی اپنی کوئی عمارت یا کیمپس نہیں ہے۔ اس کے بجائے یہاں کالجوں کی بہتات ہے، یہ تمام کالج یونیورسٹی سے ملحق ہیں، اور ان کالجوں میں تعلیم پانے والے افراد کو ڈگری یونیورسٹی کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں تقریباً چالیس کالج ہیں جہاں دنیا بھر کے طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کالج کئی سو سال پرانے ہیں، ان کی عمارتیں بھی قدیم ہیں، اور ان کو قدیم روایتی ساخت پر برقرار رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، یہاں تک کہ عمارت کی بیرونی دیواروں پر مرور ایام سے جو سیاہی آگئی ہے اسے بھی دور کر کے رنگ روغن کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ پرانی لکڑی کے خزاں دیدہ پھاٹک اسی حالت میں برقرار رکھے گئے ہیں۔

ملحقہ گلیوں میں اگر صدیوں پہلے پتھر کی سڑک بنی ہوئی تھی تو اب بھی وہ پتھر ہی کی ہے جس کسی کالج میں دنیا کی مشہور شخصیتوں نے تعلیم پائی ہے' بعض جگہ ان کی یادگاریں بھی قائم ہیں۔

بوڈلین لائبریری (Bodlian Library) آکسفورڈ کی وہ مشہور لائبریری ہے جس میں عربی اور مشرقی مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مارش لائبریری کا تذکرہ کرتے ہوئے میں لکھ چکا ہوں کہ آرچ بشپ مارش نے اپنے مخطوطات بھی آکسفورڈ کی اسی لائبریری کو دیدئے تھے مگر شام کا وقت تھا اور اتوار کا دن' اس لئے لائبریری میں جانا ممکن نہیں تھا صرف عمارت کو دیکھ کر واپس ہو گئے، اسی علاقے کا ایک مکان اس لحاظ سے یادگار سمجھا جاتا ہے کہ

برطانیہ میں سب سے پہلی کار بنانے والے شخص مورس نے اسی جگہ یہ کار بنائی تھی اس کار کی تصویر بھی یہاں لگی ہوئی ہے۔ پھر مورس کے نام سے یہ کار عرصے تک بنائی جاتی رہی، اور اب وہ Rover کے نام سے بن رہی ہے۔

اگلے دن صبح نو بجے میں مولانا جمیل صاحب کے ہمراہ لندن ہیتھرو کے ائیر پورٹ کیلئے روانہ ہوا، اور برٹش ایئرویز کی سات گھنٹے کی پرواز کے بعد دبئی اترا' پرواز کا یہ وقت میں نے سفر کی یہ روداد لکھنے کے لئے استعمال کیا' یہ سطور یہاں لاؤنج میں بیٹھ کر پوری کررہا ہوں' رات کا ایک بج رہا ہے اور طیارے کی روانگی کیلئے طیارے پر سوار ہونے کیلئے بلایا جارہا ہے بفضلہٖ تعالیٰ یہ روداد بھی مکمل ہوگئی وصلی اللہ تعالی علی ونبیہ وحبیبہ وآلہ وصحبہ و بارک وسلم تسلیما کثیرا. وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

صنعاء یمن کا ایک سفر



جولائی ۲۰۰۱ء

صنعاء یمن کا ایک سفر

یمن کے دارالحکومت صنعاء کا نام میں نے پہلے پہل اس وقت سنا تھا جب میری عمر دس سال کی تھی اور میں دارالعلوم کراچی میں مقاماتِ حریری پڑھتا تھا۔ اس کتاب کا ہر مقامہ کسی ایک شہر کی طرف منسوب ہے، سب سے پہلا مقامہ ''صنعانیة'' ہے اور اس میں شہر صنعاء کی ایک داستان بیان کی گئی ہے۔ بعد میں احادیث اور تاریخ کی کتابوں سے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ تو ہوتا رہا، مگر اسے دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ اتفاق سے جزیرۂ عرب کے ہر ملک میں میرا جانا بار بار ہوا، مگر یمن کے اس حصے میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ صرف ایک مرتبہ نیروبی جاتے ہوئے جہاز صنعاء ایئرپورٹ پر رکا، لیکن شہر کے اندر نہ جاسکا۔

اس سال (۱۴۲۲ھ) صفر کے مہینے میں مجھے صنعاء کی جامعة الایمان کے بانی وصدر شیخ عبدالمجید زندانی (حفظہ اللہ) کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ وہ ۲رمئی ۲۰۰۱ء کو اپنی جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی پہلی کھیپ کے اعزاز میں ایک عالمی اجتماع صنعاء میں منعقد کررہے ہیں، اور اس میں میری شرکت کے خواہش مند ہیں۔ اتفاق سے انہی تاریخوں میں قاہرہ میں بھی ایک عالمی کانفرنس وہاں کی وزارتِ اوقاف کی طرف سے ہورہی تھی، اور مجھ پر خاصا اصرار تھا کہ میں اس میں شریک ہوں، لیکن بوجوہ میں نے قاہرہ کے بجائے صنعاء جانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قاہرہ میں بارہا جاتا رہا ہوں، اور یمن جانے کا اشتیاق ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔

یمن کے سفر کا اشتیاق اس لئے نہیں تھا کہ وہ خطہ کچھ زیادہ خوبصورت یا تمدنی اعتبار سے

قابلِ دید ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو ایک ایسا خصوصی اعزاز عطا فرمایا ہے جو حرمین شریفین کے بعد کسی اور ملک کو حاصل نہیں۔ احادیث میں یمن اور اہلِ یمن کے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ نیز یہ سرزمین انبیاء کرام، صحابہؓ، تابعینؒ اور بزرگانِ دینؒ کی سرزمین رہی ہے۔ اور ایک مسلمان کے لئے اس میں کشش کا بہت بڑا سامان ہے۔ قرآن و حدیث میں یمن کے جن فضائل کا صراحتہً یا اشارۃً بیان آیا ہے، ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن ان میں سے چند نمایاں فضائل یہ ہیں:۔

حدیث ہے کہ جب یمن کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اتاکم اهل اليمن هم ارق افئدة والين قلوباً، الايمان يمان والحكمة يمانية."[1]

تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں جن کے سینے بڑے رقت والے اور جن کے دل بڑے نرم ہیں۔ ایمان یمن کا ہے اور حکمت یمن کی ہے۔

ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں:۔

"الفقه يمان والحكمة يمانية"[2]

فقہ یمن کا ہے اور حکمت یمن کی ہے۔

ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے یمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"الايمان ههنا"[3]

ایمان اس کی طرف ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف دیکھا، اور یہ دعا فرمائی:۔

---

[1] الصحيح للبخاری، كتاب المغازی، باب قدوم الاشعريين واهل اليمن، حديث ۴۱۲۷

[2] الصحيح للبخاری ايضاً، حديث ۴۱۲۹ [3] الصحيح للبخاری، مغازی، حديث ۴۱۲۶

"اللھم اقبل بقلوبھم" [1]

یا اللہ! ان کے دلوں کو (ایمان کی طرف) متوجہ فرما دیجئے۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سر اقدس آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا:۔

"اتا کم اھل الیمن کقطع السحاب خیر اھل الارض"

تمہارے پاس اہل یمن بادل کے ٹکڑوں کی طرح آتے ہیں، جو سارے اہل زمین میں سب سے بہتر ہیں۔

ایک صحابیؓ نے پوچھا: "یا رسول اللہ کیا ہم سے بھی؟" آپؐ نے فرمایا: "سوائے تمہارے" [2]

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ عینیہ بن حصن فزاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اہل نجد کو سب سے بہتر لوگ قرار دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"کذبت، بل خیر الرجال اھل الیمن، والایمان یمان، وانا یمان"۔ [3]

"تم نے غلط کہا، بلکہ سب سے بہتر لوگ اہل یمن ہیں، اور ایمان یمنی ہے، اور میں بھی یمنی ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ ﷺ کو جو یمن کی طرف منسوب فرمایا، اس کی وجہ یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ یمن دراصل عربوں کے جد امجد قحطان کے بیٹے کا نام تھا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور اس طرح آپ ﷺ کا نسبی تعلق اہل یمن سے بنتا ہے۔ نیز اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل یمن کے اخلاق و عادات چونکہ مجھے پسند ہیں،

---

[1] الجامع للترمذی، ابواب المناقب، باب فی فضل الیمن، حدیث ۳۹۳۴ حسن صحیح

[2] مجمع الزوائد ۱۰: ۵۴، بحوالہ مسند احمد، بزار وابو یعلی، وقال رجالہ رجال الصحیح

[3] مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۴۴ بحوالہ طبرانی واحمد ورجال الجمیع ثقات

اس لئے گویا میں بھی یمنی ہوں۔ بہر صورت! وجہ کچھ بھی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے آپ کو اہل یمن کی طرف منسوب فرمانا اتنی بڑی فضیلت ہے کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے۔

"الایمان یمان وهم منی والیّ، وان بعد منهم المربع ویوشک أن یاتو کم انصارا و أعوانا فآمر کم بهم خیرا"۔[1]

"ایمان یمنی ہے، اور وہ (یعنی اہل یمن) مجھ سے ہیں، اور ان کا رخ میری طرف ہے، خواہ قیام کے اعتبار سے وہ کتنے دور ہوں۔ اور وہ وقت قریب ہے جب وہ (اسلام اور مسلمانوں کے) مددگار بن کر آئیں گے، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ان سے بھلائی کرنا۔"

اس کے علاوہ ایک حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کی یہ خصوصیت بھی بیان فرمائی کہ مصافحے کا طریقہ سب سے پہلے انہوں نے جاری کیا۔[2]

جس مسلمان کو ان احادیث کے ذریعے یمن اور اہل یمن کے فضائل کا علم ہو، اسے یقیناً اس ملک اور اس کے باشندوں کو دیکھنے کا شوق ہوگا۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے یہ فضائل اپنے زمانے کے اعتبار سے بیان فرمائے تھے، اور ضروری نہیں ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہاں وہ اوصاف باقی رہے ہوں، لیکن اول تو ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

دوسرے اللہ تعالیٰ کی سنت کچھ ایسی ہے کہ جب کسی خطے کے لوگوں میں کچھ خاص ملکات ودیعت فرماتے ہیں تو زمانے کے انقلابات سے ان کی عملی تطبیق خواہ کتنی مدھم پڑ گئی ہو، لیکن فطری ملکات کے کچھ نہ کچھ آثار پھر بھی باقی رہتے ہیں۔

بہر کیف! ان وجوہ کی بنا پر یمن دیکھنے کی آرزو مجھے مدت سے تھی اور جامعۃ الایمان کی طرف سے اس دعوت نے اس کا موقع فراہم کر دیا اور میں نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔

---

[1] اخرجه الطبرانی باسناد حسن کمافی مجمع الزوائد، ۱۰: ۵۵

[2] "وهم أول من جاء بالمصافحة" سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب المصافحة، حدیث ۵۲۱۳

مورخہ ۷ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ مطابق یکم جون ۲۰۰۱ء کو صبح آٹھ بجے میں پی آئی اے کے ذریعے دبئ روانہ ہوا، یہاں مجھے صنعاء کے طیارے میں سوار ہونے کے لئے ساڑھے چار گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ معارف القرآن کے انگریزی ترجمے پر نظر ثانی کا کام اکثر میں نے جہازوں ہی میں کیا ہے، پانچ جلدیں بفضلہٖ تعالیٰ اسی طرح مکمل ہوئی ہیں۔ اور اب میرے ساتھ چھٹی جلد میں سورہ طٰہٰ کا حصہ تھا جس کا مسودہ برادر محترم جناب عشرت حسین صدیقی صاحب نے تیار فرمایا ہے۔ دبئ میں انتظار کا یہ وقت میں نے اس پر نظر ثانی میں صرف کیا، یہ جمعہ کا دن تھا اور جمعہ پڑھنے کے لئے ایئر پورٹ سے باہر جانے کا ویزا میرے پاس نہیں تھا۔ ایک بجے میں دبئ ایئر پورٹ میں بنے ہوئے مصلّٰی میں پہنچا، وہاں اتنی تعداد میں لوگ موجود تھے کہ ان کے ساتھ جمعہ کی نماز ہوسکتی تھی۔[1] چنانچہ سب حضرات نے جمعہ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، اور مجھ سے پڑھانے کی، ایک صاحب نے اذان دی۔ میں نے خطبہ دیا اور جمعہ کی نماز پڑھائی۔ اور اس طرح ایئر پورٹ پر جمعہ پڑھانے کا پہلی بار تجربہ ہوا۔

دو بجے یمن ایئر لائنز کا طیارہ دبئ سے روانہ ہوا، اور پہلے بحرین گیا۔ وہاں سے صنعاء کے لئے روانہ ہوا۔ بحرین سے صنعاء تک کا راستہ تین گھنٹے میں پورا ہوا۔ یہ بیشتر وقت بھی میں نے معارف القرآن کے کام میں صرف کیا۔ شام کے چھ بج رہے تھے جب طیارہ صنعاء کے ہوائی اڈے پر اترا۔ جہاز کی سیڑھیوں ہی پر جامعۃ الایمان کے صدر شیخ عبدالمجید زندانی، ناظم اعلیٰ شیخ عبدالوہاب اور دوسرے بہت سے حضرات استقبال کے لئے موجود تھے۔ وی آئی پی لاؤنج میں ہم سے پاسپورٹ اور سامان کے ٹکٹ لے کر کسی انتظار کے بغیر ہوٹل روانہ کر دیا گیا مغرب کی نماز ہم نے ہوٹل پہنچ کر ادا کی۔ یہ ہوٹل فندق صنعاء الدولی تھا جو حال ہی میں تعمیر ہوا ہے، اور اس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کی ابتداء جامعۃ الایمان کے مہمانوں ہی سے ہوئی ہے۔

اگر کراچی سے براہ راست کوئی پرواز صنعاء جاتی تو بمشکل تین ساڑھے تین گھنٹے میں

---

[1] حنفیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے اذن عام کی جو شرط ہے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس بڑے علاقہ میں جمعہ پڑھا جارہا ہے وہاں کے لوگوں کو جمعہ میں شریک ہونے کی ممانعت نہ ہو۔ اگر تحفظ وغیرہ کی وجہ سے کسی بڑے علاقے میں دوسرے افراد کے داخلے پر پابندی ہو تو اس سے جمعہ کی صحت پر اثر نہیں پڑتا۔

یہاں پہنچنا ممکن تھا۔ لیکن واسطہ در واسطہ سفر کے نتیجے میں مجھے یہاں پہنچنے کے لئے بارہ گھنٹے خرچ کرنے پڑے۔ جامعۃ الایمان کے ایک استاذ شیخ عادل حسن امین جو میری کتابوں کے ذریعے مجھ سے واقف تھے، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد رہے ہیں، وہ میرے آنے سے پیشتر ہی کراچی میں بار بار مجھے فون کرتے رہے تھے اور انہوں نے مجھ سے اپنی عربی کتب ساتھ لانے کی فرمائش بھی کی تھی، ایئرپورٹ سے مسلسل میرے ساتھ رہے۔ دبئی سے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے فاضل نواسے ڈاکٹر سلمان صاحب بھی اسی جہاز سے صنعاء پہنچے تھے، ان کے ساتھ شیخ عادل کی قدیم محبت اور بے تکلفی تھی۔ ڈاکٹر سلمان صاحب کے صاحبزادے یوسف صاحب جامعۃ الایمان ہی میں زیر تعلیم ہیں۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد میرے کمرے میں دیر تک ان حضرات کی وجہ سے رونق رہی، رات کا کھانا بھی سب نے یہیں کھایا، اور گیارہ بجے کے قریب اپنے اپنے بستروں کا رخ کیا۔

میرا کمرہ (جو ایک خوابگاہ کے علاوہ ایک کمرہ ملاقات اور ایک کھانے کے کمرے پر مشتمل تھا) پانچویں منزل پر واقع تھا، اور وہاں کی کھڑکی سے صنعاء شہر کی آبادی پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کراچی اور دبئی میں گرمی اپنے شباب پر تھی، لیکن صنعاء کا موسم بڑا خوشگوار تھا۔ کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا دن بھر کی تھکن کے باوجود جسم کو تازگی اور نشاط عطا کر رہی تھی۔ سطح سمندر سے بلند ہونے کی بنا پر مئی جون میں بھی یہاں کا درجہ حرارت ۲۶ سے ۳۰ ڈگری تک رہتا ہے۔ اور انسان سائے میں ہو تو اسے گرمی پریشان نہیں کرتی، ہوٹل نہ ایئر کنڈیشنڈ تھا نہ اس میں کوئی پنکھا تھا، لیکن کھڑکی کھولنے کے بعد کسی مصنوعی ٹھنڈک کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

صبح صادق یہاں چار بجے ہو رہی تھی۔ اس لئے فجر کے بعد بھی کچھ مزید سونا ضروری ہو گیا تھا، لیکن ساڑھے چھ بجے صبح میں دوبارہ اٹھ کر حسب معمول سیر کے لئے باہر نکلا، صنعاء کی سب سے بڑی سڑک شارع ستین ہوٹل کے سامنے تھی۔ اس کے کنارے کنارے آدھے گھنٹے تک تیز قدم سے چلنے کا معمول میں نے پورا کیا اور ہوٹل واپس پہنچ کر ناشتے سے فارغ ہوا تو

میز بان جامعہ کے اجتماع میں لے جانے کے لئے گاڑی لئے تیار تھے۔جامعۃ الایمان یہاں سے تقریباً دس منٹ کے فاصلے پر واقع تھی،اور جب ہم جامعہ کے گیٹ پر پہنچے تو عوام کے ہجوم کی وجہ سے گاڑی کا داخلہ مشکل ہو گیا۔

جامعۃ الایمان

جامعۃ الایمان عرب ممالک کے تعلیمی اداروں میں ایک منفرد حیثیت کی حامل یونیورسٹی ہے برصغیر کے دینی مدارس کی طرح کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا تصور اب عرب ملکوں میں مفقود سا ہو چکا ہے۔سرکاری یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں سے ہٹ کر دینی تعلیم کا کوئی قابل ذکر ادارہ ان ملکوں میں نہیں پایا جاتا،لیکن ''جامعۃ الایمان'' میری معلومات کی حد تک عرب ممالک میں یونیورسٹی کی سطح کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جو سرکاری یونیورسٹی نہ ہونے کے باوجود اتنے بڑے پیمانے پر دینی تعلیم کے لئے قائم ہے۔

جامعہ کے رئیس شیخ عبدالمجید بن عبدالعزیز زندانی یمن کے مشہور اور بااثر علماء میں سے ہیں،جہاد افغانستان کے سلسلے میں وہ کافی عرصہ پاکستان میں بھی مقیم رہے،اور قرآن کریم کے سائنسی اعجاز پر ان کی خصوصی تحقیقات نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔وہ کسی زمانے میں یمن کی پارلیمنٹ میں پارٹی لیڈر رہتے تھے،اور صدر جمہوریہ کے بعد پروٹوکول کے لحاظ سے ملک بھر میں ان کا دوسرا نمبر تھا۔لیکن اپنی علمی دلچسپی کی بنا پر انہوں نے اس منصب سے استعفاء دے کر آج سے سات سال پہلے جامعۃ الایمان کی بنیاد رکھی،اور اس وقت سے تعلیم و تدریس ہی کے کام میں مصروف ہیں۔

''جامعۃ الایمان'' میں انہوں نے کچھ منفرد تجربے کئے ہیں۔انہوں نے اس جامعہ کو محض ایک تعلیمی درسگاہ تک محدود رکھنے کے بجائے اسے عملی اور دعوتی تربیت گاہ بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔چنانچہ اس میں طلبہ کے داخلے کا نظام بھی دنیا بھر سے نرالا ہے۔ان کے یہاں تعلیم ثانویہ کے بعد سے شروع ہوتی ہے اور جو طلبہ داخلے کے علمی امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں، انہیں داخلہ دینے سے پہلے چالیس دن کے ایک عملی امتحانی دور سے گزارا جاتا ہے۔ان چالیس

دنوں میں انہیں مواعظ کی مجلسوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔نماز با جماعت کی پابندی کے علاوہ انہیں ہر رات تہجد کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ ہفتے میں دو دن روزے رکھنے ہوتے ہیں۔روزانہ جسمانی ورزش کا اہتمام کرنا ہوتا ہے، اور کم از کم ایک مرتبہ گھنٹے بھر کی مسلسل دوڑ میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ان تمام امور کے لئے ہر امیدوار طالب علم کے لئے نمبر مقرر ہیں، اور جو طالب علم ان چالیس دن کے دوران مطلوبہ نمبر حاصل کرلے،صرف وہی داخلے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ڈیڑھ ہزار طلباء نے داخلے کی درخواست دی ہے تو ہزار بارہ سو کامیاب ہوتے ہیں۔ کامیاب ہونے کے بعد مذکورہ بالا معمولات پابندیوں کے بجائے ترغیبی امور میں تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن تعلیمی سال کے دوران دو مہینے کے لئے تمام طلبہ کو ملک کے دیہات اور دور دراز پہاڑی مقامات پر تبلیغ و دعوت کے لئے بھیجا جاتا ہے یہ دعوتی دورے غیر نصابی نہیں، بلکہ نصابی سرگرمیوں کا حصہ ہیں جن کے ذریعہ طلبہ عوام سے گھلتے ملتے اور انہیں دینی تعلیمات سے واقف کرنے کی خدمات انجام دیتے ہیں۔سالانہ چھٹی یکم رمضان سے ۱۰ ر شوال تک اور عید الاضحیٰ کے موقع پر دو ہفتے کے لئے ہوتی ہے۔

جامعہ کا نصاب تعلیم سات سال کا ہے۔جن میں سے ابتدائی تین سال تمام طلبہ کے لئے یکساں ہیں اور ان میں تفسیر،حدیث،فقہ،اصول حدیث،اصول فقہ اور علوم عربیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔حفظِ قرآن ہر طالب علم کے لئے لازمی ہے پھر باقی چار سالوں کے لئے مختلف شعبے قائم ہیں جن میں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ متعدد عصری علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ طالبات کی تعلیم کے لئے پردے کے ساتھ الگ انتظام ہے۔ بلکہ جو بچوں والی خواتین علم دین حاصل کرنا چاہیں،ان کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے بھی ایک شعبہ موجود ہے جو ان کے تعلیم حاصل کرنے کے دوران بچوں کی نگرانی کرتا ہے، طالبات کی طرف سے ایک مجلّہ بھی ''الشقائق'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔تعلیم اور قیام وطعام کا انتظام بلا معاوضہ ہے، اور اس وقت جامعہ میں پانچ ہزار طالب علم زیر تعلیم ہیں جو یمن کے مختلف علاقوں کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے ہیں،جن میں سعودی عرب،خلیج کی ریاستیں اور متعدد افریقی

ممالک شامل ہیں، ایک طالب علم پاکستان اور ایک ہندوستان کا بھی ہے۔ ''جامعۃ الایمان'' اس لحاظ سے برصغیر کے بڑے دینی مدارس کے مشابہ ہے کہ وہ پرائیویٹ تعلیمی ادارہ ہے اور اس میں تعلیم اور قیام و طعام کے تمام اخراجات خود جامعہ برداشت کرتا ہے، اور اس کا کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی عوامی چندوں کے سوانہیں ہے۔ لیکن اپنے نصاب و نظام کے لحاظ سے وہ ایک نیا تجربہ ہے۔

اس سال طلبا اور طالبات کی پہلی کھیپ سات سالہ نصاب مکمل کر کے فارغ التحصیل ہو رہی ہے۔ اس موقع پر جامعہ کے بانی شیخ عبدالمجید زندانی نے مناسب سمجھا کہ ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کریں، چنانچہ آج کا یہ جلسہ اسی غرض کے لئے تھا۔

اکثر عرب ملکوں میں اس قسم کے عام جلسوں کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا جیسے برصغیر میں ہوتے رہتے ہیں، لیکن ''جامعۃ الایمان'' کے اس جلسے میں عوام کا اتنا بڑا مجمع اور ان کا جوش و خروش برصغیر کے جلسوں کی یاد دلا رہا تھا۔ اجتماع مسجد کے طویل و عریض ہال میں منعقد کیا گیا تھا، لیکن ہال سے باہر چاروں طرف سامعین کا ہجوم کھلے آسمان کے نیچے دھوپ میں کھڑے ہو کر تقریریں سن رہا تھا۔

اسٹیج کے سامنے پہلی صف میں خصوصی مہمانوں کے لئے دور تک صوفے بچھے ہوئے تھے جن پر جمہوریہ یمن کے نائب صدر، پارلیمنٹ کے اسپیکر اور متعدد وزراء کے علاوہ سعودی عرب، کویت، مصر، اردن، شام، امارات، سوڈان، قطر، پاکستان اور ہندوستان کے علماء کو بٹھایا گیا تھا۔ ان ممالک کے مشاہیر میں شیخ یوسف القرضاوی، شیخ خلیفہ جاسم، شیخ عبدالرزاق الصدیق، ڈاکٹر یاسین غضبان اور شیخ خالد ہنداوی کے نام اس وقت یاد ہیں۔ پاکستان سے میرے علاوہ برادر محترم جناب مولانا سمیع الحق صاحب اور جناب قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی بھی مدعو تھے جن سے وہیں ملاقات ہوئی۔ ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔

ساڑھے نو (۹-۳۰) بجے جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد جامعۃ الایمان کے منتظمین، اور طلبہ کی تقریریں ہوئیں جن میں جامعہ کا تعارف اور اس کی خصوصیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں، یمن کے بعض مشہور علماء اور خطباء نے اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے، اور واقعہ یہ ہے کہ فن خطابت کے لحاظ سے یہ تقریریں بڑے اعلیٰ معیار کی تھیں۔ ایک صاحب نے عربی میں بڑا طویل اور شاندار قصیدہ بھی پیش کیا۔ حاضرین تقریروں اور قصیدوں پر اپنی تحسین کا اظہار تالیوں کے بجائے اللہ اکبر وللہ الحمد کے فلک شگاف نعروں سے کرتے تھے۔

غیر ملکی مہمانوں میں سے بھی دو افراد کو تقریر کے لئے دعوت دی گئی تھی ایک شیخ یوسف القرضاوی اور دوسرا راقم الحروف۔ شیخ یوسف القرضاوی جامعہ کے آغاز ہی سے اس کے نظام و نصاب کی تیاری میں شامل رہے ہیں، اس لئے انہوں نے جامعہ کی خصوصیات اور اس کی ضرورت پر زور دیا، نیز ان لوگوں کی پرزور تردید کی جو سیکولرزم کے شوق میں اسلامی علوم کی تعلیم کو بے فائدہ سمجھتے اور ایسے اداروں کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

شیخ قرضاوی کے بعد مجھے دعوت خطاب دی گئی تو حمد وصلوٰۃ کے بعد احقر نے عرض کیا کہ آج پہلی بار یمن آ کر میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے، یمن دیکھنے اور اہل یمن کے ساتھ قریب سے ملاقات کرنے کا شوق مجھے سیر وسیاحت کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے یمن اور اہل یمن کو ایمان وحکمت کا تمغہ عطا فرمایا ہے لہٰذا اگر دنیا کے دوسرے لوگ اپنے خوبصورت مناظر، اپنی ترقی یافتہ صنعتوں اور جگمگ کرتے ہوئے تمدن پر فخر کریں تو اہل یمن آپ کے فخر کے لئے آنحضرت ﷺ کا عطا فرمایا ہوا یہ پرنور تمغہ کافی ہے جس سے بڑھ کر فخر کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ اعزاز جتنا قابل فخر ہے اس کے تقاضے اتنے ہی نازک اور اس کی ذمہ داری اتنی ہی بڑی ہے۔ لہٰذا یمن کے عوام، علماء، اور حکام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایمان اور حکمت کو مشرق ومغرب میں پھیلانے کے لئے قیادت کا کردار ادا کریں۔ اور دنیا کے سامنے ایمان وحکمت کی حسین عملی تصویر پیش کر کے ان دشمنان اسلام کا منہ بند کریں جو اسلام کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ یمن اور ایمان کا جس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے، اس کا تقاضا یہی تھا کہ یہاں جامعۃ الایمان جیسے ادارے قائم ہوں جن میں ایمان وحکمت کے عملی پیکر تیار کئے جائیں۔

اس تمہید کے بعد میں نے مختصراً ان امور کی طرف توجہ دلائی جو جامعہ اور اس کے فارغ التحصیل طلبہ کو مدنظر رکھنے چاہئیں۔

شیخ عبدالمجید زندانی نے جو صوفوں پر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے رفقاء کے ساتھ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اسٹیج پر آ کر جامعہ میں اپنی سات سالہ کاوشوں کا خلاصہ اور آئندہ کے منصوبے بیان کئے۔ آخری تقریر جمہوریہ یمن کے نائب صدر کی تھی، انہوں نے لکھی ہوئی تقریر عوامی لب ولہجہ میں پیش کی، اور اسلامی علوم کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ حکومت کی طرف سے اس کی تائید وحمایت کا اعلان کیا۔

تقریروں کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ شیخ عبدالمجید نے اس سندوں کا نام ''شہادۃ'' یا ڈگری وغیرہ نہیں رکھا بلکہ انہیں ''اجازات'' کا نام دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈگری عہد جدید کی ایجاد ہے۔ بزرگان سلف اپنے شاگردوں کو ڈگری نہیں ''اجازت'' دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی ان اسناد کا نام ''اجازات'' رکھا ہے۔

پھر اس تقریب کا سب سے زیادہ رقت انگیز منظر وہ تھا جب شیخ عبدالمجید زندانی نے فارغ التحصیل طلبہ سے خدمت دین کا عہد لیا، تمام فارغ التحصیل طلبہ جو سو سے زیادہ تھے نیلے رنگ کی خوبصورت قبا اور سر پر ایک خوبصورت اور مختصر عمامے میں ملبوس تھے۔ عہد کے وقت وہ سب ایک قطار میں کھڑے ہو گئے، یہ ایک بڑا پرجوش اور مؤثر عہد نامہ تھا جو شیخ عبدالمجید پڑھتے جاتے اور فارغ التحصیل طلبہ اس کو دہراتے جاتے۔ اس طرح طلبہ سے یہ عہد لیا گیا کہ جو علم انہوں نے پڑھا ہے، حتی الوسع وہ اسے اپنی زندگیوں میں اپنائیں گے، اور مرتے دم تک اسے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ جس وقت طلبہ یہ عہد کر رہے تھے، اس وقت ان میں سے بعض کی آنکھیں پرنم تھیں۔

ایک بجے کے قریب اس دلکش تقریب کا اختتام ہوا۔ عوام کے شدید ہجوم کی وجہ سے باہر نکل کر گاڑی تک پہنچنا مشکل ہوگیا، ہر شخص غیر ملکی مہمانوں سے مصافحہ کرنے کی فکر میں تھا، اور اس کے چہرے پر اسلامی اخوت ومحبت کی جھلک صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

اس روز دوپہر کو یمن کی پارلیمنٹ کے صدر (رئیس مجلس النواب) شیخ عبداللہ الاحمر نے اپنے مکان پر غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام کیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ صنعاء شہر کے وسط میں ایک قدیم طرز کی کشادہ حویلی کی شکل میں ہے۔ غیر ملکی مہمانوں کے علاوہ بہت سے اعیان حکومت اور معززین شہر بھی دعوت میں شریک تھے۔

دعوت میں یمن کی قومی روایات پوری طرح جلوہ افروز تھیں۔ تمام حضرات یمن کے قومی لباس میں ملبوس تھے جس کا ایک لازمی حصہ وہ خنجر بھی ہے جو کمر کی گرد بندھے ہوئے ایک پٹکے سے لٹکا رہتا ہے۔ اس خنجر کو یہاں "جنبیہ" کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہر شخص کے پہلو میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ قبائلی زندگی کے دور میں یہ ایک ہتھیار تھا جو ہر شخص اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا، اب اس کا یہ استعمال تو شہری زندگی میں متروک ہی ہوگیا ہے، لیکن وہ اہل یمن کے لباس کا ایک حصہ بن گیا ہے، اور اس میں نت نئی گلکاریاں کی جاتی ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ میزبان (یعنی شیخ عبداللہ الاحمر) کا خنجر ایک لاکھ یمنی ریال سے زیادہ قیمت کا تھا۔ لباس کا یہ مخصوص انداز دنیا بھر میں یمن کے علاوہ عمان میں بھی نظر آتا ہے، مگر عمان بھی درحقیقت قدیم یمن ہی کا ایک حصہ رہا ہے، کھانے کی نشست فرشی تھی، ایک بڑے ہال کے قالینوں پر دسترخوان بچھائے گئے تھے اور کھانے تمام تر یمنی تھے۔ اہل یمن کے یہاں بکرے اور دنبے کا گوشت پکانے کے بڑے متنوع طریقے رائج ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی نمائندگی کھانوں میں موجود تھی اور واقعۃً ہر طریقے کی لذت جدا تھی۔ عام طور سے ہم جب اپنے دیسی کھانوں کے عادی ہوجاتے ہیں تو کسی اور ملک کے کھانے ذائقے کے نہیں لگتے، لیکن اس دعوت کے تمام کھانے ہمارے ذوق کے لحاظ سے بھی بڑے اعلیٰ درجے کے تھے۔ اتفاق سے میزبان یعنی شیخ عبداللہ الاحمر میرے

قریب ہی بیٹھے تھے، اور انہوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی کا نشانہ مجھے اور مولانا سمیع الحق صاحب ہی کو بنایا، اور ہماری پلیٹ بار بار بھرتے رہے اور روکنے کے باوجود نہ مانے۔ آخر میں ایک بڑے تھال میں پراٹھے نما ایک چیز لائی گئی۔ یہ گھی میں بنی ہوئی بہت بڑی روٹی تھی جو وسیع و عریض تھال میں پھیلی ہوئی تھی اور اس پر شہد بہہ رہا تھا۔ شیخ احمر نے بتایا کہ یہ یمن کی خاص ڈش ہے اور اسے ''بنت الصحن'' (تھال کی لڑکی) کہا جاتا ہے۔ یہ اہل یمن کی بڑی مرغوب غذا ہے جو خاص دعوتوں میں پیش کی جاتی ہے اور اس پر جو شہد بہہ رہا ہے وہ بیری کا خالص شہد ہے جو یمن کا خاص تحفہ ہے۔

بہر کیف! ہم عصر کے وقت اس پر لطف دعوت سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس پہنچ سکے۔

صنعاء شہر

کچھ دیر ہوٹل میں آرام کے بعد مغرب سے کچھ پہلے ہم اپنے رہنما شیخ حسن عادل امین کے ساتھ صنعاء شہر کی کچھ یادگاریں دیکھنے کے لئے نکلے۔ برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب بھی ساتھ تھے۔ اور گاڑی ہم تینوں کو لے کر صنعاء کے مختلف محلوں سے گزرنے لگی۔

صنعاء دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے جس پر قدامت کے آثار آج بھی نمایاں ہیں بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کی پہلی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے غمدان بن سام نے رکھی تھی[1]۔ اس شہر کا قدیم نام ازال تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بعد میں جب حبشہ کے لوگ یہاں آئے اور دیکھا کہ یہ شہر پتھروں کا بنا ہوا ہے تو انہوں نے کہا ''صنعہ، صنعہ'' حبشی زبان میں اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شہر بڑا مضبوط ہے۔ اس وقت سے اس شہر کا نام صنعاء مشہور ہو گیا[2]۔ یہ شہر بہت سی قدیم تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس پر سلطنت کسریٰ کا تسلط تھا، اور کسریٰ کی طرف سے اس پر باذان نام کے ایک گورنر حکومت کرتے تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مسلمان ہونے کی توفیق

---

[1] معجم ما استعجم، للبکری ص ۸۴۳ ج ۲

[2] معجم البلدان للحموی ص ۲۶ ج ۴

نجاشی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کو اپنی طرف سے گورنر مقرر فرمایا[۱]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دور میں یہاں جھوٹے مدعی نبوت اسود عنسی نے خاصا زور باندھا، بہت سے لوگ اس کے دام فریب میں آ گئے، اور بالآخر اس نے حضرت باذان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے صنعاء پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اس کی حکومت زیادہ دیر نہیں چلی، حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے جو یمن کے باشندے تھے اسود عنسی کو قتل کر کے صنعاء کو اسود عنسی سے آزاد کرالیا۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو اس واقعے کی خبر پہنچائی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بتایا کہ اسود عنسی قتل ہو چکا ہے اور اسے فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ہے[۲]۔ اس کے بعد سے یہ شہر مسلسل مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا ہے۔

ہماری منزل اس وقت صنعاء کا قدیم شہر تھا، لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جدید شہر کے مختلف محلوں سے گزرتے ہوئے مغرب کا وقت ہو گیا۔ اس لئے ہم راستے کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے رکے۔ اذان مکمل ہونے کے بعد بھی مؤذن لاؤڈ اسپیکر سے کچھ کلمات ادا کر رہا تھا، قریب پہنچنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دعائیں پڑھ رہا ہے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں یہ رواج ہے کہ مؤذن اقامت سے کچھ پہلے دعائیں پڑھتا ہے، اور دعاؤں کے بعد اقامت کہتا ہے اور یہاں کی بیشتر مسجدوں میں یہ طریقہ رائج ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں لوگوں کے طریق کار کو دیکھ کر اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ سنت کے طریقے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہیں، وہ تو ایک ہی ہیں، چنانچہ دنیا کے جس خطے میں چلے جایئے، وہ قدر مشترک تمام مسلمانوں میں نظر آئیگی، لیکن ''بدعت'' چوں کہ انسانی ذہن کی اختراع ہوتی ہے اور ہر انسان کے ذہن کا انداز جدا ہے، لہٰذا بدعتیں مختلف ملکوں میں مختلف طریقے کی رائج ہیں۔ ایک طریقہ جو ایک ملک میں ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس پر حد سے زیادہ اصرار کیا جاتا ہے، دوسرے ملک والوں کو اُس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اقامت سے پہلے بلند آواز سے دعا کرنے کا یہ طریقہ میں نے کسی

۱۔ الاصابہ، للحافظ ابن حجر ''باذان''

۲۔ الاستیعاب لابن عبدالبر ص ۲۰۴ و ۲۰۵، ج ۳

اور اسلامی ملک میں نہیں دیکھا۔

مغرب کی نماز کے بعد شیخ عادل نے ہمیں ایک قدیم محلے سے گزارا جو بوسیدہ عمارتوں پر مشتمل تھا۔ یہاں ایک مسجد کے عقب میں انہوں نے ہمیں ایک مقفل کمرے کے سامنے لیجا کر کھڑا کر دیا جہاں دور دور تک اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس مقفل کمرے میں دو قبریں ہیں۔ اُن میں سے ایک قبر حضرت فروہ ابن مُسیک رضی اللہ عنہ کی ہے، اور دوسری علامہ محمد بن ابراہیم بن الوزیر الصنعانی رحمہ اللہ کی۔

حضرت فروہ بن مُسیک رضی اللہ عنہ اُن خوش نصیب صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جو ۹ھ یا ۱۰ھ میں یمن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اُن کے قبیلے بنی مراد اور بنی مذحج کے لیے اپنا نمائندہ مقرر فرمایا تھا۔[1]

یوں تو صنعاء میں اور بھی بہت سے صحابہ کرامؓ مدفون ہوں گے، لیکن شیخ عادل نے بتایا کہ اُن میں سے صرف حضرت فروہ بن مُسیکؓ کی قبر یہاں معروف ہے۔ اور انہی کے نام پر قریبی مسجد کا نام ''مسجد مُسیک'' ہے، بلکہ شاید پورا محلّہ بھی مُسیک ہی کہلاتا ہے۔ قبر جس کمرے میں ہے، اس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ لیکن قریب ہی کچھ بچے کھیل رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ باہر کے کچھ لوگ اس مقفل دروازے کے سامنے کھڑے ہیں تو ایک بچہ کہیں سے کمرے کی چابی اور ایک ٹارچ لے آیا، تالا کھولا تو اندر کمرے کے بجائے ایک غار کی سی شکل نظر آئی اور ٹارچ کی روشنی میں دو قبریں دکھائی دیں۔ یہاں سلام عرض کرنے اور فاتحہ پڑھنے کی توفیق ہوئی۔

دوسری قبر علامہ محمد بن ابراہیم الوزیر الصنعانیؒ کی تھی یہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے معروف علماء میں سے تھے جنکی بہت سی تصانیف ہیں لیکن ان میں سے ''العواصم والقواصم فی الذب عن سنة ابی القاسم'' اور ''الروض الباسم'' بہت مشہور و معروف ہیں۔ یہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں اور ان کا پورا گھرانہ زیدی تھا، مگر

---

[1] الاصابہ ص ۲۰۵ ج ۳

حافظ ابن حجرؒ نے ان کے بھائی علامہ ہادی بن ابراہیم الوزیر کا تذکرہ کرتے ہوئے دو سطریں ان کے بارے میں بھی لکھی ہیں اور فرمایا ہے کہ

مقبل على الاشتغال بالحديث، شديد الميل الى السنة بخلاف اهل بيته۔[۱]

وہ علم حدیث کی مشغولیت کی طرف پوری طرح متوجہ ہیں، اور اپنے گھر والوں کے برخلاف سنت کی طرف شدید میلان رکھتے ہیں۔

حافظ سخاویؒ نے "الضوء اللامع" میں ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے زیدیت کی تردید کے لئے "العواصم و القواصم" لکھی ہے۔ البتہ حدیث اور فقہ میں وہ بذات خود اجتہاد فرماتے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کی فقہ کے پابند نہیں تھے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے کم وبیش انہی کا طریقہ اختیار کیا، اور ان کو "مجتہد مطلق" قرار دیا۔ اور ان کے علم وفضل کے بارے میں غیر معمولی الفاظ لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

والذى يغلب على الظن ان شيوخه لو جمعوا جميعا فى ذات واحدة لم يبلغ علمهم الى مقدار علمه، وناهيك بهنا ...... ولو قلت: ان اليمن لم تنجب مثله لم ابعد عن الصواب۔[۲]

اور میرا غالب گمان یہ ہے کہ اگر ان کے تمام اساتذہ کو ایک ذات میں جمع کر دیا جائے تو ان سب کا علم ان کے علم کی مقدار کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے...... اور اگر میں یہ کہوں کہ یمن نے ان جیسا کوئی پیدا نہیں کیا تو میں راہ صواب سے دور نہیں ہوں گا۔

ان کا کافی زمانہ اہل عصر کے ساتھ علمی مجادلوں اور مناظروں میں گزرا، لیکن آخر زمانے میں انہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لئے وقف کر لیا تھا، گوشۂ عزلت اختیار کر کے عبادت

---

[۱] انباء الغمر فى ابناء العمر، للحافظ ابن حجر ج ۷ ص ۳۷۲ (طبع دکن)

[۲] البدر الطالع للشوكانى ص ۹۲ ج ۲

میں مشغول رہتے اور عمر کا جو حصہ معاصرین کے ساتھ مباحثوں میں گزرا تھا، اس پر افسوس کا اظہار فرماتے تھے۔ [1]

یہاں سے کچھ دور چلنے کے بعد قدیم شہر صنعاء کی فصیل نظر آنے لگی، فصیل کے ایک دروازے سے کار اندر داخل ہوئی، اور ایسا محسوس ہوا کہ ہم صدیوں پہلے کے کسی شہر میں داخل ہوگئے ہیں۔ قلعہ بند شہر اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں اور مجھے انہیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے، لیکن یہ قلعہ بند شہر اس لحاظ سے سب میں ممتاز ہے کہ یہ اب بھی باقاعدہ جیتا جاگتا شہر ہے، بلکہ اس کی صفائی ستھرائی اور حسن ترتیب مجھے صنعاء کے جدید علاقے سے زیادہ محسوس ہوئی۔ پتھر یا اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں اور گلیاں اپنے طرز و اسلوب کے اعتبار سے تو قدیم معلوم ہوتی ہیں، لیکن اپنی پختگی اور رونق کے اعتبار سے ان پر بوسیدگی کے آثار نظر نہیں آتے۔

اس قلعہ بند شہر میں ہماری منزل مقصود یہاں کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی مسجد "جامع الکبیر" تھی اور جب ہم وہاں پہنچے تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ یہ مسجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں تعمیر ہوگئی تھی۔ جب حضرت باذان رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صنعاء کا حاکم مقرر فرمایا تھا یہاں ان کا ایک باغ تھا جو انہوں نے مسجد کے لئے وقف کر دیا تھا، لیکن مسجد کی تعمیر کی سعادت ایک اور صحابی حضرت وبر بن یحنس رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی، یہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، اور جب واپس جانے لگے تو آپ ﷺ نے انہیں صنعاء میں مسجد بنانے کا حکم دیا۔ انہوں نے صنعاء پہنچ کر یہاں مسجد تعمیر کی[2]۔ اب تو یہ مسجد بہت وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہال قبلے کی سمت میں ہے، اور دوسرا ہال عقبی حصے میں، اور دونوں کے درمیان ایک وسیع صحن ہے۔ عقبی حصے کے ہال میں دو ستون ہیں جن میں سے ایک پر "منقورہ" لکھا ہوا ہے اور دوسرے پر "مسمورہ" ان دونوں ستونوں کے درمیان کا حصہ وہ مسجد

---

[1] البدر الطالع للشوکانی ص۹۲ ج۲

[2] الاصابہ ص ۶۳۰ ج ۳ ترجمہ نمبر ۹۱۰۶

ہے جو حضرت وبر بن یحنس رضی اللہ عنہ نے تعمیر فرمائی تھی۔

ہم عشاء کی اذان کے بعد مسجد میں داخل ہوئے اور تازہ وضو کرنے کے لئے وضو خانے کی طرف چلے تو دیکھا کہ وضو خانے کے نلوں اور ہمارے درمیان ایک حوض حائل ہے جس سے گذرے بغیر نلوں تک پہنچنا ممکن نہیں۔ لوگ اسی حوض میں سے بلا تکلف آ جا رہے تھے۔ ہم نے نلوں تک پہنچنے کے لئے کوئی خشک راستہ تلاش کرنا چاہا۔ مگر وہ نہ ملا۔ بالآخر ہمارے رہنما نے کہا کہ آپ موزے وغیرہ اتار کر اسی حوض میں پاؤں رکھ کر آ یئے۔ ہم اس غیر متوقع صورت حال کی وجہ سے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے، مگر نماز تیار تھی اس لئے رہنما کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ ہم نے پانی میں پاؤں ڈالے اور چوتھائی پنڈلیوں تک پانی میں چلتے ہوئے دوسرے کنارے پہنچے، اور وہاں نل سے وضو کرنے کے بعد دوبارہ اسی حوض سے گزر کر مسجد میں داخل ہوئے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ انتظام اس لئے ہے کہ وضو خانے میں وضو کرنے کے بعد جب لوگ فرش پر ننگے پاؤں چل کر آتے ہیں تو گیلے فرش پر کسی گندگی کا احتمال ہو سکتا ہے، اس لئے از راہ احتیاط مسجد میں داخل ہونے سے پہلے یہ حوض بنا دیا گیا ہے تا کہ ہر شخص زبردستی اپنے پاؤں حوض میں بھگو کر مسجد میں داخل ہو۔

بہر صورت!...... اس قدیم مسجد میں نماز پڑھنے کا کچھ عجیب لطف تھا۔ نماز کے بعد امام صاحب سے تعارف ہوا، اور انہوں نے مسجد کے مختلف حصے بڑی محبت سے دکھائے، یہ وہ مسجد تھی جس میں صحابہ کرامؓ، تابعین اور بزرگان دین رحمہم اللہ نے نمازیں پڑھیں، جہاں بڑے بڑے محدثین، فقہاء کرام اور علمائے امت رحمہم اللہ کے حلقہ ہائے درس قائم ہوئے۔ اس مسجد کی فضا میں ان بزرگوں کے انفاس قدسیہ کی مہک اب بھی بسی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یمن چونکہ بڑے بڑے علماء کا مرکز رہا ہے، اس لئے دوسرے علاقوں کے علماء بھی یہاں کے اہل علم سے استفادے کے لئے یمن کا سفر کرتے رہے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فقرہ تو مشہور ہی ہے کہ

لا بدّ من صنعاء وان طال السفر

سفر کتنا لمبا ہو، مگر صنعاء کے بغیر چارہ نہیں

چنانچہ مشہور محدث امام عبدالرزاق صنعانیؒ سے حدیث حاصل کرنے کے لئے انہوں نے صنعاء کا سفر کیا، اور مدتوں یہاں مقیم رہے۔

اس مسجد کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں قدیم مخطوطات بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں، لیکن رات کے وقت وہ کتب خانہ بند ہو چکا تھا، اس لئے ہم عشاء کی نماز پڑھ کر وہاں سے نکل آئے۔ شیخ عادل نے اپنے مکان پر رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا، اور وہاں متعدد دوسرے علماء کو بھی مدعو کیا تھا۔ چنانچہ رات کا کھانا ان کے یہاں کھایا، جہاں اہل علم کے ساتھ دیر تک دلچسپ مجلس رہی، اور رات گیارہ بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس پہنچ سکے۔

صنعاء سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر قوم سبا کا مشہور علاقہ مارب ہے جہاں اس بند (سد مارب) کے کچھ آثار اب بھی باقی بتائے جاتے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے سورۂ سبأ میں اشارہ فرمایا ہے۔ میری خواہش تھی کہ وہاں بھی جانا ہو جائے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اتوار کی شام کو میری واپسی کی پرواز بک تھی، دوسری طرف مأرب سے شام تک واپسی مشکوک تھی۔ شیخ عبدالمجید زندانی نے کہا میرا دل تو چاہتا ہے کہ آپ وہاں جائیں لیکن عقل روکتی ہے۔ کیونکہ راستہ خاصا دشوار گزار ہے، اور شام تک واپسی مشکوک بھی ہے اور واپسی ہو بھی گئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ بری طرح تھک چکے ہوں گے، اور آگے کے سفر کے قابل نہ ہوں گے۔ میں سد مأرب دیکھنے کے لئے یمن میں مزید رک جاتا، لیکن اگلے دن واپسی کی کوئی پرواز میسر نہیں تھی۔ اس لئے واپسی کئی دن مؤخر ہو جاتی جو میرے لئے قابل عمل نہ تھی۔ لہٰذا میں نے بادل ناخواستہ یہ پروگرام ملتوی کر دیا۔ البتہ برادر محترم مولانا سمیع الحق صاحب اور امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحب کو چونکہ مزید ٹھہرنا تھا، اسلئے وہ وہاں کے لئے روانہ ہو گئے۔

مأرب کے بجائے صبح کے وقت میں نے یہاں کا عجائب گھر مخطوطات کا کتب خانہ اور ضروان کا علاقہ دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے ہم شہر صنعاء کے قدیم عجائب گھر گئے، یہ عجائب گھر یمن کے عالم حکمران شیخ مرتضیٰؒ کی تعمیر کردہ ایک محل نما عمارت میں واقع ہے۔ اور

اس میں یمن کی مختلف قدیم تہذیبوں کے آثار موجود ہیں، جن میں قوم سبأ اور حمیر کے آثار کے علاوہ عہد اسلام کی بہت سی یادگاریں محفوظ ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ بہت سی قدیم تاریخی یادگاروں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ متعدد غیر ملکی (بلکہ غیر مسلم) افراد یا عجائب گھروں کو فروخت کر دی گئیں۔

عجائب گھر سے نکل کر ہم صنعاء کے قدیم قلعہ بند شہر کے دروازے پر پہنچے۔ یہ دروازہ آج بھی پر شکوہ ہے اور شاید یہی وہ دروازہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احزاب کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور یہ پیشن گوئی کی گئی تھی کہ دنیا کا یہ قدیم شہر بھی اسلام کے زیر نگیں آنے والا ہے۔[1]

حدیث میں ایک پھل ''اترج'' کا ذکر آتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس کا ذائقہ بھی اچھا ہے اور خوشبو بھی۔ جو شخص اپنے علم سے خود بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچاتا ہے آپ ﷺ نے اس کو ''اترج'' سے تشبیہ دی ہے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اترج یمن میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے میں نے شیخ عادل سے فرمائش کی تھی کہ اگر وہ بازار میں مل جائے تو میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، انہوں نے یہاں گاڑی روک کر بازار میں تلاش کیا معلوم ہوا کہ ابھی اس کا پورا موسم نہیں آیا۔ البتہ ایک ٹھیلے والا کچھ کچے اترج لئے کھڑا تھا، شیخ عادل نے تجربے کے لئے اس کا ایک دانہ لے لیا، ابھی کچا ہونے کی بناء پر اس کا ذائقہ تو معمول کے مطابق نہیں ہوا تھا، البتہ ہلکی چاشنی پیدا ہوگئی تھی لیکن خوشبو اس حالت میں بھی عمدہ تھی پکنے کے بعد یقیناً ذائقہ اور خوشبو دونوں عمدہ ہوں گے۔

ظہر کی نماز ہم نے ایک بار پھر ''الجامع الکبیر'' میں پڑھی اور نماز کے متصل بعد مخطوطات کے کتب خانے کی سیر کی۔ اس میں سب سے اہم مخطوطہ قرآن کریم کا نسخہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت سلمان

---

[1] مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی

فارسی رضی اللہ عنہ کی مشترک کوششوں سے لکھا گیا ہے۔ مشہور یہ بھی ہے کہ یہ ان نسخوں میں سے ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھوا کر عالم اسلام کے مختلف خطوں میں بھجوائے تھے اور یہ نسخہ صنعاء بھجوایا تھا۔ اگر چہ اس بات کی کوئی سند تو موجود نہیں، مگر یہاں کے اہل علم کا کہنا ہے کہ زمانہ قدیم سے اہل صنعاء میں یہ روایت ایک مسلمے کے طور پر نقل ہوتی آئی ہے۔ نسخے کے آخر میں لکھنے والے کا نام ''علی بن ابو طالب'' لکھا ہوا ہے۔ اس کی بنا پر بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے کوئی اور ہوں۔ کیونکہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ لکھنے والے ہوتے تو ''علی بن ابی طالب'' لکھتے۔ لیکن یمن کے بعض علماء نے بیان فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنے آپ کو ابن ابو طالب لکھنا بعض دوسرے ذرائع سے بھی ثابت ہوا ہے۔ اور نحوی اعتبار سے اس کی توجیہ ہو سکتی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

اس کتب خانے میں پہلی صدی ہجری سے لے کر چوتھی صدی ہجری تک کے لکھے ہوئے قرآن کریم کے بہت سے نسخے محفوظ ہیں، ان میں سے بیشتر ہرن کی کھال (رق) پر لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن دیکھنے میں وہ اعلیٰ درجے کا کاغذ نظر آتا ہے۔ یہ نسخے بعض خط کوفی میں ہیں، بعض خط حمیری میں، اور کچھ خط نسخ میں بھی۔ بہت سے مشہور اہل علم کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں بھی یہاں محفوظ ہیں جن میں حافظ ابن حجرؒ کی تحریر بھی شامل ہے، لیکن مصنفین کے اصلی خط میں لکھی ہوئی کتابیں بوسیدہ ہونے کی بنا پر الگ خزانے میں محفوظ کر لی گئی ہیں، اور زائرین ان کی تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔

ظہر کے بعد جمعیۃ الاصلاح نے مندوبین کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام کیا تھا۔ صنعاء کے دونوں جانب پہاڑ ہیں۔ ایک کو عیبان اور دوسرے کو نقم کہا جاتا ہے۔ عیبان پہاڑ پر ایک چھوٹی سی تفریح گاہ بنی ہوئی ہے اس میں ایک ریسٹورنٹ بھی ہے۔ اس ظہرانے کا انتظام اسی ریسٹورنٹ کے پرفضا ماحول میں کیا گیا تھا۔ جون کے مہینے میں دن کے دو بجے تھے، مگر یہاں کی ہوا و فضا میں بڑی خوشگوار خنکی موجود تھی، تمام مہمان اس پرفضا ماحول میں بہت لطف اندوز ہوئے۔

اصحاب الجنّۃ کی جگہ، ضروان

صنعاء شہر سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک جگہ ضروان کے نام سے موسوم ہے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ القلم میں ''اصحاب الجنۃ'' کا جو واقعہ ذکر فرمایا ہے، وہ ضروان میں پیش آیا تھا۔ واقعہ مختصراً یہ ہے کہ ایک نیک اور خدا ترس شخص نے انواع واقسام کے پھل دار درختوں پر مشتمل ایک وسیع وعریض باغ لگایا تھا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ جب کسی پھل کی کٹائی کا وقت آتا تو وہ سب سے پہلے علاقے کے غرباء میں اپنے باغ کی پیداوار تقسیم کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح باغ کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ ضرورت مندوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔

جب اس شخص کا انتقال ہوا اور باغ اس کی ناخلف اولاد کی طرف منتقل ہوا تو اولاد نے کہا کہ ہمارا باپ (معاذ اللہ) بے وقوف تھا کہ باغ کی دولت کا بڑا حصہ دوسروں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ ہم اس احمقانہ معمول کو جاری نہیں رکھیں گے۔ چنانچہ جب کٹائی کا وقت آیا تو انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ کوئی غریب آدمی باغ کے پاس بھی نہ جاسکے۔ یہ انتظام کر کے وہ رات کو سوئے، صبح کو دولت کے نشے میں یہ سوچ کر باغ کی طرف روانہ ہوئے کہ آج ہم بلاشرکت غیرے باغ کی پیداوار سے فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی بدنیتی کی بنا پر انہیں یہ سزا دی کہ رات رات میں پورا باغ تباہ ہو گیا۔ جب یہ لوگ صبح کو باغ میں پہنچے تو وہاں کچھ باقی نہ بچا تھا۔

قرآن کریم نے یہ واقعہ عبرت کے لئے بیان فرمایا ہے، لیکن یہ صراحت نہیں فرمائی کہ یہ کہاں پیش آیا تھا۔ اگرچہ بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حبشہ کی کسی جگہ کا واقعہ ہے، لیکن زیادہ تر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ یمن میں پیش آیا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرمایا ہے کہ:

کانوا من قریة یقال لها: ضروان علی ستة امیال من

صنعاء[1]

یہ لوگ ایک بستی کے باشندے تھے جس کا نام ضروان ہے اور جو صنعاء
سے چھ میل دور واقع ہے

''ضروان'' نامی بستی آج بھی صنعاء سے کچھ فاصلے پر موجود ہے (البتہ اب اسے ض کے بجائے ذال سے ذروان لکھنے لگے ہیں) اور یہاں کے علماء نے بتایا کہ یمن میں یہ بات تقریباً تواتر سے مشہور ہے کہ یہی وہ بستی ہے جہاں کا واقعہ قرآن کریم نے سورۃ القلم میں بیان فرمایا ہے۔ خیال ہوا کہ جانے سے پہلے اس بستی کی اس عبرت گاہ کو بھی دیکھ لیا جائے۔ جسے قرآن کریم نے اس اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

شام کو میری واپسی کی پرواز آٹھ بجے تھی۔ میرے میزبان میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ لے کر پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچنے کا وعدہ کر چکے تھے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ضروان ہوتا جاؤں۔ چنانچہ عصر کی نماز کے بعد تقریباً ساڑھے پانچ بجے ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب بھی ہم سفر تھے، ایئرپورٹ جانے والی روڈ سے جب ہم ضروان جانے والی سڑک پر مڑے تو سامنے سورج افق کی طرف ڈھل رہا تھا، اور اس کے متصل ایک پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ شیخ عادل نے بتایا کہ یہ جبل ضین ہے، اور انہوں نے اپنے معتبر اساتذہ سے سنا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے حضرت وبر بن یحنس رضی اللہ عنہ کو صنعاء میں مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا تو یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا قبلہ ضین نامی پہاڑ کی طرف رکھنا۔[2] اس وقت سورج کے رخ سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ قبلہ ٹھیک جبل ضین کی سمت واقع ہے۔

صنعاء شہر سے نکلنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ان کے درمیان کشادہ وادیاں نظر آ رہی تھیں، ان وادیوں میں ایک ہی طرح کے کھیت دور تک پھیلے

---

[1] تفسیر ابن کثیرؒ ص ۴۰۶ ج ۴

[2] بعد میں مجھے روایت مل گئی: اخرج ابن السکن وابن منده من طریق عبدالملک بن عبدالرحمن الذماری ان وبر بن یحنس هو الذی امره النبی صلی الله علیه وسلم ببناء هذا المسجد وامره بان یجعل قبلة الجامع الی جبل ضین

ہوئے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ''قات'' کے درخت ہیں۔ ''قات'' ایک گھاس کا نام ہے جس کے پتے لمبے ہوتے ہیں، اور یہ اہل یمن کی کمزوری ہے۔ پان، تمباکو اور نسوار کی طرح ''قات'' چبانا اہل یمن کا وہ مشغلہ ہے جس کی وجہ سے وہ زبردست تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس میں ہلکا سا نشہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ محض نشاط کے لئے استعمال کی جاتی ہے، لیکن پان تمباکو، اور نسوار کے مقابلے میں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ پان وغیرہ چلتے پھرتے اور کام کے دوران بھی کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ''قات'' خوری اپنا کوئی حریف برداشت نہیں کرتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے بہت سا وقت دیا جائے۔ چنانچہ اہل یمن عموماً کھانے کے بعد ''قات'' کو منہ میں لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اور بعض اوقات کئی گھنٹے اسی مشغلے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ بعض علماء نے تو قات کو نشہ آور قرار دے کر ناجائز قرار دیا ہے، لیکن اکثر علماء اسے نشہ آور تو نہیں مانتے، لیکن وقت اور مال کی اضاعت کی وجہ سے اس سے منع کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قات مہنگی بھی بہت ہے اور اس کے جو کھیت ہمارے سامنے پھیلے ہوئے تھے ان کی حفاظت کے لئے بڑے سخت انتظامات کئے جاتے ہیں۔ تقریباً آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد گاڑی ضروان کی حدود میں داخل ہوئی، یہاں ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ ''اصحاب الجنۃ'' کی خاص جگہ بستی سے آگے واقع تھی، چنانچہ ہم بستی والوں سے پتہ پوچھتے ہوئے آگے بڑھے، اور ایک پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد نیچے اترے تو ایک عجیب عبرتناک منظر سامنے تھا۔ اب تک جتنا علاقہ ہم نے طے کیا تھا اس میں پہاڑوں اور زمین کی مٹی حسب معمول خاکی رنگ کی تھی۔ لیکن یہ جگہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہیں وہ باغ تھا جو عذاب الٰہی کے نتیجے میں تباہ ہو گیا تھا، پوری کی پوری سیاہ تھی۔ اور نہ صرف سیاہ تھی، بلکہ زمین میں کالے کالے کانٹوں کی طرح کے پتھر اس کثرت سے نظر آ رہے تھے کہ اس پر چلنا دشوار تھا۔ اگرچہ کالے پتھروں کی زمین دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ (مدینہ منورہ کے اطراف میں حرہ کے نام سے ایسی کئی زمینیں ہیں) لیکن اس سیاہ فام زمین کا انداز ان سے مختلف تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہاں کوئی شدید آگ لگی ہے جس نے پورے

علاقے کو بھسم کر دیا ہے، اور بہت وسیع وعریض علاقہ اس کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ چونکہ آس پاس کے علاقوں میں اس طرح کی کوئی اور زمین نہیں ہے، اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب ہی کے آثار ہیں جو صدیاں گذرنے کے باوجود اب تک درس عبرت بنے ہوئے ہیں۔

قرآن کریم کی بیان کردہ ایک عبرت گاہ دیکھنے کے خیال سے ہم یہاں آ تو گئے تھے، مگر اس ماحول میں زیادہ ٹھہرنے کی ہمت نہ ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عذاب کے مقامات سے جلدی نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگتے ہوئے ہم یہاں سے روانہ ہو گئے۔

ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں جامعۃ الایمان کے مدیر شیخ عبدالوہاب اپنے رفقاء کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ جہاز کی سیڑھیوں تک ہمیں پہنچا کر انہوں نے ہمیں الوداع کہا، اور دو دن کے مختصر قیام کے ڈھیروں تاثرات لئے ہم یمنیہ ایئر لائنز کے طیارے میں سوار ہو گئے۔

تاثرات

یمن میں میرا قیام تو بہت مختصر رہا، اور اس مختصر وقت کی وجہ سے بہت سی حسرتیں بھی دل میں رہ گئیں۔ میں مأرب نہ جا سکا۔ نیز یمن کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی جانے کی خواہش تھی، خاص طور پر وہ علاقہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حاکم اور معلم بنا کر بھیجا تھا۔ صحیح بخاریؒ میں روایت ہے کہ وہ حصہ دو ضلعوں یا صوبوں پر مشتمل تھا (حدیث میں اس کے لئے **مخلاف** کا لفظ استعمال ہوا ہے) یہ دو الگ الگ خطے جند اور زبید کے نام سے آج بھی معروف ہیں۔ جند حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مرکز تھا جہاں ان کی بنائی ہوئی مسجد آج بھی موجود ہے۔ اور زبید حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا وطن بھی تھا، اور وہیں پر آنحضرت ﷺ نے انہیں حاکم بنا کر بھیجا تھا۔ یمن کا تیسرا اہم شہر حضرموت ہے، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ وہیں کے باشندے تھے۔ لیکن یہ تینوں مقامات صنعاء سے بہت دور ہیں اور ان کے لئے

مستقل وقت کی ضرورت تھی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، عہد رسالت ﷺ اور عہد صحابہؓ میں یمن بہت بڑے علاقے پر محیط تھا۔ بعد میں یمن کے مختلف ٹکڑے ہو گئے جن میں سے ایک بڑا ٹکڑا سلطنت عمان ہے جو بذات خود جزیرۂ عرب کا ایک بڑا ملک ہے (اور پچھلے مہینے میں وہاں ہو کر آیا ہوں) یمن ہی کا ایک حصہ نجران آج کل سعودی عرب میں شامل ہے اور تیسرا حصہ عدن کچھ عرصہ پہلے تک برطانیہ کے زیر نگیں تھا، پھر جنوبی یمن کے نام سے ایک مستقل ملک میں تبدیل ہو گیا جس پر اشتراکی انداز کی حکومت تھی، اور اب پھر وہ یمن کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔

یمن کی تاریخی اہمیت اور قرآن وحدیث میں اس کے تذکرے کی وجہ سے اس کے ساتھ دلی وابستگی ایک مسلمان کے لئے قدرتی بات ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یمن کی عام فضا میں تدیُّن کے مظاہر دوسرے ملکوں کے مقابلے میں خاصے نمایاں ہیں۔ عام طور سے لوگوں میں نماز روزے کا اہتمام خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کی صفات واضح نظر آتی ہیں۔ خواتین میں پردے کا اہتمام یہاں کی اہم خصوصیت ہے۔ مجھے اپنے قیام کے دوران سڑکوں اور بازاروں میں کوئی ایک عورت بھی بے پردہ نظر نہیں آئی۔ ملک میں اکثریت زیدی ہے جو شیعیت کی خفیف ترین شکل ہے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے قائل ہیں، مگر دوسرے صحابہ کرامؓ کی بھی پوری عزت کرتے ہیں اور کسی کی شان میں گستاخی نہیں کرتے ان کا فقہی مسلک حنفی مسلک سے خاصا قریب ہے۔ زیدی حضرات کے علاوہ شافعی حضرات کی بھی بڑی تعداد یمن میں آباد ہے اور بہت بڑی تعداد علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق کار پر عمل پیرا ہے، لیکن کسی فرقہ وارانہ تعصب یا مسلکی جھگڑوں کا کوئی تصور عام طور سے نہیں ہے، تمام لوگ اپنے اپنے مسلک پر آزادی سے عمل کرتے ہیں، اور باہم اتحاد واتفاق کے ساتھ رہتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک یمن کے حاکم بھی اہل علم ہوتے تھے لیکن جب سے جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے، اس کا میلان مغرب کی طرف رہتا ہے، ملک کے عوام اپنے حکام سے

خوش نظر نہیں آتے، ان کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ ملک کی دولت کا صحیح استعمال نہیں کر رہے بلکہ اسے اپنے ذاتی مفاد میں استعمال کرتے ہیں۔ شاید اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ یمن قدرتی وسائل مثلاً تیل اور گیس وغیرہ سے مالا مال ہونے کے باوجود جزیرہ عرب کا سب سے پسماندہ ملک ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جزیرے کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ لیکن قدرتی وسائل کے غلط استعمال اور ناقص منصوبہ بندی نے تمدنی ترقی میں ملک کو کہیں پیچھے ڈال دیا ہے۔

غرض عالم اسلام کے دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی عوام اور حکام کے درمیان مفاہمت کے بجائے بُعد کی ایک خلیج حائل ہے جس کا تمام تر فائدہ دشمنان اسلام کو پہنچ رہا ہے، اور ملک کے بہترین وسائل امت کی فلاح و بہبود کے بجائے دوسرے کے مقاصد پورے کرنے کے کام آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری شامتِ اعمال کو اپنے فضل و کرم سے دور فرما کر اس مہلک صورت حال سے ہمیں نجات عطا فرمادیں تو عالم اسلام آج دنیا بھر کی قیادت کے مقام پر ہو۔

آدھی رات کا سورج



ستمبر ۲۰۰۱ء

آدھی رات کا سورج
دنیا کے شمالی سرے کا ایک سفر
ناروے، سویڈن، فن لینڈ

رات کے بارہ بجے تھے مگر سامنے افق پر سورج موجود تھا اور اس کی روشنی نے ماحول پر اپنی روشنی پوری طرح بکھیری ہوئی تھی، ہم شمال میں دنیا کے آخری کنارے پر تھے۔ اور سورج کے سامنے ہونے کے باوجود دنیا کے اس آخری سرے پر عشا کی اذان کہہ کر نماز باجماعت ادا کر رہے تھے۔

زندگی کا یہ انوکھا اور منفرد تجربہ میرے ناروے کے حالیہ سفر میں پیش آیا۔ یہ یادگار دورہ جس میں میں نے ناروے، سویڈن، اور فن لینڈ، کا سفر کیا بہت سے نئے تجربات اور متعدد نئی معلومات پر مشتمل تھا۔ اس لئے دل چاہا کہ قارئین کو بھی اس سفر کے کچھ حالات سے باخبر کیا جائے، یہ سطور اسی مقصد کے تحت سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

یورپ کے شمال میں ایک جزیرہ نما ہے جسے جزیرہ نمائے اسکینڈی نیویا (Scandinavian peninsula) کہتے ہیں، اور قدیم تاریخ میں اسے اسکینڈیا کہا جاتا تھا۔ یہ جزیرہ نما ۱۱۵۰ میل لمبا ہے۔ اور اس کا مجموعی رقبہ ۲۸۹۵۰۰ مربع میل ہے، اور اس کا کچھ حصہ سویڈن اور کچھ حصہ ناروے میں ہے۔ اسی جزیرہ نما کی نسبت سے یورپ کے تین شمالی ملکوں ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کے مجموعے کو اسکینڈی نیویا (Scandinavia) کہتے

ہیں۔ بعض لوگ فن لینڈ، آئس لینڈ، اور جزائر فیرو کو بھی ان کی جغرافیائی مشابہت کی وجہ سے اسکینڈی نیویا میں داخل کرتے ہیں، لیکن ٹھیٹھ جغرافی نقطہ نظر سے اسکینڈی نیویا میں ناروے، سویڈن اور ڈنمارک ہی داخل سمجھے جاتے ہیں البتہ کچھ عرصے سے ایک اور اصطلاح ''شمالی ممالک'' (Nordic Countries) استعمال ہورہی ہے، اس میں اسکینڈی نیوین ممالک کے علاوہ فن لینڈ اور آئس لینڈ بھی شامل ہیں۔

ان ممالک میں سے ناروے وہ ملک ہے جو باقی تمام شمالی ملکوں کے مقابلے میں شمال میں زیادہ آگے تک گیا ہے۔ ناروے کا جنوبی سرا شمال میں ۵۷ عرض البلد پر واقع ہے اور اس کا شمالی سرا ۷۱ درجے عرض البلد پر۔ بلکہ اگر جزیرہ سوالبرد کو نظر میں رکھا جائے جو انتظاماً ناروے ہی کے ماتحت ہے (اور جس کا ذکر میں انشاء اللہ آگے کروں گا) تو اس کا انتہائی سرا ۸۱ عرض البلد پر واقع ہے، یعنی قطب شمالی سے صرف نو ڈگری دور۔

ناروے کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ پچیس ہزار ستاون مربع میل ہے، اور یہ پورا علاقہ حسین قدرتی مناظر، پہاڑوں، دریاؤں، آبشاروں، اور جھیلوں سے مالا مال ہے۔ برٹانیکا کے مطابق ناروے کی چھوٹی بڑی جھیلوں کی کل تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہے۔ قدرت نے اسے بہت سے وسائل عطا فرمائے ہیں جن میں تیل، گیس، لکڑی وغیرہ شامل ہیں۔ اتنے وسیع رقبے اور اتنے وسائل کے باوجود اس کی کل آبادی پانچ ملین (پچاس لاکھ) کے قریب ہے، اور آبادی کی کثافت (Density) ۱۳ افراد فی کلومیٹر ہے۔ لہذا جب ان سہولیات کا ذکر آتا ہے جو ناروے نے اپنے باشندوں کو فراہم کی ہوئی ہیں، مثلاً مفت تعلیم، مفت علاج، فیملی الاؤنس، بڑھاپے اور معذوری کی پنشن وغیرہ تو اس کی وجہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ چنانچہ حال ہی میں اقوامِ متحدہ کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ناروے کو معیارِ زندگی کی بہتری کے لحاظ سے دنیا کا نمبر ایک ملک قرار دیا گیا ہے۔

ناروے کے مسلمانوں کی دعوت پر پچھلے سال (۲۰۰۰ء) اگست کے پہلے ہفتے میں، میں نے اسکینڈی نیویا کا ایک دورہ کیا تھا۔ یہ دورہ دعوتی انداز کا تھا، جس کا بنیادی مقصد وہاں کے مسلمانوں سے اصلاحی خطابات، ان کے مسائل جاننا، ان کے حل کے لیے مشورے پیش کرنا

اوران کے سوالات کے جواب دینا تھا، چنانچہ ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں میرے متعدد خطابات ہوئے، یہاں کی مختلف مساجد کے علاوہ ایک بڑے ہال میں ۶/اگست ۲۰۰۰ء کو مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع سے بھی خطاب ہوا، جس کا عنوان تھا ''غیر مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی ذمہ داریاں'' نیز ۸/اگست کو شہر کے ایک بڑے مرکز میں ڈاکٹروں کے ایک بڑے اجتماع سے بھی خطاب کا موقع ملا جس میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم مقامی ڈاکٹروں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی، یہ خطاب انگریزی میں تھا، اوراس کا اہتمام مسلمان ڈاکٹروں کی فرمائش پر اس لیے کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو ہسپتالوں میں ان کی دینی ضروریات سے باخبر کیا جائے، غیر مسلم ڈاکٹروں کو بھی بڑی تعداد میں اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی دینی ضروریات سے باخبر ہوکر ان کے علاج میں ان کے دینی شعائر اور فرائض کا خیال رکھ سکیں۔ اجتماع کا اصل موضوع اگرچہ اسی حد تک محدود تھا، لیکن میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے پہلے اسلام کا مختصر تعارف اوراس کے بنیادی عقائد وتعلیمات کا ایک خاکہ بھی پیش کیا، اوراس کے بعد مرض، مریض اوراس کے علاج سے متعلق شریعت کے احکام قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ ہال ڈاکٹروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ان میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی، اوراوسلو شہر کے گورنر بھی اجتماع میں موجود تھے۔ حاضرین کے سوالات سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے پوری دلچسپی اور توجہ سے یہ خطاب سنا ہے، اورغیر مسلم ڈاکٹر اس بات کے مشتاق نظر آئے کہ وہ اپنے مسلمان مریضوں کے علاج میں ان کے دینی احکام کی رعایت کرسکیں۔ اجتماع کے خاتمے پر بھی سوالات کا سلسلہ دیر تک جاری رہا، اور متعدد حاضرین نے بتایا کہ ان کے متعدد شکوک وشبہات کا ازالہ ہوا ہے۔

ناروے کے اسکولوں میں عیسائی مذہب کی تعلیم تمام بچوں کے لیے کچھ عرصے سے لازمی کردی گئی ہے، اور مسلمان بچے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کے لیے یہاں کے مسلمانوں نے کچھ اعتدال پسند عیسائی پادریوں سے میری ایک ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ ۸/اگست ۲۰۰۰ء کو ایک پاکستانی مسلمان صدیقی صاحب کے ریسٹورنٹ میں یہ ملاقات ہوئی، اوراس لحاظ سے مفید رہی کہ ان تمام پادری صاحبان نے اس بات کا اعتراف کیا کہ

مسلمانوں کو عیسائی مذہب کی تعلیم پر مجبور کرنا سراسر زیادتی ہے اور وہ اس پابندی کو اٹھوانے میں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرینگے۔

اوسلو میں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مسلم اسکول کی بنیاد ڈالی جارہی تھی، میں مغربی ملکوں کے دورے میں اس قسم کے تعلیمی اداروں کے قیام پر ہمیشہ زور دیتا رہا ہوں۔اس اسکول کی انتظامیہ نے نصاب ونظام تعلیم پر مشورے کے لیے مجھے مدعو کیا تھا، وہاں بھی جانا ہوا، میں نے نصاب کی ترتیب میں حسب استطاعت ان کی مدد کی اور پاکستان آنے کے بعد بھی ان حضرات کی طرف سے مشورے لینے کا سلسلہ خط وکتابت کے ذریعے جاری رہا۔

اوسلو کے علاوہ ایک دن کے لئے میں ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن بھی گیا، یہاں مولانا سلطان فاروق کے زیرانتظام اسلامک کلچر سنٹر کی مسجد میں جمعہ کے بعد مفصل خطاب ہوا۔ پھر ایک دن کیلئے سویڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہوم بھی جانا ہوا جہاں چودھری محمد اخلاق صاحب کے زیرانتظام ایک مقامی مسجد میں ایک جلسہ عام سے خطاب اور سوال و جواب کی مفصل نشست ہوئی۔

پچھلے سال میرے اس تمام تر دورے کا انتظام میرے عزیز دوست ڈاکٹر خالد سعید صاحب نے کیا تھا جو اوسلو کے مسلمانوں میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، میں نے ان میں ہمیشہ جوش و ہوش کا حسین امتزاج محسوس کیا، اور انہیں سنجیدہ مگر باذوق، بردبار، مگر فعال پایا ہے۔ دورے کے مصروف پروگرام کے دوران انہوں نے اوسلو اور اس کے مضافات کی سیاحت بھی کرائی، اور مجھے ناروے کی آب وہوا، گرمیوں میں یہاں کا موسم اور یہاں کی پرسکون فضا مغربی دنیا کے کسی اور ملک سے زیادہ پسند آئی، اور یہاں کے قیام کے دوران مجھے اپنی صحت پر اچھا اثر محسوس ہوا۔

چنانچہ امسال جب میرے بعض معالجین نے مجھے تاکید کی کہ میں اپنی معمول کی مصروفیات سے ہٹ کر کم از کم دو ہفتے کسی پرفضا جگہ پر گذاروں تو میں نے اس کام کے لیے ناروے کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا۔ میرے دوست ڈاکٹر خالد سعید صاحب پہلے ہی مجھ سے اصرار کر چکے تھے کہ میں گرمیوں کے کچھ ایام وہاں گذاروں ۔ چنانچہ امسال میں نے اللہ

تعالیٰ کے نام پر ارادہ کرلیا کہ دارالعلوم کے امتحان ششماہی کے دوران میں دو ہفتے میں ناروے اور اس کے قریبی ملکوں میں گذاروں گا۔ ۱۶؍ جولائی اور یکم اگست کو لندن میں مجھے دو اجلاسات میں شرکت کرنی تھی، ان دونوں اجتماعات کی درمیانی مدت ناروے میں گذارنے کے لئے مل گئی۔

۱۶؍ جولائی کو لندن میں فرسٹ اسلامک انویسٹمنٹ بنک کے شریعہ بورڈ کے اجلاس میں شرکت کے بعد میں ۱۷؍ جولائی کی سہ پہر میں ناروے کے دارالحکومت اوسلو پہنچ گیا۔ میرے میزبان دوست ڈاکٹر خالد سعید صاحب، مدنی مسجد کے امام وخطیب جناب مولانا بشیر صاحب اور ناروے میں پاکستان کے سفیر استقبال کے لیے موجود تھے۔ میرے گھر والے بھی چونکہ اس سفر میں ساتھ تھے، اس لیے اوسلو کے ایک مضافاتی علاقے (Mortensrud) میں جہاں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ ایک خالی مکان میں رہنے کا انتظام ڈاکٹر خالد سعید صاحب نے کر رکھا تھا۔

اسی شام چھ بجے مولانا بشیر صاحب نے مدنی مسجد میں اوسلو کے علماء کا ایک اجتماع بلایا ہوا تھا۔ الحمدللہ اوسلو شہر میں اس وقت پندرہ بیس مسجدیں ہیں، ان میں سے بعض پاکستانی ائمہ کے زیرِ انتظام ہیں، اور بعض عرب علماء کے۔ مولانا بشیر صاحب نے اس وقت ان تمام مساجد کے ائمہ وخطباء کو جمع کیا ہوا تھا۔ اس میں عراق کے شیخ برزنجی بطور خاص ایک نمایاں شخصیت تھے۔ میں پچھلے سال بھی ان سے مل چکا تھا، اور ان کی مسجد میں عربی میں میرا خطاب بھی ہوا تھا، وہ ایک علم دوست اور مطالعے کے شوقین بزرگ ہیں۔ ان کے علاوہ صومالیہ کے بعض ائمہ و خطباء بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ اجتماع کا مقصد یہاں کے بعض فقہی مسائل پر مشورہ کرنا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً گھنٹہ بھر جاری رہا۔ جو خواتین اپنے شوہروں کے ظلم وستم کا شکار ہوکر نکاح فسخ کرانا چاہتی ہیں، ان کا مسئلہ بطورِ خاص زیرِ بحث آیا۔ اور میں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہاں کے ائمہ مساجد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیدی جائے جو ایسی خواتین کی شکایات سنے، اور شرعاً اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ جن ملکوں میں مسلمان قاضی نہ ہوں وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی شکایات کے موقع پر قاضی کے قائم مقام ہوکر شکایات کا ازالہ کرے جس کا

مفصل طریقہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب ''الحیلة الناجزة'' میں موجود ہے۔

میری اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا، اور الحمدللہ اسی مجلس میں ایک کمیٹی تشکیل دیدی گئی جو نہ صرف اس مسئلے کیلئے بلکہ مسلمانوں کے دوسرے مسائل کیلئے بھی باہمی مشورے سے کام کریگی۔

عصر کی نماز اس وقت وہاں ساڑھے سات بجے شام ہورہی تھی، چنانچہ اجتماع کے بعد عصر کی نماز ہوئی، نماز کے بعد بھی کچھ دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ساڑھے آٹھ (٣٠۔٨) بجے کے قریب میں وہاں سے واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچ سکا۔ لیکن غروبِ آفتاب ان دنوں ساڑھے دس بجے ہورہا تھا، اس لئے مغرب کی نماز میں دو گھنٹے باقی تھے جو میں نے اپنی قیام گاہ پر معارف القرآن کے ترجمے کے کام میں استعمال کئے۔

اوسلو کی رات

ساڑھے دس (٣٠۔١٠) بجے سورج غروب ہوا تو ہم نے نمازِ مغرب ادا کی۔ لیکن اوسلو کا معاملہ یہ ہے کہ گرمیوں کے پورے موسم میں یہاں شفق، ساری رات غائب نہیں ہوتی۔ بلکہ تقریباً تمام رات اس قسم کا جھٹپٹا رہتا ہے جیسا ہمارے ملکوں میں مغرب کے آدھے پون گھنٹے بعد یا صبح صادق کے آدھے گھنٹے بعد ہوا کرتا ہے۔ رات کے جس حصے میں دیکھئے آسمان پر سفیدی نمایاں نظر آتی رہتی ہے۔ اور افق پر سرخی بھی اکثر غائب نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سورج رات میں کسی بھی وقت افق سے ١٨ درجے نیچے نہیں جاتا، بلکہ شمال مغرب میں غروب ہوکر شمال مشرق سے طلوع ہوجاتا ہے۔

شرعاً عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب شفق کی سفیدی، یا کم از کم سرخی افق سے غائب ہوجائے چونکہ اوسلو میں ساری گرمیوں میں شفق غائب نہیں ہوتی، اس لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عشاء کا معروف وقت آتا ہی نہیں۔

ناروے، سویڈن اور فن لینڈ میں تو یہ صورت گرمی کے پورے موسم میں (٧/اپریل سے

۳ رستمبر تک) برقرار رہتی ہے۔ لیکن یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں بھی گرمی کے موسم کا کچھ زمانہ ایسا آتا ہے جب رات کو شفق غائب نہیں ہوتی، اور عشاء کا معروف وقت نہیں آتا۔ چنانچہ لندن میں ۲۵ رمئی سے ۱۷ رجولائی تک، ایڈنبرا اور گلاسگو میں ۵ رمئی سے ۷ راگست تک اور پیرس میں ۱۱ رجون سے یکم جولائی تک شفق غائب نہیں ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ ان مقامات میں عشاء اور فجر کی نمازیں کس وقت پڑھی جائیں؟ عشاء کا معروف وقت تو اس لیے نہیں آتا کہ شفق ساری رات رہتی ہے، اور فجر کا مسئلہ بھی اس لئے قابل غور ہے کہ فجر کا وقت صبح صادق طلوع ہونے سے ہوتا ہے، اور معروف معنی میں صبح صادق کا طلوع اس وقت کہا جائیگا جب اس سے پہلے مکمل تاریکی ہو، لیکن یہاں مکمل تاریکی تو ساری رات نہیں ہوتی، اس لئے صبح صادق کے بارے میں بھی یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ کب سے شروع ہوئی؟

ایک زمانہ تھا جب ان علاقوں میں مسلمان آباد نہیں تھے، اس لئے اس مسئلے کی کوئی عملی اہمیت نہ تھی، لیکن جوں جوں مسلمانوں کی آبادی شمال میں ۴۸ عرض البلد سے آگے بڑھتی گئی، یہ سوال فقہاءِ امت کے سامنے آیا اور اس پر علمائے امت نے مفصل بحث کی۔

بلغار کا تعارف

میری معلومات کی حد تک یہ مسئلہ سب سے پہلے عباسی خلافت کے دور میں شمال کے ایک شہر بلغار کے سلسلے میں پیش آیا۔ یہ شہر ۵۵ درجہ عرض البلد اور ۶۶ درجہ طول البلد پر واقع ہے۔ مقتدر باللہ کے زمانے میں ایک مسلمان بزرگ جن کا نام بلار تھا، اس شہر میں پہنچے تو دیکھا کہ شہر کا بادشاہ اور ملکہ دونوں سخت بیمار ہیں اور زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ بلار نے ان سے کہا کہ اگر میں آپ کا علاج کردوں تو کیا آپ میرے دین (اسلام) کو قبول کرلیں گے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کے علاج سے بادشاہ اور ملکہ دونوں تندرست ہو گئے، اور بلار کے ہاتھوں مسلمان ہوئے۔ ان کے مسلمان ہونے کے نتیجے میں شہر کے تمام لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، اور مقتدر باللہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس کوئی ایسا شخص بھیجئے جو ہمیں دین اسلام کی تعلیم دے سکے۔

بلغار کے قریب خزر کے علاقے کا بادشاہ غیر مسلم تھا، اس نے بلغار کے بادشاہ اور باشندوں کے اسلام کی خبر سنی تو ایک لشکر جرار لے کر بلغار پر حملہ کر دیا۔ بلار نے بلغار کے لوگوں سے کہا کہ ”ڈرو نہیں اور اللہ اکبر، اللہ اکبر، کہہ کر دشمن کا مقابلہ کرو“ اس طرح دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا، اور خزر کے بادشاہ کو شکست ہوئی۔ بعد میں اس نے بلغار کے حکمران سے صلح کر لی اور اس وقت اس نے بتایا کہ جنگ کے دوران میں نے آپ کے لشکر میں شہابی گھوڑوں پر سوار کچھ غیر معمولی بڑے لوگ دیکھے تھے جو میرے ساتھیوں پر حملہ آور تھے۔ بلار نے کہا کہ ”یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا لشکر تھا۔“ چونکہ یہ پورا شہر بُلار کی دعوت پر مسلمان ہوا تھا، اس لیے اس شہر کا نام بھی بلار رکھ دیا گیا جو ہوتے ہوتے بلغار بن گیا۔[1]

مشہور ادیب اور مورخ قلقشندیؒ نے بلغار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”بلغار کے اکثر باشندے حنفی ہیں، اس میں سردی کی شدت کی وجہ سے کسی قسم کے پھل یا پھل دار درخت نہیں ہوتے...... سلطان عماد الدین حموی کا کہنا ہے کہ بلغار کے بعض باشندوں نے مجھے بتایا کہ گرمیوں کے شروع میں وہاں شفق غائب نہیں ہوتی، اور وہاں کی رات بہت چھوٹی ہوتی ہے کیونکہ ۴۸.۵ عرض البلد اور اس سے آگے کے علاقوں میں گرمی کے شروع میں شفق غائب نہیں ہوتی۔“[2]

واضح رہے کہ یہ شہر اب بھی اسی نام سے معروف ہے اور جمہوریہ تاتارستان کے شہر قازان سے ۲۴۷ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، رابطۃ العالم الاسلامی کے نائب سیکریٹری شیخ ناصر العبودی نے یہاں کا سفر کیا ہے، اور اس کا سفر نامہ بھی ”بلاد التتار و البلغار“ کے نام سے شائع ہوا ہے، اور بتایا ہے کہ اب بھی سرکاری کاغذات میں یہ شہر بلغار ہی کہلاتا ہے اور یہاں سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بلغار میں اسلام پھیلنے کے نتیجے میں یہ سوال فقہاء امت کے سامنے آیا

---

[1] یہ واقعہ علامہ قزوینیؒ نے ”آثار البلاد و اخبار العباد“ (ص ۶۱۲، ۶۱۳) میں بیان کیا ہے۔ بلغار کی مفصل تاریخ یہیں کے ایک باشندے محمود المرزی نے ۱۴۴۹ صفحات میں لکھی ہے جو ۱۳۲۵ھ میں ”تلفیق الاخبار و تلقیح الآثار“ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

[2] صبح الاعشیٰ ص ۴۶۲۰ ج ۴۔

کہ جن علاقوں میں رات کو شفق غائب نہیں ہوتی، وہاں عشاء اور فجر کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟ فقہاء کی ایک جماعت کا موقف یہ تھا کہ نمازوں کی فرضیت ان کے اوقات کے ساتھ مربوط ہے، لہٰذا جس جگہ کسی خاص نماز کا وقت نہیں آتا، وہاں وہ نماز بھی فرض نہیں، چنانچہ ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ ان علاقوں میں جب شفق غائب نہ ہو، عشاء کی نماز فرض ہی نہیں ہوتی۔[1]

لیکن فقہاء کرامؒ کی بھاری جمعیت کا کہنا یہ ہے کہ شفق کے غائب نہ ہونے سے عشاء کی نماز ساقط نہیں ہوتی، بلکہ ان مقامات کے لوگوں کو اوقات کا حساب کر کے عشاء اور فجر کی نماز ادا کرنا چاہیے۔[2] علماءِ شافعیہؒ نے اور محقق حنفی علماء نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے جن میں البرھان الکبیر، محقق ابن ہمامؒ، علامہ ابن امیر الحاجؒ اور علامہ قاسم بن قطلو بغاؒ وغیرہ داخل ہیں۔ علامہ ابن ھمامؒ نے فتح القدیر میں اس قول کی تائید بڑی قوت کے ساتھ کی ہے۔ علماءِ مالکیہ میں سے علامہ قرافیؒ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔[3]

متاخرین حنفیہ میں سے ایک بزرگ علامہ ھارون بن بہاؤ الدین مرجانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۶ھ) گذرے ہیں جن کا توضیح پر حاشیہ معروف ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''ناظورۃ الحق فی فرضیۃ العشاء و ان لم یغب الشفق'' اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ پیر جھنڈو کے کتب خانے میں موجود ہے، اور وہیں سے تصویر لے کر ایک دوست نے مجھے بھی بھیج دیا تھا۔ اس رسالے میں انہوں نے پوری شدت سے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایسے علاقوں میں عشاء کی نماز فرض ہی نہیں ہوتی، اور قرآن وسنت کے بڑے مستحکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان پر نماز عشاء فرض ہے جو انہیں اوقات کا حساب لگا کر ادا کرنی چاہیے۔ میں نے اپنی کتاب ''تکملۃ فتح الملھم'' کی چھٹی جلد (ص ۳۷۶ تا ۳۷۸) میں اس رسالے کے اقتباسات نقل کیے ہیں، اور ثابت کیا ہے کہ یہی موقف صحیح اور واجب العمل ہے۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جو میں انشاء اللہ آگے ذکر کروں گا۔

---

[1] یہ قول شمس الائمہ حلوانیؒ اور بقالیؒ کی طرف منسوب ہے اور علامہ شرنبلالیؒ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے (رد المحتار ص ۳۶۲ ج ۱)۔ [2] مغنی المحتاج ص ۱۲۳ ج ۱۔ [3] الصاوی علی الدردیر ص ۲۲۵ ج ۱

بہرصورت! صحیح موقف یہی ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں ان علاقوں میں بھی فرض ہیں۔ البتہ ان کی ادائیگی کیلئے اوقات کا تعین حساب سے کیا جائیگا۔ اب حساب لگانے کے مختلف طریقے فقہاء کرامؒ نے بیان فرمائے ہیں:۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ ان علاقوں کے قریب جس شہر میں شفق غائب ہوتی ہو، جب وہاں عشاء کا وقت آ جائے، اس وقت ان علاقوں میں بھی عشاء پڑھی جائے، اور جس وقت وہاں فجر کا وقت ہو، اس وقت یہاں بھی فجر کی نماز ادا کی جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں جس دن آخری بار شفق غائب ہوئی اس دن عشاء کا جو وقت تھا، وہی وقت اس موسم میں بھی عشاء کا سمجھا جائے، جب شفق غائب نہیں ہوتی، نیز اس دن فجر کی نماز کا جو وقت تھا اسی وقت اس موسم میں بھی فجر کا وقت سمجھا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں شفق اگرچہ ساری رات موجود رہتی ہے، لیکن اس کی سمت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یعنی رات کے آغاز میں شفق مغرب میں ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے وہ شمال کی طرف منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ مشرق تک پہنچ جاتی ہے، لہذا بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جب تک شفق مغرب کی طرف مائل رہے، اس وقت تک عشاء کا وقت سمجھا جائے اور جب وہ مشرق کی طرف زیادہ جھک جائے، اس وقت سے فجر کا آغاز سمجھا جائے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ غروب آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک کے وقت کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا جائے، پہلا حصہ مغرب اور عشاء کا مشترک وقت ہوگا، اور دوسرا حصہ فجر کا ہوگا۔[1]

جب سے مسلمان ان علاقوں میں جا کر آباد ہوئے ہیں، وہاں انہی تین طریقوں میں سے کسی طریقے پر عمل کررہے ہیں۔ برطانیہ کے بعض علاقوں میں پہلے طریقے پر اور بعض میں تیسرے طریقے پر عمل ہوتا ہے۔ اوسلو کی بیشتر مساجد میں عشاء کی نماز مغرب کے سوا گھنٹے بعد اور فجر کی نماز طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ پہلے ہورہی تھی۔ جس روز میں اوسلو پہنچا، اس دن میں نے بھی نماز اسی ترتیب کے مطابق ادا کی۔ لیکن اس طریقے میں عشاء اور فجر

---

[1] ناظورۃ الحق، ورق ۸۶

کا درمیانی وقفہ اتنا کم ہوتا ہے کہ بیچ میں سونا اور پھر فجر کے لیے اٹھنا بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا گنجائش اس کی بھی ہے کہ (تیسرے طریقے کے مطابق) جب غروب اور طلوع کے درمیانی وقفے کا نصف گزر جائے تو اس وقت فجر پڑھ کر سو جائیں۔ اوسلو میں یہ وقت رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے ہو رہا تھا۔ چنانچہ بعد میں اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے بارہا ہم نے بھی نمازِ فجر دو بجے کے قریب اس وقت ادا کی جب شفق کی روشنی طلوعِ آفتاب کی سمت میں ظاہر ہو گئی۔

اوسلو کا قیام

۱۸ ار سے ۲۱ رجولائی تک ہم اوسلو ہی میں مقیم رہے، اس موسم میں یہاں کی فضا مجھے بہت خوشگوار اور نشاط انگیز محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور سے رات کے وقت فضا پر چھایا ہوا مغرب کا سا جھٹپٹا، آسمان پر پھیلی ہوئی سفیدی اور تر و تازہ ہوا کے جھونکے اور ان کے نتیجے میں چیڑ کے بلند قامت درختوں میں پتوں کی مترنم سرسراہٹ بڑی سرور انگیز معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے قیام کا انتظام جس مکان میں تھا وہ بلندی پر واقع تھا، اور اس کے برآمدے سے سامنے سرسبز وادیوں کے نیچے سمندر کی ایک خلیج نظر آتی تھی، اور اس کے پس منظر میں شاداب پہاڑ۔ رات کے وقت جب بیشتر افراد سوئے ہوتے اور ہمیں نماز کے انتظار میں جاگنا ہوتا تو اس پرسکون ماحول میں چہل قدمی عجیب لطف دیتی تھی۔

اوسلو کے اس تین روزہ قیام کے دوران ہمارے میزبان ڈاکٹر خالد سعید صاحب نے شہر اور اس کے مضافات کے متعدد قابل دید مقامات کی سیر بھی کرائی، ان میں سے ایک جگہ جو درامن (Dramen) کے نام سے مشہور ہے، بطورِ خاص قابل ذکر ہے۔ یہ اوسلو شہر سے تقریباً ۵۰۔۵۵ میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے قدرتی مناظر کے غیر معمولی حسن سے نوازا ہے۔ یہ شہر آمنے سامنے کے پہاڑوں پر آباد ہے جن کے درمیان ایک دریا بہہ رہا ہے، اور دریا پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پل بنا کر شہر کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے ملایا گیا ہے۔ ان دو پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کا پیٹ چاک

کر کے اس کے بیچ میں ایک عمودی سرنگ بنائی گئی ہے جو پہاڑ کے اندر اندر سے ایک زینے کی شکل میں اوپر چڑھتی ہے اور پہاڑ کی چوٹی تک لیجاتی ہے۔ اس سرنگ میں داخل ہونے کے بعد کار کو کسی جگہ موڑنا نہیں پڑتا بلکہ اسٹیئرنگ کو ذرا ترچھا رکھا جائے تو کار سرنگ کے ساتھ ساتھ خود مڑتی رہتی ہے یہاں تک کہ پہاڑ کے اوپر نکل آتی ہے۔ پہاڑ پر پہنچنے کے بعد خاصی طویل و عریض مسطح زمین ہے جس کے کنارے سے شہر، دریا، پہاڑوں، پلوں، فواروں اور جنگلوں کا ایک ایسا دلفریب منظر سامنے آتا ہے کہ انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے ''تبارک اللہ احسن الخالقین۔'' اس چھوٹے سے شہر میں بھی مسلمان آباد ہیں۔ اور یہاں انہوں نے دو مسجدیں بنائی ہوئی ہیں۔

اوسلو کے مضافات اس قسم کے حسین مناظر سے بھرے پڑے ہیں، یہ پہاڑی علاقہ ہے جس پر حد نظر تک چیڑ کے بلند قامت درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور سبزے کا عالم یہ ہے کہ غیر آباد علاقوں میں ایک گز جگہ بھی خشک نظر نہیں آتی، اس پر پہاڑی ندیوں نے آبشاروں کی سی شکل اختیار کر کے اور سمندری خلیجوں نے پہاڑوں کے درمیان اپنی جگہ بنا کر علاقے کے حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اوسلو کے اس تین روزہ قیام میں ڈاکٹر خالد سعید صاحب کی معرفت ہم ان خوب صورت مناظر فطرت سے اچھی طرح لطف اندوز ہوئے۔

ترمسو میں

۲۱ر جولائی کی شام کو چھ بجے ہم ہوائی جہاز کے ذریعے ناروے کے شمالی شہر ترمسو (Trumso) کیلئے روانہ ہوئے، اور تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ترمسو کے ہوائی اڈے پر اترے۔ یہ شہر بذات خود اپنے حسن کی وجہ سے بھی قابل دید ہے، لیکن ہم لوگوں کے لئے اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اسکنڈی نیویا کے ان چند بڑے شہروں میں سے ہے جہاں مئی سے لے کر جولائی کے آخری ہفتے تک سورج بالکل غروب نہیں ہوتا، بلکہ تقریباً تین مہینے تک دن ہی دن رہتا ہے۔ اور سردیوں کے موسم میں تین ماہ تک سورج طلوع نہیں ہوتا، اور رات ہی رات رہتی ہے۔ جس تاریخ (۲۱ر جولائی) کو ہم وہاں پہنچے، وہ شہر میں سورج غروب نہ ہونے کا

غالباً آخری دن تھا، ہم شام کے تقریباً آٹھ بجے وہاں کے ہوائی اڈے پر اترے تھے، اور دن کی روشنی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سہ پہر کا وقت ہو۔ چنانچہ ہم نے عصر کی نماز وہاں پہنچ کر نو بجے کے قریب پڑھی۔ اور کھانا کھانے کے بعد کچھ آرام کر کے جب (رات کے) ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہوٹل سے نکلے تو اس وقت ماحول پر ایسی روشنی چھائی ہوئی تھی جیسی ہمارے ملکوں میں عصر کے بعد ہوتی ہے۔

ترمسو شہر کا منظر کچھ اس قسم کا ہے کہ ایک پہاڑی سلسلہ اس کے مشرق میں ہے، اور ایک پہاڑی سلسلہ مغرب میں۔ ان دونوں کے درمیان ایک مستطیل جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف سمندری خلیجوں کا پانی پھیلا ہوا ہے۔ ترمسو شہر کی اکثر آبادی تو اس مستطیل جزیرے میں واقع ہے۔ لیکن کچھ آبادی مشرقی پہاڑ کے دامن تک چلی گئی ہے، اور جزیرے کو مشرقی پہاڑ سے ملانے کے لیے ایک خوبصورت محرابی پل بنا ہوا ہے۔ اس پل کو پار کر کے اگر مشرقی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائیں تو وہاں سے مغرب کا افق بہت صاف نظر آتا ہے، اور رات کے بارہ بجے لوگ یہاں آدھی رات کا سورج (Midnight sun) دیکھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ہم بھی اسی غرض سے اس مشرقی پہاڑ کے دامن میں پہنچے اور ایک کیبل کار کے ذریعے پہاڑ کی چوٹی پر اترے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس چوٹی کے کنارے سے پورے ترمسو شہر کا حسین نظارہ نظر کے سامنے تھا، پہاڑ کے بالکل نیچے سمندر، اور پل کے پار دور تک پھیلا ہوا شہر، اس کے پیچھے پھر سمندری پانی، اور اس کے بعد مغرب کا پہاڑی سلسلہ جس کے درمیان رات کے بارہ بجے بھی سورج اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔ اگرچہ اس دن مغرب کا افق قدرے ابر آلود تھا، اس لیے سورج کا اپنا جسم تو نظر نہ آسکا، لیکن اس سے نکلنے والی شعاعوں نے بادلوں کے کنارے سنہرے بنائے ہوئے تھے، اور اس کی روشنی سے پورا ماحول اتنا منور تھا جتنا صبح کو، طلوعِ آفتاب کے بعد ہوتا ہے۔ رات کے بارہ بجے سورج مغربی افق پر جتنے نیچے آیا تھا، یہ اس کا سب سے نچلا نقطہ تھا، اور بارہ بجے کے بعد وہ غروب ہوئے بغیر شمال کی طرف مائل ہو کر دوبارہ بلند ہونا شروع کر دیتا ہے۔

صورت حال دراصل یہ ہے کہ ترمسو شمال میں تقریباً ستر درجے عرض البلد پر واقع ہے اور قطب شمالی سے قریب ہونے کی بنا پر یہاں سورج کی گردش ترچھی (حمائلی) ہے۔ چنانچہ سورج کبھی سر پرنہیں آتا بلکہ افق کے کناروں کناروں سے اس طرح گذر جاتا ہے کہ رات کو بارہ بجے کے بعد وہ شمال کی طرف چل کر بلند ہونا شروع ہوگا۔ اور شمال سے مشرق تک پہنچتے پہنچتے کافی بلند ہوجائے گا، لیکن جب دوپہر کو مشرق کی طرف اپنے بلندترین نقطے پر پہنچے گا تو جنوب کی طرف مائل ہوتے ہوئے نیچے آنا شروع ہوجائے گا۔ یہاں تک کہ رات کے بارہ بجے مغرب میں پہنچتے پہنچتے بالکل نیچے آجائیگا۔ لیکن افق سے نیچے غروب ہوئے بغیر دوبارہ شمال کی طرف اپنا سفر شروع کردے گا۔ تین مہینے یہاں اس کی گردش اسی طرح رہتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ علاقہ تین ماہ تک رات کی تاریکی سے نا آشنا رہتا ہے۔ اور رات کو بارہ بجے دن کی روشنی زیادہ سے زیادہ اتنی مدھم ہوتی ہے جتنی ہمارے ملکوں میں غروب سے کچھ پہلے یا طلوع کے کچھ بعد ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا ان تین ماہ میں یہاں رات دن کا تعین روشنی اور اندھیرے سے نہیں، بلکہ گھڑی کے گھنٹوں کے حساب سے ہوتا ہے، چنانچہ جس وقت کو میں رات کے بارہ بجے کہہ رہا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عام معمول کے مطابق رات کے اندھیرے کا وقت ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت گھڑیوں میں رات کے بارہ بج رہے ہوتے ہیں، اگرچہ دن کی روشنی اس وقت بھی موجود ہوتی ہے، اور دور تک کی چیزیں اسی طرح صاف نظر آتی ہیں جیسے ہمارے ملکوں میں مغرب سے آدھے گھنٹے قبل نظر آتی ہیں۔

ہم جب ترمسو کے مشرقی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو اصطلاحی معنی میں رات کے بارہ بجے تھے۔ اور اس وقت سورج مغربی افق پر اپنے سب سے نچلے نقطے پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن بارہ بجے کے بعد اس نے شمال کی طرف مائل ہوکر دوبارہ بلند ہونا شروع کردیا۔ آدھی رات کے وقت سورج کی یہ کرشمہ کاریاں اور اس کی پھیلائی ہوئی روشنی میں اس حسین شہر کے گردوپیش کا منظر اتنا دلفریب تھا کہ اس پہاڑ کے کنارے پر جو نظارہ گاہ (View Point) بنی ہوئی ہے وہاں سے ہٹنے کو دل نہ چاہتا تھا، لیکن شدید سردی کی برفانی ہواؤں نے تھوڑی دیر بعد ہمیں مجبور کردیا

کہ ہم وہاں سے ہٹ کر ساتھ ہی بنے ہوئے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر شیشے کی دیواروں سے سورج کی اس نقل وحرکت کا نظارہ کریں۔ ریسٹورنٹ کے اندر بھی سورج کی پھیلائی ہوئی روشنی پہنچ رہی تھی۔ مگر چونکہ اصطلاحی اعتبار سے رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے اس لئے مالکان نے تکلفاً میزوں پر شمعیں روشن کی ہوئی تھیں، لیکن ان کی حیثیت سورج کے آگے چراغ سے زیادہ نہ تھی۔

رات کے ایک بجے ہم اس پہاڑ کی چوٹی سے اترے، اور دوبارہ ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تو سورج چونکہ شمال کی طرف بلند ہو چکا تھا، اس لئے اس کی روشنی بھی اس سے زیادہ پھیل گئی تھی جتنی ہم نے ساڑھے گیارہ بجے یہاں آتے ہوئے دیکھی تھی۔ یہاں ہم چونکہ نمازیں اوسلو کے حساب سے پڑھ رہے تھے، اس لئے اوسلو کے حساب سے فجر کا وقت ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے یہ آدھا گھنٹہ اپنی تیز رفتار چہل قدمی کا معمول پورا کرنے میں استعمال کیا۔ ہمارا ہوٹل ایک سمندری خلیج کے کنارے واقع تھا جس کے متصل ایک بندرگاہ تھی۔ میں سمندر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ سمندر میں کچھ عجیب قسم کی مچھلیاں کھلاریاں کررہی تھیں، وقفے وقفے سے وہ اچھل کر سمندر سے باہر آتیں، اور چند ہی لمحوں میں دوبارہ سمندر میں غوطہ لگا کر سمندر میں پانی کا ایک خوب صورت دائرہ پیدا کردیتیں۔ دور تک پھیلے ہوئے سمندر میں ان کی اچھل کود کی آواز اور ان کے بنائے ہوئے دائرے مچھلیوں کی ایک پریڈ کا منظر پیش کررہے تھے۔ برسوں پہلے اس سے ملتا جلتا منظر میں نے عمرے کے ایک بحری سفر میں صبح کے وقت بحیرۂ عرب میں بھی دیکھا تھا کہ ہزاروں مچھلیاں بیک وقت سمندر سے اچھل کر باہر نکلتیں اور دوسرے ہی لمحے ایک ساتھ اندر چلی جاتیں۔ اس وقت جاننے والوں نے بتایا تھا کہ یہ مچھلیاں طلوع آفتاب کے وقت سورج کی کرن لینے کے لیے یہ عمل کرتی ہیں۔ لیکن کیا بعید ہے کہ یہ اس سمندری مخلوق کی طرف سے صبح کی عبادت کا کوئی انداز ہو۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے "وان من شیٔ الایسبح بحمدہ ولکن لاتفقھون تسبیحھم."

دو بجے کے قریب ہم نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی، اور اس کے بعد سونے کے لیے

اپنے اپنے کمروں میں پہنچے، کمرے کی کھڑکی سمندر پر کھل رہی تھی، اور وہاں سے سورج کی روشنی کمرے میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے صبح کے سات آٹھ بجے کا وقت ہو، اور اس روشنی میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا سونے کے لیے کمرے میں مصنوعی اندھیرا پیدا کرنے کے لیے کھڑکی بند کر کے اس پر پردے ڈالے لیکن پردے چونکہ ہلکے رنگ کے تھے، اس لیے رات جیسا اندھیرا پھر بھی نہ ہو سکا، اور اگر جسم بیس گھنٹے جاگنے کے بعد تھکن سے چور نہ ہو چکا ہوتا تو نیند لانا سخت مشکل ہو جاتا۔ قرآن کریم کی آیت یاد آئی:۔

أرأيتم ان جعل الله عليكم النهار سرمداً الى يوم القيامة
من اله غير الله ياتيكم بليل تسكنون فيه

ذرا بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیامت تک دن ہی مسلط رکھے، تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لیے وہ رات لے آئے جس میں تم سکون حاصل کرو؟

اس وقت احساس ہوا کہ رات کا اندھیرا بھی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے جو ہمیں روزانہ حاصل ہوتی ہے، مگر اس نعمت کا نہ احساس ہوتا ہے، نہ شکر ادا کرنے کی توفیق۔ جس علاقے میں اس وقت ہم تھے، وہ تو مجموعی دنیا کے لحاظ سے ایک شاذ استثناء کی حیثیت رکھتا ہے جہاں انسانوں کی آبادی بھی بہت کم ہے۔ لیکن پوری دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں سونے جاگنے کا ایسا نظام بنا دیا ہے کہ سونے کا وقت آتا ہے تو ماحول پر تاریکی مسلط کر دی جاتی ہے، اور تمام انسانوں کو بیک وقت نیند کی طرف مائل کر دیا جاتا ہے، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول کیا تمام دنیا کے انسانوں نے کسی عالمی کانفرنس کے ذریعے یہ فیصلہ کیا تھا کہ سب لوگ رات کے وقت سویا کریں؟ یہ کیوں ممکن نہیں تھا کہ ایک شخص سونا چاہے، اور دوسرا شخص اس وقت اپنی نیند پوری کر کے وہ کام کرنا چاہے جس کے شور سے پہلے شخص کے لیے سونا ممکن نہ ہو؟ وہ کون ہے جس نے ایک خطے پر سب انسانوں کو ایک ہی وقت میں سونے پر آمادہ کر دیا؟ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

بہر کیف! کمرے میں مصنوعی رات پیدا کر کے ہم سو گئے، چونکہ نماز فجر پڑھ کر سوئے تھے، اس لئے صبح کے آٹھ بجے تک سوتے رہنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس طرح دو بجے تک جاگنے کے باوجود چھ گھنٹے کی نیند پوری ہو گئی۔ ہمارے میزبان اور اس سفر میں ہمارے رہنما ڈاکٹر خالد سعید صاحب کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہیں اور اوسلو کے ایک ایسے ادارے کے قابل افسر ہیں جو مختلف لیبارٹریوں کے معیارِ صحت کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اس کام کے لئے انہیں ناروے ہی نہیں، یورپ کے دوسرے ملکوں کی لیبارٹریوں کا جائزہ لینے اور ان کی تحقیق کرنے کے لئے بکثرت سفر کرنے پڑتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے وہ ہر سال کئی بار ترمسو آتے رہتے ہیں، اور یہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ترمسو میں ایک عجائب گھر (میوزیم) ہے جو قطب شمالی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے عجائب وغرائب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ''پولر میوزیم'' (Polar Museum) یعنی ''قطب شمالی کے عجائب گھر'' کے نام سے مشہور ہے، اور قابل دید ہے۔

یہ میوزیم ہماری قیام گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لئے ہم پیدل ہی اس کی طرف چلے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ترمسو میں مسلمان بھی آباد ہیں، اور میری خواہش تھی کہ یہاں کے کسی مسلمان سے ملاقات ہو، اور اس سے یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں کچھ معلومات ہوں کہ وہ یہاں کس طرح رہتے ہیں؟ کوئی مسجد ہے یا نہیں؟ غیر معتدل ایام میں وہ نمازیں کس طرح پڑھتے ہیں؟ وغیرہ۔ اور خیال یہ تھا کہ میوزیم دیکھنے کے بعد کسی مسلمان سے مسجد کا سراغ لگائینگے۔ لیکن میوزیم جاتے ہوئے جب ہم ایک سڑک سے گذرے جس پر دورویہ دکانیں تھیں، تو ایک پنساری کی دکان (grossery) کے دروازے پر لگے ہوئے بورڈ میں کچھ عربی الفاظ کا شبہ ہوا، ابھی ہم وہ بورڈ دیکھ ہی رہے تھے کہ اندر سے دکان دار نے ''السلام علیکم'' کہا۔ ہم نے چونک کر دیکھا کہ انی بارضک السلام؟ تو دکان کے کاؤنٹر پر ایک عرب نوجوان کھڑا نظر آیا جو الجزائر سے تعلق رکھتا تھا۔ ہم بے ساختہ دکان میں داخل ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ یہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد آباد ہے جس میں زیادہ تر صومالیہ کے عرب ہیں، اور بعض دوسرے ملکوں کے حضرات بھی ہیں، اسی نے بتایا کہ ترمسو میں ایک مسجد بھی ہے، اور جن ایام

میں یہاں مسلسل دن یا مسلسل رات رہتی ہے، ان ایام میں نمازیں اوسلو کے اوقاتِ نماز کے حساب سے پڑھی جاتی ہیں، اور ابھی ایک تبلیغی جماعت بھی یہاں کا دورہ کر کے گئی ہے۔ اس مسلمان سے مل کر ایک روحانی مسرت حاصل ہوئی۔

قطب شمالی کا عجائب گھر

اس کے بعد ہم پولر میوزیم میں داخل ہوئے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی سے قطب شمالی کی طرف سائنسی اور جغرافیائی تحقیق اور سیاحت کی غرض سے جو مہمات جاتی رہی ہیں، ترمسو کا شہران تمام مہمات کا نقطہ آغاز رہا ہے۔ یعنی یہ تمام مہمات ترمسو کی بندرگاہ سے روانہ ہوتی تھیں، یہیں سے اس مقصد کے لیے جہاز خریدے یا کرائے پر لئے جاتے تھے۔ اوران مقاصد کیلئے مزدور اور کارکن بھی ترمسو ہی سے حاصل کئے جاتے تھے۔ قدرتی طور پر جب یہ مہمات قطب شمالی کا دورہ کرنے کے بعد واپس لوٹتیں تو سب سے پہلے ترمسو ہی کی بندرگاہ پر آ کر اترتی تھیں، لہٰذا ان مہمات کے نتائج سب سے پہلے اسی شہر میں پہنچتے تھے۔ چنانچہ کسٹم کے ایک گودام کو جو ۱۸۳۰ء میں تعمیر ہوا تھا، ۱۹۷۶ء سے ان نتائج کے متحف (میوزیم) کی شکل دیدی گئی ہے، جوان مہمات کی یادگاروں اور ان کے دوران حاصل شدہ عجائب پر مشتمل ہے۔ قطب شمالی سے قریب ترین جزیرہ ''سوالبرد'' (Sval bard) ہے، اور اس تک پہنچنے کے لئے بحر منجمد شمالی سے گذرنا ہوتا ہے جو برف کی طرح جما ہوا سمندر ہے، اور اس میں بعض بڑے خوفناک درندے، مثلاً برفانی ریچھ، پائے جاتے ہیں جو انسان کو زندہ نہیں چھوڑتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو دماغ ایک ایسی نعمت عطا فرمائی ہے کہ وہ اس سے کام لیکر اپنے سے کئی کئی گنا مضبوط جانوروں کو مسخر کر لیتا ہے، چنانچہ جو مہم جو قطب شمالی کی طرف گئے۔ انہوں نے برفانی ریچھ کو شکار کرنے کے طریقے بھی ایجاد کر لئے۔ اسی پولر میوزیم میں ایک شخص کی یادگاریں محفوظ ہیں جس کا نام ہنری روڈی (Henry Rudy) تھا اور جسے ''برفانی ریچھوں کے بادشاہ'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس کا محبوب ترین مشغلہ برفانی ریچھوں کا شکار تھا، اور اس نے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۸ء تک کے درمیانی عرصے میں

سات سو تیرہ برفانی ریچھ شکار کئے تھے۔

میں اس قسم کے مہم جو انسانوں کے کارناموں سے یہ سبق لیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے عزم و ہمت کو غیر معمولی طاقت عطا فرمائی ہے، انسان کی ہمت ایک ایسی ربر ہے جسے انسان جتنا چاہے، پھیلا سکتا ہے۔ قطب شمالی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا سفر بذات خود انتہائی دشوار تھا۔ اول تو وہاں کی شدید سردی کا عالم یہ ہے کہ سمندر تک منجمد ہے، اور اس کا تھوڑا سا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ترمسو اور نارتھ کیپ میں (ہماری موجودگی کے دوران) اس گرمی کے موسم میں بھی درجۂ حرارت نقطۂ انجماد کے قریب قریب پہنچا ہوا تھا، جب کہ یہ علاقے اصل قطب شمالی سے تقریباً تیس ڈگری پہلے ہیں، خود قطب پر یا جزیرہ سوالبرد پر سردی کا عالم کیا ہوگا؟ پھر جس برفانی ریچھ کو دنیا کے خطرناک ترین درندوں میں شمار کیا جاتا ہے، ایک گرم علاقے کے رہنے والے انسان کیلئے اس کا مقابلہ موت سے لڑنے کے مرادف ہے، لیکن جب انسان نے اس کام کا ارادہ کر لیا، اور اس کے لیے کمر ہمت باندھ لی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ہمت کو یہ طاقت دیدی کہ ایک انسان اس مہلک سردی اور ایسے ویران علاقے میں سات سو سے زائد ایسے خوفناک ریچھوں کو شکار کرنے میں کامیاب ہو گیا، حالانکہ ریچھوں کا شکار کوئی ایسا بلند مقصد نہیں تھا جس کیلئے جان جوکھوں میں ڈالی جائے۔ اور اس کا نتیجہ صرف اتنا ہے کہ اس شخص کا نام صرف اس حد تک روشن ہو گیا کہ جو لوگ ترمسو کے پولر میوزیم میں جا کر اس کے حالات دیکھیں تو چند لمحوں کے لئے اس کی ہمت و شجاعت کو آفریں کہہ دیں اور بس!

سبق لینے کی بات یہ ہے کہ انسان کا یہ عزم و ہمت جس میں اتنی ان دیکھی طاقتیں پوشیدہ ہیں، اگر کسی بلند مقصد کے لئے استعمال ہوں تو وہ کیا کچھ معجزے دکھا سکتی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے شرعی فرائض و واجبات بن نہیں پڑتے، یا گناہوں سے بچنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے، لیکن وہ انسانی ہمت جس نے فولاد کو موم بنا کر رکھ دیا جس نے برف اور آگ کا مقابلہ کیا، جس نے سمندروں کو چیر کر اور پہاڑوں کا پیٹ چاک کر کے من مانے راستے بنائے، جس نے جنگلی درندوں اور برفانی ریچھوں کو رام کیا، کیا وہ انسانی ہمت اپنے خالق و مالک کی

اطاعت کے بلند ترین مقصد کو حاصل کرنے میں اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ اس کیلئے پانچ وقت کی نماز، ایک ماہ کے روزے اور چند بری عادتوں کو چھوڑنا ناممکن ہو گیا ہے؟ لہذا جب بزرگ یہ کہتے ہیں کہ ہمت کو استعمال کر کے اپنے فرائض بجالاؤ اور گناہوں سے بچو تو وہ انسان کی اسی خفیہ طاقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عزمِ صمیم، مشق اور استقامت کے ساتھ استعمال کی جائے تو لامحدود امکانات (Potentials) رکھتی ہے، اور انسان اس کے ذریعے مشکل سے مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔

اسی میوزیم میں بحر منجمد شمالی میں پائی جانے والی بحری مخلوقات کے نمونے بھی شیشے کے شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیں جن میں عجیب و غریب صورت رکھنے والی مچھلیاں اور پانی کے دوسرے جانور، مثلاً سیل وغیرہ موجود ہیں۔ برفانی لومڑیوں اور شمالی علاقے کے بارہ سنگھوں کے نمونے بھی نمائش کیلئے رکھے ہوئے ہیں۔ سمندر میں، بالخصوص شمالی سمندر میں آنے والے مختلف موسموں کی نمائش بھی کی گئی ہے۔ ایک جگہ یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ سمندر میں بھنور کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ اور ان کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ ایک جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ شمالی سمندر کا ایک حصہ اپنے اصلی درجہ حرارت کے لحاظ سے تو ایسا ہے کہ وہ سردی سے منجمد ہو جائے۔ لیکن سمندر کی اوپری تہہ کے نیچے ایک گرم پانی کی لہر چلتی ہے جو اس علاقے میں امریکہ کے کسی سمندر سے آرہی ہے، گرم پانی کی اس لہر کے نتیجے میں اوپر کا سمندر جمنے سے محفوظ رہتا ہے اور اس جگہ جہاز رانی ممکن ہو جاتی ہے۔ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ قطب شمالی سے قریب ترین جزیرہ سوالبرد (Svalbard) ہے جو ترمسو سے ۹۳۰ کلومیٹر دور تقریباً ۸۱ درجے عرض البلد پر واقع ہے، یعنی عین قطب شمالی سے صرف نو ڈگری کے فاصلے پر۔ یہ جزیرہ قطعی طور پر غیر آباد ہے۔ البتہ جزیرے کے جنوب میں جو علاقے ۷۲ عرض البلد کے قریب ہیں وہاں کچھ آبادی ہے۔ سائنس دانوں نے قطب شمالی کے حالات کی تحقیق کے لئے یہاں ایک اسٹیشن بھی بنایا ہوا ہے جہاں تحقیقاتی ٹیمیں جاتی رہتی ہیں۔ کیونکہ قطب شمالی سے قریب ترین خشکی یہی ہے۔ انتظامی طور پر یہ جزیرہ ناروے کی

حکومت کے ماتحت ہے۔البتہ ایک معاہدے کے تحت ناروے اور روس دونوں اس سے کان کنی کر کے کوئلہ نکالتے ہیں۔ترمسو کے پولر میوزیم میں اس جزیرے کی سیر کرانے کا بھی بڑا دلچسپ انتظام ہے۔کسی نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس جزیرے کے طول وعرض کا دورہ کر کے اس کے مناظر کی ایک وڈیو فلم بنائی ہے۔اس میوزیم کے ایک ہال میں یہ مناظر دکھانے کے لیے ایک پینورامک اسکرین بنائی ہوئی ہے جو ہال کے سامنے کی دیوار پر محیط ہے،اور یہ فلم جب اس اسکرین پر سہ ابعادی (Three Dimensional) تصویروں کی شکل میں دکھائی جاتی ہے تو انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خود ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس جزیرے کی سیر کر رہا ہے، چونکہ جزیرہ مکمل طور پر غیر آباد ہے،اس لئے اس میں کسی انسان کی تصویر کا سوال ہی نہیں،لیکن جزیرے کے دلفریب مناظر جو پہاڑوں ، برفانی تودوں (glaciers)،منجمد سمندری خلیجوں ،کہیں کہیں بہتے ہوئے آبشاروں اور نہ جانے اللہ تعالیٰ کی صناعی کے کیسے کیسے شاہکاروں پر مشتمل ہیں،اس طرح آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ اگر دیدۂ بینا ہو تو انسان بے ساختہ پکار اٹھے کہ ربنا ماخلقت ھذا باطلا !

نارتھ کیپ کا بحری سفر

میوزیم سے فارغ ہوتے ہوتے دو بجنے لگے تھے،اور ہمیں تین بجے کے بعد آگے نارتھ کیپ (North Cape) جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہونا تھا۔لہٰذا ہم نماز ظہر اور دوپہر کے کھانے کے بعد بندرگاہ کی طرف چل دئے جو ہوٹل کے بالکل قریب تھی۔اور یہاں سے ویسٹرالین (Vesteralin) نام کے ایک بحری جہاز میں سوار ہوئے ، یہ ایک متوسط سائز کا چھ منزلہ جہاز تھا جس میں مسافروں کی سہولت اور آسائش کے ضروری انتظامات موجود تھے ۔شام پانچ بجے جہاز نے ترمسو کی بندرگاہ سے سرکنا شروع کیا،اور تھوڑی دیر میں ترمسو کی خلیج سے نکل کر بڑے سمندر میں داخل ہوگیا۔یہ سمندر جس میں ہم سفر کر رہے تھے ، دراصل بحیرۂ اوقیانوس (Atlantic) سے شمال کی طرف آیا ہے ، شروع میں اسے بحر شمال (North Sea) کہا جاتا ہے ، ناروے کی حدود میں آ کر اس کا نام بحیرۂ ناروے (Norwegian

Sea) ہوجاتا ہے۔اور جب یہ سمندر شمال میں ۶۶ عرض البلد پر پہنچ کر منطقہ باردہ [1] (Arctic Zone) میں داخل ہوتا ہے تو اسے بحر منجمد شمالی (Arctic Ocean) کہتے ہیں۔ ترمسو چونکہ منطقہ باردہ میں داخل ہے، اس لئے یہاں سے قطب شمالی تک پورا سمندر بحر منجمد شمالی ہی کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ چھوٹے چھوٹے خوب صورت جزیروں سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ کئی گھنٹے تک یہ بحری سفر اس طرح جاری رہا کہ جہاز کے دائیں اور بائیں دونوں طرف سرسبز وشاداب پہاڑ اور ان کے درمیان بہتی ہوئی ندیاں اور اوپر سے گرتے ہوئے آبشار بڑا دلفریب منظر پیش کررہے تھے۔ ہم نے عصر کی نماز اوسلو کے وقت کے مطابق تقریباً آٹھ بجے جہاز کے عرشے پر اذان دے کر باجماعت ادا کی۔ جہاز کی چھٹی منزل پر ایک شیشہ بند ہال تھا جس میں مسافروں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں، عصر کے بعد ہم اس ہال میں بیٹھ کر دونوں طرف کے شفاف شیشوں سے سمندر کے مناظر قدرت کا نظارہ کرتے رہے۔ سورج کو تو غروب ہونا ہی نہیں تھا، لیکن جب رات کے ساڑھے دس بج گئے تو ہم نے اوسلو کے وقت کے مطابق مغرب کی نماز ادا کی۔ سورج اس وقت کافی بلند تھا، لیکن بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور اس کی بکھری ہوئی کرنیں بادلوں میں نظر آرہی تھیں۔ عرشے پر سخت سردی تھی اور برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس لئے ہم شیشہ بند لاؤنج سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اور جب رات کے بارہ بجے تو سورج کا نظارہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت بادل اور زیادہ گہرے ہوگئے تھے۔ جہاز چھوٹی چھوٹی خلیجوں سے نکل کر بحر منجمد شمالی کے کھلے علاقے میں داخل ہوچکا تھا، اور سمندر کے تلاطم کی وجہ سے ہچکولے لے رہا تھا، مگر گہرے بادلوں کے

---

[1] جغرافیہ کی اصطلاح میں "منطقہ باردہ" (Arctic Circle) زمین کے اس حصے کو کہتے ہیں جو شمال میں ۶۶ درجے ۳۰ دقیقے عرض البلد سے ۹۰ درجے (قطب شمالی) تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سال کے کچھ دن ایسے آتے ہیں جن میں گرمی میں سورج غروب نہیں ہوتا، اور سردی میں طلوع نہیں ہوتا، ۶۶،۳۰ درجے سے عرض البلد جتنا زیادہ ہوتا جائیگا، گرمیوں میں دن اور سردیوں میں رات اتنی ہی طویل ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ ۹۰ عرض البلد (قطب شمالی) پر چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات رہتی ہے۔ جنوب میں اسی کے بالمقابل ۶۶ سے ۹۰ عرض البلد تک کا علاقہ دائرۂ قطب جنوبی (Antarctic Circle) کہلاتا ہے، اور وہاں بھی دن اور رات کی یہی حالت ہوتی ہے، لیکن وہاں کوئی آباد علاقہ اس دائرے میں نہیں آتا۔

باوجود پورے ماحول پر سورج کی اتنی روشنی موجود تھی جتنی ہمارے علاقوں میں مغرب سے ذرا پہلے ہوا کرتی ہے۔ معمول کے مطابق ۱۲ بجے کے بعد سورج نے شمال کی طرف مائل ہو کر بلند ہونا شروع کیا، اور رفتہ رفتہ ماحول میں روشنی بڑھنے لگی۔ چونکہ ہمیں نمازِ فجر کا انتظار تھا جو ہمیں اوسلو کے حساب سے پڑھنی تھی، اس لئے ہم دو بجے تک جاگتے رہے۔ اس دوران سمندر پر پھیلی ہوئی سورج کی روشنی بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ اگر بادل آسمان پر نہ ہوتے تو یقیناً دھوپ نظر آتی۔ ٹھیک دو بجے جہاز کھلے سمندر سے دو جزیروں کے درمیان ایک خلیج میں داخل ہوا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگر انداز ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کا نام ناروے کی زبان میں Oksfjord لکھا ہوا تھا جس کا صحیح تلفظ میں نہ کر سکا۔ یہ کوئی ماہی گیروں کی بستی تھی جو تین طرف سے پہاڑوں اور ایک طرف سے سمندر میں گھری ہوئی تھی، رات کے دو بجے تھے، مگر حد نظر تک سورج کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں جہاز صرف پندرہ منٹ رکا، اور دوبارہ بحر منجمد شمالی کی طرف روانہ ہو گیا، ہم فجر کی نماز پڑھ کر اپنے کیبن میں آ گئے۔ کیبن کی کھڑکی سے سمندر اور اس کے پس منظر میں سرسبز پہاڑ یہاں بھی سامنے تھے، اور دن کی روشنی کھڑکی کے ذریعے کیبن میں آ رہی تھی، لیکن چونکہ سونا تھا، اس لئے کھڑکی پر ممکن حد تک پردے ڈال کر مصنوعی جھٹپٹا پیدا کرنے کی کوشش کی اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو تقریباً سات بجے تھے، اور جہاز کھلے سمندر میں ۱۸ بحری میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں دواں تھا۔ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے مزید سفر کرنے کے بعد ہماری منزل افق پر نظر آنے لگی۔ یہ شمال کے اس حصے میں دنیا کا آخری آباد شہر ہونِنس ووگ (Honninsvog) تھا۔

ھونِنس ووگ میں سایۂ اصلی

دن کے گیارہ بجے کے قریب ہم اس شہر کی بندرگاہ پر اترے تو آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ خوب پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ ہم پچھلے دو روز سے دن کی روشنی ہی میں تھے اور رات کا اندھیرا دیکھے ہوئے تقریباً بہتر گھنٹے ہونے والے تھے، لیکن اس پورے عرصے میں آسمان زیادہ تر ابر آلود رہا تھا، لیکن ھونِنس ووگ میں چونکہ دھوپ مکمل پھیلی ہوئی تھی تو یہاں یہ بات

واضح طور پر نظر آئی کہ سورج کے خطِ نصف النہار سے گزرتے وقت ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے جسم سے زیادہ تھا۔ ہمارے معتدل علاقوں میں جب آفتاب نصف النہار کے خط پر پہنچتا ہے تو ہر چیز کا سایہ بہت چھوٹا ہو جاتا ہے اسے فقہاء کی اصطلاح میں سایۂ اصلی کہتے ہیں۔ کسی خطے کا عرض البلد جتنا کم ہوگا۔ وہاں سایۂ اصلی اتنا ہی چھوٹا ہوگا، یہاں تک کہ جو ممالک خطِ استواء کے نیچے (یعنی صفر عرض البلد پر) رہتے ہیں وہاں یہ سایہ بالکل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے سائز سے دوگنا ہو جائے، لیکن یہ دوگنا ہونا سایۂ اصلی کے علاوہ ہونا چاہئے۔ بعض اہل ظاہر نے فقہاء کی اس بات پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حدیث میں سایہ کے ایک مثل یا دو مثل ہونے کا تو ذکر ہے، لیکن سایۂ اصلی کا استثناء حدیث سے ثابت نہیں، اور فقہاء کرامؒ نے اپنی طرف سے اس استثناء کا اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر ان فقہاء کرامؒ کی بات بداہۃً ظاہر ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اگر سایۂ اصلی کا استثناء نہ کیا جائے تو ان شمالی علاقوں میں تو عین نصف النہار کے وقت ہی سایۂ ایک مثل سے زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا فقہاء کرامؒ کی یہ بات عقل عام (Common sense) کی بات ہے جس کے لیے کسی نص کی ضرورت نہیں یہ اور بات ہے کہ ایک حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

ہونِنسووگ ایک چھوٹا سا ساحلی شہر ہے، اور اس کے بعد قطب شمالی تک کوئی اور آبادی نہیں ہے، لہٰذا یہ اس سمت میں دنیا کا آخری شہر ہے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں کئی گھنٹے اپنے معارف القرآن کے کام میں مشغول رہا۔ پھر شام کو چھ بجے کے قریب ہم چہل قدمی کے لیے ساحل کی طرف نکلے تو راستے میں چند صومالی مسلمان مل گئے، انہوں نے بتایا کہ اس چھوٹے سے شہر میں بھی سات آٹھ صومالی اور چار پانچ عراقی مسلمان رہتے ہیں۔ مسجد تو کوئی نہیں، لیکن کسی گھر میں کبھی کبھی نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں، ہم نے ان سے کچھ گزارشات کیں، خدا کرے ان کا کچھ اثر ظاہر ہو، اور دنیا کے اس آخری سرے پر بھی اللہ تعالیٰ کا نام مستقل طور پر بلند ہونے لگے۔

ساحلِ سمندر کے ساتھ سیاحتی یادگاروں کی ایک دکان تھی۔اس دکان میں منطقۂ باردہ (Arctic Region) کے مشہور برفانی ریچھ کا ایک حقیقی خول رکھا ہوا تھا۔یعنی کسی نے برفانی ریچھ کو مار کر اس کی آلائشیں نکال کر اس کی کھال اس طرح بنا کر رکھی تھی کہ وہ بالکل زندہ ریچھ معلوم ہوتا تھا، ہم نے اس کے سفید براق بالوں کو ہاتھ لگایا تو وہ اتنے ملائم اور خوشگوار تھے کہ ان پر بار بار ہاتھ پھیرنے کو دل چاہتا تھا۔ان خوبصورت اور ملائم بالوں کے نیچے بڑی دبیز جلد تھی۔اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا یہ کرشمہ ہے کہ اتنے خوفناک درندے کو اتنا حسین اور اتنا ملائم لباس عطا فرمایا۔ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ یہ گناہوں کی لذت اور رنگینی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ان کے ظاہر میں حسن اور لذت ہے، لیکن انجام کے اعتبار سے وہ ایک خوفناک درندے سے کم نہیں جو انسان کی ہلاکت کیلئے کافی ہے۔ہاں اگر کوئی شخص اس درندے کو شکار کر کے اس میں سے گناہ کا عنصر نکال پھینکے تو وہ اس کے حسن اور لذت سے دنیا میں بھی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

اسی دکان میں اس علاقے میں سورج کی گردش کا نظارہ کرنے والی ایک تصویر بھی ملی جس میں کسی شخص نے رات کے آٹھ بجے سے صبح کے چار بجے تک ہر گھنٹے پر سورج کی مختلف پوزیشنوں کی تصویریں لے کر ان تمام تصویروں کو ایک ساتھ جوڑ دیا تھا، اس تصویر سے واضح ہوتا ہے کہ رات آٹھ بجے کے بعد بارہ بجے تک سورج کس طرح بتدریج مغرب کی سمت نیچے آتا ہے لیکن بارہ بجے افق کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد دوبارہ شمال کی طرف بلند ہونا شروع ہوجاتا ہے یہاں تک کہ رات کے چار بجے وہ شمال میں اتنا ہی بلند ہوجاتا ہے جتنا آٹھ بجے وہ جنوب میں بلند تھا۔ان ساری تصویروں کو ملانے سے ایک سنہرے گلوبند کا سا منظر سامنے آتا ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ جنوب اور شمال میں اس کی اونچائی میں کہیں بال برابر فرق نہیں آتا۔

(یہ تصویر سامنے کے صفحے پر سے ملاحظہ فرمایئے) فتبارک اللہ احسن الخالقین.

سورج کو غروب تو ہونا ہی نہیں تھا۔اس لئے ہم نے مغرب کی نماز ساڑھے دس (۱۰-۳۰) بجے ایسے وقت ادا کی جب سامنے دھوپ خوب پھیلی ہوئی تھی۔ہونِنس ووگ کے شہر سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر وہ مشہور جگہ ہے جو نارتھ کیپ (North Cape) کے

نام سے معروف ہے۔ یہ کوئی بستی نہیں بلکہ شمال میں دنیا کی خشکی کا آخری کنارہ ہے جس کے بعد قطب شمالی تک اس سمندر کے سوا کچھ نہیں ہے جو آگے جاکر سردی سے منجمد ہوگیا ہے اور اسے بحر منجمد شمالی کہا جاتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ دنیا کے اس آخری سرے پر ہم آدھی رات (۱۲ بجے شب) کے وقت پہنچیں اور نماز عشاء بھی وہیں ادا کریں۔ چنانچہ تقریباً گیارہ بجے رات ہم ایک کوچ میں سوار ہوکر نارتھ کیپ کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر سے نکلنے کے بعد پہاڑوں، وادیوں اور سمندری خلیجوں کا ایک خوب صورت سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور ایک بات میں نے یہ نوٹ کی کہ کئی سال پہلے میں جنوبی افریقہ کے جنوبی سرے (South Cape) تک بھی گیا ہوں جسے جنوب کی طرف دنیا کا آخری کنارہ کہنا چاہیے، وہاں کی زمین کا اتار چڑھاؤ اور عمومی منظر بھی اس شمالی سرے سے کافی ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں کے پہاڑوں پر جگہ جگہ برف پڑی ہوئی نظر آرہی تھی، اور سردی نقطہ انجماد کے قریب قریب تھی، لیکن ساؤتھ کیپ کا عرض البلد چونکہ اتنا زیادہ نہیں ہے (وہ تقریباً ۴۵ درجے عرض البلد پر واقع ہے) اس لئے وہاں سردی اور برف کا یہ منظر نظر نہیں آتا، لیکن زمین کا عمومی منظر خاصا ملتا جلتا ہے، جس خالقِ کائنات نے یہ زمین اور اس کے مختلف علاقے پیدا فرمائے ہیں، وہی اپنی تخلیق کے راز جانتا ہے، انسان کے پاس ان عجائب قدرت پر حیرت کے سوا اور کیا ہے؟

نارتھ کیپ

پونے بارہ بجے کے قریب ہم نارتھ کیپ پر جا کر اترے۔ یہ ۷۱ درجے ۱۰ دقیقے اور ۲۱ ثانیے کے عرض البلد پر واقع ایک سطح مرتفع کا کنارہ ہے جو بحر منجمد شمالی پر جھانکتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کنارے پر شمال میں دنیا ختم ہوگئی ہے، اور اس کے بعد قطب شمالی تک اس رخ پر کوئی خشکی نہیں ہے۔ ہم یہاں پہنچے تو دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کا ایک ہجوم تھا جو دنیا کے آخری سرے سے ''آدھی رات کا سورج'' دیکھنے کے لیے یہاں جمع تھے۔ سردی اس قدر شدید اور برفانی ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ پہنے ہوئے تمام کپڑے ناکافی معلوم ہو رہے تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گرمی کے موسم میں (جب کہ مہینوں سے یہاں رات نہیں آئی، اور افق پر سورج

مسلسل موجود ہے) سردی کا یہ عالم ہے تو سردی کے موسم میں جب کہ مہینوں سورج کی شکل نظر نہیں آتی، ٹھنڈک کا یہاں کیا عالم ہوگا؟ تھوڑی دیر اس ٹیلے سے سامنے کے سمندر اور سورج کی کرنوں کا منظر دیکھنے کے بعد زیادہ دیر کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی تو ہم قریب بنے ہوئے ایک شیشہ بند ہال میں چلے گئے، اور جب رات کے سوا بارہ بجے تو دوبارہ باہر نکل کر نارتھ کیپ کے آخری سرے پر بنے ہوئے ایک چبوترے پر پہنچے، سورج اپنے آخری نقطے تک پہنچنے کے بعد بلند ہونا شروع ہوگیا تھا، اس وقت افق پر کچھ مہین بادل آگئے تھے، مگر سورج کی کرنیں بادلوں کے کناروں سے آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور انہوں نے ماحول کو منور کیا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر کھڑے ہوکر ہم نے بلند آواز سے اذان دی، اور اس کے بعد عشاء کی نماز باجماعت ادا کی۔

رات کے ایک بجے ہم یہاں سے شہر کی طرف واپس ہوئے تو سورج کی روشنی پہلے سے زیادہ ہوگئی تھی، راستے میں جگہ جگہ قطب شمالی کی طرف منسوب بارہ سنگھے (reindeers) چرتے ہوئے نظر آئے۔ اور ان دلنواز مناظر سے لطف اندوز ہوکر رات کو تقریباً دو بجے ہم دوبارہ قیام گاہ پر پہنچے۔ یہ ہماری تیسری رات تھی جس میں سورج غروب نہیں ہوا تھا، اور دو بجے کے بعد فجر پڑھ کر سونے کے لیے ہمیں کمرے میں مصنوعی اندھیرا پیدا کرنا پڑا تھا۔

ان مقامات پر نمازوں کا حکم

آگے بڑھنے سے پہلے میں اسی مرحلے پر اس سوال کا جواب دیدوں کہ ان جیسے مقامات پر جہاں مہینوں سورج غروب یا طلوع نہیں ہوتا، نمازوں کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے؟

صورتحال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ سوال تو سامنے نہیں آیا تھا کہ جن خطوں میں دن ہی دن یا رات ہی رات رہتی ہے وہاں نماز کیسے پڑھی جائے گی؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور واقعے کے ضمن میں اس سلسلے کی ایک اصولی ہدایت عطا فرمادی تھی۔

صحیح مسلمؒ میں حضرت نواسؓ بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجاّل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دنیا میں چالیس دن رہے گا، ان چالیس دنوں میں سے ایک دن ایک سال کے برابر، ایک دن ایک مہینے کے برابر اور ایک دن ایک ہفتے کے برابر ہوگا، اور باقی دن تمہارے عام دنوں جیسے ہوں گے؟ اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے پوچھ لیا کہ ''جو دن ایک سال کے برابر ہوگا، کیا ہمارے لئے اس دن میں صرف ایک ہی دن کی نمازیں کافی ہوں گے؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''لا، اقدروا لہ قدرہ'' یعنی ''نہیں، اس کے لئے اندازے سے وقت مقرر کرنا۔''

میں پیچھے لکھ چکا ہوں کہ بلغار جیسے علاقے جن میں عشاء کا وقت نہیں آتا، ان میں راجح قول کی بنیاد پر عشاء کی نماز حساب لگا کر پڑھنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کی بنیاد یہی حدیث ہے۔

قدیم فقہاء کرامؒ کے زمانے میں مسلمانوں کی آبادی ایسے علاقوں ہی تک پہنچی تھی جہاں شفق غائب نہیں ہوتی، مگر ۲۴ گھنٹے میں دن اور رات دونوں آجاتے ہیں، رہے قطبین کے قریب کے وہ علاقے جہاں ۲۴ گھنٹے میں دن اور رات کا دورہ مکمل نہیں ہوتا ان میں مسلمانوں کی آبادی نہیں پہنچی تھی، اس لئے ان علاقوں کے حکم سے قدیم فقہاء نے بحث نہیں فرمائی۔ لیکن جب سے ان علاقوں میں بھی مسلمان پہنچ گئے ہیں، اس وقت سے فقہاء عصر نے ان علاقوں کے احکام پر بھی بحث کی ہے، اور بحث کا مرکزی نقطہ وہی ہے جو بلغار کے سلسلے میں پیش آیا۔ یعنی نماز کے وقت کی معروف علامتوں کے نہ آنے کی صورت میں نماز فرض بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ جو لوگ بلغار جیسے شہر میں نماز عشاء کو فرض نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ جن علاقوں میں کئی مہینے تک دن رہتا ہے، ان میں اس پورے عرصے میں پانچ نمازیں ہی فرض ہوں گی۔ لیکن میں پیچھے عرض کر چکا ہوں کہ دلائل کے نقطہ نظر سے یہ قول کمزور اور مرجوح ہے۔ اور دجال کے بارے میں جو حدیث اوپر لکھی گئی ہے اس سے یہ اصول واضح طور پر برآمد ہوتا ہے کہ جب دن اتنا لمبا ہو جائے کہ ۲۴ گھنٹے میں شب و روز کا دورہ مکمل نہ ہو تو اوقات نماز کی معروف علامتوں کا اعتبار نہیں رہتا، بلکہ ایسے موقع پر حساب لگا کر نمازیں ادا کرنی چاہئیں۔ اب ان علاقوں میں

حساب لگانے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کی گئی ہیں، لیکن ان میں سب سے راجح، بہتر اور قابل عمل تجویز یہ ہے کہ ان علاقوں سے قریب تر وہ علاقہ جہاں چوبیس گھنٹے میں دن رات پورے ہو جاتے ہوں، اس میں جس نماز کا جو وقت ہو، ان علاقوں میں بھی اس وقت وہ نماز پڑھی جائے۔ مثلاً اگر قریب ترین معتدل علاقے میں نماز مغرب نو بجے ہوتی ہے، اور عشاء ساڑھے دس (۱۰۔۳۰) بجے تو یہاں بھی مغرب اور عشاء بالترتیب ۹ بجے اور ساڑھے دس (۱۰۔۳۰) بجے پڑھی جائے، چاہے اس وقت سورج افق پر موجود ہو۔

پھر اس تجویز پر عمل کرنے کے بھی دو طریقے ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ معیار کسی ایسے قریبی شہر کو بنایا جائے جس میں پانچوں نمازوں کے اوقات اپنی معروف علامتوں کے ساتھ آتے ہوں۔ چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی ایک قرارداد میں یہ تجویز دی گئی ہے کہ جو علاقے ۴۵ درجے عرض البلد پر واقع ہیں، ان کو معیار قرار دے کر غیر معتدل علاقوں میں تمام نمازوں کا وقت ۴۵ درجے کے اوقات کے مطابق متعین کیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے شہر کو معیار بنایا جائے جو ان غیر معتدل علاقوں کے قریب ہو، اور اس میں نمازوں کے اکثر اوقات آتے ہوں، خواہ وہاں شفق غائب نہ ہوتی ہو، اس طریقے کے مطابق ترمسو وغیرہ میں جب دن ہی دن رہتا ہے اس وقت نمازیں اوسلو کے اوقاتِ نماز کے مطابق پڑھی جاسکتی ہیں۔

ان دو طریقوں میں سے پہلا طریقہ احتیاط کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عملی آسانی دوسرے طریقے میں ہے۔ خاص طور پر ایسے شہروں میں جہاں مسلمان اکا دکا آباد ہیں، اور انہیں ۴۵ درجے عرض البلد کے اوقات کا پتہ لگانا آسان نہیں۔ لہٰذا ترمسو اور اس سے اوپر کے شہروں میں اگر اوسلو کے اوقات نماز کی پیروی کی جائے تو یہ جائز اور درست ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث دجال میں یہ اصول تو بیان فرما دیا کہ ''نمازیں اندازہ کر کے پڑھی جائیں''، لیکن اندازہ کرنے کا مفصل طریقہ بیان نہیں فرمایا۔ شاید اس میں حکمت یہی ہو کہ اندازے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اور جس جگہ جو طریقہ زیادہ قابل عمل ہو کہ اس میں

زیادہ تنگی لازم نہ آئے، وہاں وہ طریقہ اختیار کرلیا جائے۔

ترمسو میں جس مسلمان سے ملاقات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، اس نے یہی بتایا کہ یہاں کی مسجد میں اوسلو کے حساب سے نمازیں پڑھنے کا معمول ہے۔

ترمسو اور نارتھ کیپ میں سورج کی گردش کا حال دیکھنے کے بعد ایک بات کا مزید اندازہ یقین کے قریب قریب ہوگیا، اور وہ یہ کہ جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ جن علاقوں میں کئی ماہ تک سورج غروب نہیں ہوتا وہاں ان کئی مہینوں میں مجموعی طور پر صرف پانچ نمازیں ہی فرض ہیں، ان کا یہ فرمانا ان علاقوں کا مشاہدہ نہ کرنے پر مبنی ہے۔ اسی لیے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ ان کئی ماہ میں مغرب کی طرح ظہر کا وقت بھی صرف ایک مرتبہ اور عصر کا وقت صرف ایک مرتبہ آئے گا۔ حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں سورج خطِ نصف النہار سے ہر روز گزرتا ہے۔ لہٰذا ہر ۲۴ گھنٹے میں سورج کا سایہ (سایہ اصل کو چھوڑ کر) ایک مثل اور دو مثل ہوتا ہے، گویا ہر ۲۴ گھنٹے میں یہاں ایک ایک مرتبہ ظہر اور عصر کا وقت ضرور آتا ہے۔ اور یہ کہنا درست نہیں کہ تین ماہ کے دوران ظہر اور عصر کا وقت صرف ایک بار آتا ہے۔ لہٰذا روزانہ ظہر اور عصر کی فرضیت ان حضرات کے قول پر بھی ہوتی ہے جو نماز کی فرضیت کے لیے علاماتِ وقت کو علت تامہ مانتے ہیں۔ اور یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ یہ تین ماہ پورے کے پورے ایک دن کے حکم میں ہیں اور ان تین ماہ میں صرف پانچ نمازیں ہی فرض ہوں گی۔ کیونکہ جب ہر ۲۴ گھنٹے میں ایک ایک مرتبہ ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقت آتا ہے، اور یہ نمازیں اپنے اوقات کے ساتھ فرض ہوتی ہیں تو معلوم ہوا کہ ۲۴ گھنٹے میں ایک دن پورا ہو جاتا ہے، اور پورے تین ماہ کو ایک دن قرار دینا درست نہیں۔

ہاں البتہ قطب شمالی، یعنی ٹھیک ۹۰ عرض البلد پر ظاہر یہ ہے کہ سورج کی گردش مکمل طور پر رحوی ہوتی ہوگی۔ اور اس میں اشیاء کا سایہ چوبیس گھنٹے ایک ہی سائز کا رہتا ہوگا، اس لئے ٹھیک اس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظہر اور عصر کا تعین سائے سے کرنا مشکل ہوگا، اگرچہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہاں بھی جب سورج خطِ نصف النہار سے گزر جائے تو اسے ظہر کا وقت سمجھنا چاہئے (احسن الفتاوی ص ۱۲۶ ج ۲)۔

بہرصورت! ٹھیک ۹۰ عرض البلد پر تو کسی انسان کا پہنچ کر نماز پڑھنا ابھی تک ایک موہوم مفروضہ ہے، لیکن شمالی منطقہ باردہ (Arctic zone) کے بیشتر علاقے ایسے ہیں جن میں ظہر اور عصر دونوں کی علامتیں کسی شبہے کے بغیر پائی جاتی ہیں، لہٰذا چوبیس گھنٹے میں ان کا ایک دن پورا ہو جاتا ہے، خواہ سورج غروب نہ ہو۔ لہٰذا اگر تین مہینے تک وہاں سورج غروب نہیں ہوا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ تین مہینے ایک دن ہیں بلکہ یہ واقعۃً تین مہینے ہی ہیں، جن میں ہر روز ظہر اور عصر کا وقت آتا رہا ہے، لہٰذا باقی نمازیں بھی چوبیس گھنٹے کے اندر ہی ادا کرنی ضروری ہوں گی اور پورے تین ماہ میں صرف پانچ نمازیں پڑھنے کا تصور ان مقامات پر بداہۃً غلط ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان مقامات پر بھی چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ہی پڑھنی ضروری ہیں، البتہ مغرب، عشاء اور فجر کے اوقات کے تعین میں اس منطقہ باردہ (arctic zone) کے لوگ جو ۶۶،۳۰ عرض البلد سے اوپر رہتے ہیں، غیر معتدل ایام میں یا تو اوسلو کے اوقات کو معیار بنا سکتے ہیں، یا ۴۵ عرض البلد کے کسی شہر کو اور اوسلو میں عشاء کے وقت کی تفصیل میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں۔

اب میں دوبارہ سفر کے حالات کی طرف لوٹتا ہوں۔

اوسلو میں واپسی

۲۴ رجولائی کی صبح ہمیں ہوننس ووگ سے بذریعہ ہوائی جہاز ترمسو اور وہاں سے اوسلو واپس جانا تھا۔ ہوننس ووگ سے جو جہاز ملا، وہ پہلے ایک اور شہر ھیمر فیسٹ (Hammerfest) میں رکا، پھر ہمیں ترمسو لے گیا۔ جب جہاز ترمسو میں اترنے لگا تو میں نے دیکھا کہ میرا گشتی (موبائل) فون جو میں نے سیٹ پر رکھا ہوا تھا، غائب ہے۔ میرا یہ فون صرف ایک گشتی فون ہی نہیں ہے، بلکہ یہ میری ڈائری بھی ہے جس میں ساری دنیا کے اہل تعلق کے پتے، فون نمبر اور میرا سال بھر کا پروگرام بھی اسی میں ہے لہٰذا وہ میری ناگزیر ضرورت بن چکی ہے۔ تمام ممکنہ جگہوں پر تلاش کے باوجود وہ نہ ملا تو جہاز کے عملے سے

پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک موبائل فون ہمیں ایک ایسی سیٹ پر ملا تھا جس کا مسافر ھیمر فیسٹ میں اتر گیا تھا۔ اس لئے ہم یہ سمجھے کہ یہ فون اس اترنے والے مسافر کا ہوگا، چنانچہ ہم نے وہ فون اپنے ھیمر فیسٹ کے زمینی عملے کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ کوئی بچہ وہ فون میری سیٹ سے اٹھا کر دوسری سیٹ پر لے گیا۔ اور اس طرح جہاز کا عملہ اسے ھیمر فیسٹ چھوڑ آیا۔ لیکن جہاز کے عملے نے ہمیں اطمینان دلایا کہ اسے جلد از جلد اوسلو پہنچانے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ پھر جب عملے کو یہ معلوم ہوا کہ ہمیں اوسلو روانہ ہونے سے پہلے تقریباً ڈھائی گھنٹے ترمسو ایئر پورٹ پر ٹھہرنا ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو ترمسو میں اتارنے کے بعد یہ جہاز دوبارہ ھیمر فیسٹ جا کر ترمسو واپس آئے گا، اور ہم کوشش کریں گے کہ یہ ترمسو سے آپ کی روانگی سے پہلے ہی ترمسو میں آپ کو مل جائے۔

ہم ترمسو ایئر پورٹ پر اتر گئے۔ جہاں اوسلو جہاز میں سوار ہونے کے لئے ہمیں تقریباً ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ اسی دوران ظہر کا وقت ہوگیا، اور ہم نے ظہر کی نماز ادا کی۔ ہم نے پروازوں کا نظام الاوقات دیکھا تو پتہ چلا کہ جس جہاز سے ہمیں روانہ ہونا تھا، اس کی پرواز کا وقت تین بج کر ۴۰ منٹ تھا، اور ھیمر فیسٹ سے آنے والا جہاز ساڑھے تین بجے پہنچنے والا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ درمیان میں صرف دس منٹ کا وقفہ تھا، اور اگر ھیمر فیسٹ سے آنے والا جہاز میرا موبائل فون لے بھی آئے تو وہ اس وقت زمین پر اترے گا جب ہم جہاز میں بیٹھ چکے ہوں گے، اور فون کو ہم تک پہنچانے کے لیے یہ وقفہ ناکافی ہے۔ تاہم جب ہم اپنے جہاز پر سوار ہونے کے لیے جہاز کے گیٹ پر پہنچے اور گیٹ پر اپنا بورڈنگ کارڈ دکھایا تو کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کمپیوٹر دیکھ کر بتایا کہ آپ کے لیے ایک پیکٹ ھیمر فیسٹ سے روانہ ہوا ہے جو جہاز کی روانگی سے پہلے ترمسو پہنچنے کی امید ہے، لیکن ہم اس کے انتظار میں جہاز کو لیٹ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اگر وہ پہنچ گیا تو خیر، ورنہ ہم وہ آپ کو اوسلو میں پہنچائیں گے۔ بالآخر ہم جہاز میں سوار ہوگئے، اور کھڑکی سے ہر اترتے ہوئے جہاز کو دیکھتے رہے، تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے وہی جہاز زمین پر اترا جس سے ہم ترمسو آئے تھے، اس وقت جہاز کی روانگی میں ۱۰ منٹ باقی تھے، لیکن جہاز کو اترنے کے بعد ٹیکسی کرنے اور اپنی جگہ تک پہنچنے میں چار پانچ منٹ

لگ گئے ۔ جونہی جہاز اپنی جگہ پہنچ کر کھڑا ہوا اور اس پر سیڑھی لگی، ہم نے دیکھا کہ نیلی وردی میں ملبوس ایک شخص سب سے پہلے جہاز سے نکلا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا ایئرپورٹ کی عمارت کی طرف لپکا، اس کے ہاتھ میں کوئی چیز بھی دور سے نظر آ رہی تھی، ہمارا غالب گمان یہی تھا کہ یہ شخص میرا موبائل لے کر آیا ہے، لیکن جس جگہ وہ اترا تھا وہ ہمارے جہاز کی جگہ سے کافی فاصلے پر تھی۔ وہ شخص ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا، یہاں تک کہ ہمارے جہاز کے دروازے بند ہو گئے، اور روانگی کا وقت ہو جانے پر جہاز نے رینگنا شروع کر دیا۔ اب ہمیں حسرت ہوئی کہ چند لمحوں کے فرق سے فون ہم تک نہ پہنچ سکا، چونکہ اوسلو کا ایئرپورٹ شہر سے ۶۰۔۷۰ کلومیٹر دور ہے، اس لئے اوسلو ایئرپورٹ سے اس کو وصول کرنا ایک مستقل کام بن جائے گا جس کے لیے کئی گھنٹے درکار ہوں گے۔ لیکن ابھی ہم اس پر حسرت کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک ایئرہوسٹس آئی، اور میری سیٹ کے پاس آ کر اس نے ایک پیکٹ میرے حوالے کیا، اور کہا کہ یہ پیکٹ آپ کے لیے ھیمر فیسٹ سے آیا ہے۔ میں نے مسرت اور تعجب کے ساتھ اس سے پوچھا کہ جہاز کے دروازے تو بند ہو چکے تھے، یہ آپ تک کیسے پہنچا؟ ایئرہوسٹس نے جواب دیا کہ لانے والے نے بڑی تیزی سے لا کر یہ پیکٹ باہر سے جہاز کے کپتان کے حوالے کر دیا تھا۔ پیکٹ کھولا تو اس میں میرا فون صحیح سالم حالت میں میرے ہاتھ میں تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس احساسِ ذمہ داری، چابکدستی اور ہمدردی کے ساتھ ایئرلائنز کے لوگوں نے یہ فون مجھ تک پہنچانے کا اہتمام کیا، اس کی دل میں بڑی قدر ہوئی۔ واضح رہے کہ ھیمر فیسٹ سے لانے والی اور ہمیں اوسلو لے جانے والی ایئرلائن ایک نہیں تھی، دونوں الگ الگ کمپنیاں تھیں، نیز اس فون کو ہم تک پہنچانے کی قانونی ذمہ داری ان پر نہیں تھی، کیونکہ وہ بک کرائے ہوئے سامان کا حصہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اتنے اہتمام اور ذمہ داری کے ساتھ امانت کو اس کے حقدار تک پہنچانا یقیناً قابلِ تعریف تھا۔

بہر کیف! شام چھ بجے کے قریب ہم دوبارہ اوسلو پہنچ گئے۔ رات کا کھانا ہمارے دوست صدیقی صاحب کے مکان پر تھا۔ یہ اوسلو کی ہردلعزیز شخصیت ہیں اور اوسلو میں حلال گوشت

اور دوسری اشیاء کی تجارت کرتے ہیں، یہاں انہوں نے ایک پاکستانی ریسٹورنٹ بھی کھولا ہوا ہے، جس محلے میں ان کا مکان اور دکان ہے وہ پاکستانی باشندوں کی کثرت کی وجہ سے پاکستان ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے یہاں تک کہ دکانوں پر لگے ہوئے بورڈ بھی اردو میں لکھے ہوئے ہیں۔ آج اوسلو میں غروب آفتاب کا وقت دس بجے تھا، اور نوے گھنٹے (تقریباً ساڑھے تین دن) اس حالت میں گذارنے کے بعد کہ ہمارے سامنے سورج غروب نہیں ہوا، یہاں غروبِ آفتاب کا نظارہ کیا۔

سویڈن میں

اگلے دن سہ پہر ساڑھے تین بجے ہم ٹرین کے ذریعے سویڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہوم کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ چھ گھنٹے کا سفر تھا۔ ٹرین بڑی صاف ستھری اور آرام دہ تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ ناروے میں چلنے کے بعد ہم سویڈن کی حدود میں داخل ہو گئے تھے، اور ٹرین نے زیادہ مسافت سویڈن میں طے کی۔ یہ پورا راستہ بڑا سرسبز و شاداب اور پہاڑوں، جھیلوں اور دریاؤں کے خوب صورت مناظر سے آراستہ تھا۔ رات کے ساڑھے نو بجے ٹرین اسٹاک ہوم پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر ہمارے دوست چودھری محمد اخلاق صاحب استقبال کے لیے موجود تھے۔ یہ اسٹاک ہوم کے بااثر تاجر ہیں، اور ان کی کرسٹل کی متعدد دکانیں سویڈن اور ناروے میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کی ایک خوب صورت مسجد کی کمیٹی کے صدر بھی ہیں اور مسلمانوں کی دینی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہتے ہیں۔

ریلوے اسٹیشن اسٹاک ہوم کے مرکزی علاقے کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ اور اسی کے قریب ہوٹل شیراٹن ہے جہاں ہمارا قیام ہوا۔ یہاں غروب آفتاب دس بجے سے چند منٹ پہلے ہو رہا تھا، چنانچہ ہوٹل پہنچ کر ہم نے نماز مغرب ادا کی۔ اخلاق صاحب ہمیں ایک لبنانی ریسٹورنٹ میں لے گئے جہاں حلال گوشت کا انتظام ہے۔ رات کا کھانا لبنانی انداز کے بھنے ہوئے گوشت کی صورت میں بڑا لذیذ ثابت ہوا۔

اگلے دن اسٹاک ہوم میں کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ دن کے پہلے نصف میں اخلاق

صاحب نے شہر کی سیر کرائی ۔ یہ اسکینڈی نیویا کا سب سے بڑا اور بارونق شہر ہے۔ تمدنی حسن کے اعتبار سے بھی یہ تمام شمالی ممالک پر فوقیت رکھتا ہے اور اسے شمالی یورپ کا وینس کہا جاتا ہے۔ سویڈن کا رقبہ ۱۷۳۴۲ مربع میل ہے، جو شمال میں ۵۵ سے لے کر ۷۰ عرض البلد تک پھیلا ہوا ہے، لیکن اس کی آبادی نوملین (نوے لاکھ) سے زیادہ نہیں ۔ اگرچہ قدرتی حسن کے لحاظ سے یہ علاقہ ناروے کی ہمسری تو نہیں کرتا، لیکن نوے ہزار جھیلوں[۱] پر مشتمل یہ ملک بھی اپنے طبعی مناظر کے لحاظ سے دنیا کے حسین ملکوں میں شمار ہوتا ہے، اور سیاسی اعتبار سے اسے اسکینڈی نیویا کا نمبر ایک ملک سمجھا جاتا رہا ہے ، کیونکہ عرصہ دراز تک ناروے پر بھی اسی کی حکومت رہی ہے۔

ہوٹل شیراٹن، جس میں ہم مقیم تھے، وسط شہر میں ایک سمندری خلیج کے سامنے واقع تھا۔ اور اس کے دائیں جانب اسٹاک ہوم کے سٹی ہال کا فلک بوس ٹاور واقع ہے جو نوبل ٹاور بھی کہلاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا مشہور نوبل انعام اسی جگہ دیا جاتا ہے الفریڈ برنارڈ نوبیل (Alfred Berrnard Nobel) دراصل اسٹاک ہوم کا سائنس دان تھا، جس نے ڈائنا مائٹ ایجاد کیا۔ کیمسٹری اور انجینئرنگ میں اس نے کمال حاصل کیا تھا، اور اس کے ذریعے بہت دولت کمائی، بالآخر اس نے اپنے انتقال (۱۸۹۶ء) سے پہلے اس دولت سے ایک ٹرسٹ قائم کر کے یہ وصیت کردی تھی کہ ہر سال کسی ایسے شخص کو اس ٹرسٹ سے عالمی انعام دیا جائے جس نے سائنس، ادب اور معاشیات میں یا قیام امن کے لیے کوئی نمایاں خدمت عالمی سطح پر انجام دی ہو۔ چنانچہ ہر سال نوبل پرائز کے نام سے چھ انعامات چھ افراد کو دیئے جاتے ہیں جن کا فیصلہ تین سویڈن کے ادارے اور ایک ناروے کا ادارہ مل کر کرتے ہیں ۔ یہ انعامات ہر سال ۱۰ دسمبر کو (جو نوبل کی تاریخ وفات ہے) اسٹاک ہوم کے اسی سٹی ہال میں دیئے جاتے ہیں ۔ اور اسی کے نام پر یہ ٹاور نوبل ٹاور کہلاتا ہے ۔ جس پر لوگ سیڑھیوں سے چڑھ کر جاتے ہیں، اور شہر کا نظارہ کرتے ہیں ۔

---

[۱] برٹانیکا (مائیکروپیڈیا) ص ۳۳۶ ج ۱۱

اسٹاک ہوم کی سب سے بڑی مسجد بھی ہمارے ہوٹل کے قریب واقع تھی۔ یہ بڑی پرشکوہ، خوب صورت اور عالیشان مسجد ہے۔ سویڈن میں اس وقت مسلمانوں کی آبادی کا اندازہ چار لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں کے عرب مسلمانوں نے ''الرابطة الاسلامیة'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، اور اسی کی کوششوں سے گنبد اور مینار والی یہ شاندار مسجد تعمیر ہوئی۔ وسطِ شہر میں بنی ہوئی ایسی وسیع وعریض مسجدیں بہت سے اسلامی ملکوں میں بھی کم دیکھنے میں آتی ہیں، اس میں صفائی ستھرائی اور وضوخانوں کا انتظام بھی قابلِ رشک حد تک مثالی ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک اسلامی مرکز بھی ہے جس میں ہر روز دینی معلومات فراہم کرنے کے لیے مختلف دروس کا انتظام ہے اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے مختلف کام کیے جاتے ہیں۔

چودھری اخلاق صاحب نے بتایا کہ اسٹاک ہوم میں چھوٹی بڑی مسجدوں کی کل تعداد تقریباً پینتالیس ہے۔

یہ جمعرات کا دن تھا۔ اور دن کا دوسرا نصف حصہ میں نے ہوٹل ہی میں گذارا جس میں معارف القرآن کا جو کام میرے ساتھ تھا، وہ کرتا رہا۔

اگلا دن جمعہ تھا، اور مجھے جمعہ کا خطاب اس مسجد میں کرنا تھا جو پاکستانی مسلمانوں نے تعمیر کی ہے، اور جب میں پچھلے سال یہاں آیا تھا تو اس میں تعمیری کام چل رہا تھا۔ اب ماشاء اللہ اس کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ چودھری اخلاق صاحب اسی مسجد کے صدر ہیں۔ یہاں جمعہ سے پہلے میرا خطاب ہوا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اسٹاک ہوم کے بہت سے احباب سے ملاقات ہوئی۔ سویڈن میں پاکستان کے سفیر جناب شاہد کمال صاحب، جو ابھی چند ماہ پہلے ہی یہاں سفیر بن کر آئے ہیں، جمعہ میں موجود تھے، ان سے اور سفارت خانے کے دوسرے عملے سے بھی ملاقات ہوئی۔

فن لینڈ کا سفر

اسی روز شام پانچ بجے ہمیں بحری جہاز سے فن لینڈ کے دارالحکومت ہلسنکی جانا تھا۔

چنانچہ جمعہ کے کچھ دیر بعد اخلاق صاحب ہمیں اسٹاک ہوم کی بندرگاہ پر لے گئے۔ یہاں مختلف جہاز راں کمپنیوں نے اپنی اپنی گودیاں الگ بنائی ہوئی ہیں، ہمیں جس جہاز سے سفر کرنا تھا، وہ سیلیالائن (Silija Line) تھی، چنانچہ ہم اس کے ٹرمینل پر پہنچے۔ یہ ٹرمینل ایئرپورٹ ٹرمینل کی طرح صاف ستھرا اور منظّم تھا۔ یہ جہاز اس جہاز کے مقابلے میں بہت بڑا تھا جس میں ہم نے نارتھ کیپ کا سفر کیا تھا۔ یہ تیرہ منزلہ جہاز تھا اور گودی سے بنے ہوئے پل کے ذریعے جب جہاز میں داخل ہوں تو یہ جہاز کی ساتویں منزل تھی، اور یہ جہاز کی منزل کیا تھی؟ ایک بارونق بازار تھا، جس میں دورویہ دکانیں اور ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے، اور جگہ جگہ کیپسول لفٹیں مسافروں کو ایک منزل سے دوسری منزل تک لے جانے کے لیے موجود تھیں۔ غرض پورا جہاز ایک چھوٹا سا منظّم شہر تھا جس میں تمام شہری سہولیات مہیا تھیں۔

جہاز پانچ بجے اسٹاک ہوم سے روانہ ہوا، اور اس نے بحیرۂ بالٹک میں سفر شروع کردیا۔ یہ سفر بھی اپنے مناظر کے لحاظ سے بڑا پرلطف رہا۔ دس بجے سورج غروب ہوا تو سمندر سے شفق کی سرخی اور سفیدی کی حدود زیادہ بہتر طریقے پر دیکھی جاسکتی تھیں، چنانچہ میں جہاز کے عرشے سے رات ڈھائی بجے تک افق پر شفق کا سفر دیکھتا رہا، اور یہ بات واضح طور پر مشاہدہ میں آئی کہ شفق ابتدا میں جنوب کی طرف مائل تھی پھر رفتہ رفتہ وہ شمال کی طرف بڑھتی گئی، یہاں تک کہ مشرق کی طرف مائل ہونے لگی، شفق کے اسی سفر کے دوران شمال مشرق سے سورج کو نکل آنا تھا۔ اس لئے ان حضرات کی بات کی تائید ہوئی جو یہ کہتے ہیں کہ جن مقامات پر شفق غائب نہیں ہوتی، وہاں جب شفق مشرق کی طرف مائل ہوجائے تو فجر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

صبح ہم بیدار ہوئے تو جہاز فن لینڈ کی حدود میں داخل ہوچکا تھا پھر جب ہماری گھڑیوں میں نو بج رہے تھے اور فن لینڈ کے وقت کے مطابق دس بج چکے تھے، ہمارا جہاز ہلسنکی کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہوا۔ محترم نسیم صاحب جو سالہا سال سے ہلسنکی میں مقیم ہیں اور یہاں کے باا ثر پاکستانی نژاد تاجر ہیں۔ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ جہاز راں کمپنی ہی کی طرف سے یہاں کے ہوٹل رمادہ میں قیام کا انتظام تھا جو شہر کے بالکل وسط میں واقع تھا۔ فن لینڈ، شمالی

یورپ کا خاصا اہم ملک ہے، اور اب تو موبائل فون کی کمپنی نوکیا کی وجہ سے اس کی یہ پیداوار دنیا بھر میں استعمال ہو رہی ہے۔ تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار مربع میل کا یہ ملک شمال میں ۶۰ سے ۷۰ عرض البلد تک پھیلا ہوا ہے، اور اس کی سرحدیں ناروے، سویڈن، اور روس سے ملتی ہیں، روس کا مشہور شہر سینٹ پیٹرز برگ (جس کا نام سوویت اقتدار کے زمانے میں لینن گراڈ تھا) ھیلسنکی سے کار کے ذریعے صرف دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ ملک کا تقریباً دس فی صد حصہ پانی ہے۔ دس ہزار جھیلیں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن آبادی صرف ساڑھے پانچ ملین (پچپن لاکھ) ہے۔ یعنی کراچی شہر کے آدھے سے بھی کم۔ صنعتی ترقی میں یہ ملک یورپ کے دوسرے ملکوں کی پوری طرح برابری کر رہا ہے۔ یہاں مخلوط معیشت پر عمل ہو رہا ہے، اور باشندوں کے لیے سہولیات بہت زیادہ ہیں۔ تعلیم تقریباً مکمل طور پر مفت ہے۔ صحت اور علاج کا نظام بھی آسان ہے، باشندوں کو حکومت کی طرف سے سستے داموں گھر خریدنے کا انتظام ہے۔ ایک عرصے تک فن لینڈ روس کے زیر تسلط رہا۔ لیکن اب مکمل طور پر آزاد ہے۔

ھلسنکی فن لینڈ کا دارالحکومت ہے، اور چھوٹا مگر خوب صورت اور تمام جدید شہری سہولیات سے آراستہ شہر ہے۔ جس روز ہم اس شہر میں رہے، اس دن ہر شخص کو یہ کہتے پایا کہ آج موسم کا گرم ترین دن ہے، حالانکہ درجہ حرارت اس دن صرف ۲۸ ڈگری تک پہنچا تھا، اور ہمیں وہ بڑا معتدل اور خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ فن لینڈ میں تقریباً بارہ ہزار مسلمان آباد ہیں جن میں سے صومالیوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۵۳۷۱ ہے۔ عراق کے ۲۶۷۰، ترکی کے ۱۷۳۷، ایران کے ۱۷۰۶، بوسنیا کے ۱۴۹۶، یوگوسلاویہ کے ۲۵۱۸، پاکستان کے دوسو، ہندوستان کے ۵، اور بنگلہ دیش کے چالیس پچاس مسلمان بھی یہاں آباد ہیں۔ ھلسنکی میں چھ سات مسجدیں ہیں۔ اس میں سے ایک مسجد پاکستانیوں کی بھی ہے، مگر وہ کرائے کے مکان میں ہے، اس لئے اسے مصلی کہنا چاہئے۔ اس کے امام مولانا اشرف صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ لاہور کے جامعہ نعیمیہ کے فاضل ہیں، اور انگریزی اور فنش زبانوں سے اچھی طرح واقف

ہیں۔ میں اس مسجد میں گیا تو انہوں نے بتایا کہ یہاں ظہر اور عصر کی نمازیں تو باقاعدگی سے باجماعت ہوتی ہیں، لیکن چونکہ دوسری نمازوں کے وقت لوگ دور چلے جاتے ہیں، اس لئے ان میں باقاعدگی نہیں ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ان کے گھر پر فون کردیتا ہے کہ مغرب کی نماز میں آنا چاہتا ہوں تو وہ جا کر مسجد کھول دیتے ہیں اور جماعت ہوجاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے جیل کے مسلمان قیدیوں کو ہفتے میں ایک بار درس کا انتظام ہے، مولانا اشرف صاحب یہ ہفتہ وار درس دیتے ہیں اس کے علاوہ عام اسکولوں میں بھی ہفتے میں ایک پیریڈ مذہب کے عنوان کے تحت اسلام کے بارے میں بچوں کو معلومات فراہم کرنے کے لئے دیا جاتا ہے، اکثر صومالی اساتذہ اس پیریڈ میں بچوں کو دین کے بارے میں بتاتے ہیں۔

ھلسنکی میں ایک اور مسجد مرکز الدعوة الاسلامیة کے نام سے قائم ہے اور عموماً مسجد الایمان کہلاتی ہے۔ یہ مسجد گھانا کے ایک مسلمان محمد شریف صاحب نے کویت کے تعاون سے بنائی ہے۔ ایک اور مسجد الرابطة الاسلامیة کے نام سے استاذ خضر شہاب کے زیر نگرانی قائم ہے، مجھے اس میں بھی جانے کا موقع ملا۔ یہاں اتوار کو بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہے اور کچھ بچے روزانہ بھی پڑھنے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک دارالمطالعہ اور دینی کتابوں کی فروخت کے لئے دکان بھی ہے، نیز حلال گوشت پر مشتمل ایک ریسٹورنٹ بھی۔

ھلسنکی میں ایک دن قیام کے بعد ہم اسی بحری جہاز سے واپس اسٹاک ہوم گئے، اور اسٹاک ہوم سے پھر ٹرین کے ذریعے اوسلو پہنچے۔ اوسلو میں دو دن مکمل آرام بھی کیا، اور اس سفرنامے کا آغاز بھی۔

یکم اگست کو میں لندن پہنچا، وہاں میرے دوست ظفر سرلیش والا صاحب کچھ مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ مشورہ تو چند گھنٹے میں ختم ہوگیا۔ اگلا سارا دن میرے پاس لندن میں خالی تھا، کیونکہ مجھے شام ۶ بجے واپس کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس دن کو میں نے برٹش لائبریری میں استعمال کیا۔ لندن میں پہلے متعدد کتب خانے مختلف جگہوں پر واقع تھے۔ اب برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری وغیرہ سب کو یکجا کر کے کنگ کراس ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بڑی عمارت میں برٹش لائبریری قائم کردی گئی ہے۔ میں نے اس کا ممبر شپ پاس بنوایا ہوا ہے، اور

جب کبھی لندن میں فرصت ملتی ہے تو اس پاس سے فائدہ اٹھا کر لائبریری کی سیر کرتا ہوں۔

اس مرتبہ میرے پیش نظر یہ تھا کہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب ''اظہار الحق''میں (جس کا اردو ترجمہ میں نے اپنی تحقیق کے ساتھ ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے شائع کیا ہے) جتنی انگریزی کتابوں کے حوالے آئے ہیں، وہ بہت پرانے ہو گئے ہیں، اوران کا اصل انگریزی متن دستیاب نہیں، یہاں تک کہ جب اظہار الحق کا انگریزی ترجمہ ہوا تو اس میں بھی ان حوالوں کو عربی سے ترجمہ کر کے پیش کیا گیا، حوالوں کے اصل متن نہیں دیئے جا سکے۔ یہ قدیم کتابیں کسی قدیم کتب خانے ہی میں مل سکتی ہیں، اس مرتبہ میرا مقصد یہ تھا کہ برٹش لائبریری میں یہ کتابیں تلاش کروں، اور اگر مل جائیں تو لندن میں کسی صاحب کو اس کام پر آمادہ کروں کہ وہ ان حوالوں کے اصل انگریزی متن جمع کریں۔

میرے دوست مولانا اسماعیل گنگات اور بالہم مسجد کے امام مولانا سکندر صاحب میری درخواست پر میرے ساتھ ہو گئے۔ اور ہم نے اس غرض سے کئی گھنٹے برٹش لائبریری میں گذارے۔ اب بیشتر لائبریریاں کمپیوٹرائزڈ ہو گئی ہیں اوران میں کتابوں کی تلاش کمپیوٹر کی مدد سے کرنی پڑتی ہے، لیکن یہ بات کمپیوٹر کا پروگرام بنانے والے پر منحصر ہے کہ کس لائبریری میں اس نے کتنا آسان پروگرام بنایا ہے۔ برٹش لائبریری میں کسی نے کمپیوٹر کا یہ پروگرام کافی پیچیدہ بنا دیا ہے جس کی وجہ سے کتابوں کی تلاش اتنی آسان نہیں رہی جتنی کمپیوٹر سے توقع ہوتی ہے۔ پھر بھی بحمد اللہ مجھے مطلب کی متعدد کتابیں مل گئیں جن کے حوالے میں نے نوٹ کر لیے۔ اس کے علاوہ ''اظہار الحق'' کا ایک فرانسیسی ترجمہ بھی مجھے یہاں مل گیا۔ تقریباً دس پندرہ سال پہلے مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے لکھا تھا کہ پیرس کے ایک کتب خانے میں انہوں نے اظہار الحق کا فرانسیسی ترجمہ دیکھا ہے جو ناقص ہے مگر میں نے اب تک خود یہ کتاب نہیں دیکھی تھی، آج مجھے براہ راست اسے دیکھنے کا موقع مل گیا جس کا نام ہے:

Idhharulhaqq ou manifestation de la verite

اور اس کے مترجم کا نام ہے، P.V. Carletti دو جلدوں میں بظاہر یہ مکمل نسخہ ہے اور ۱۸۸۰ء میں Paris ernest leroux سے شائع ہوا ہے۔ برٹش لائبریری میں اس کا

Shelf mark نمبر 14505d2 ہے۔ میں نے لائبریری سے اس نسخے کی ایک مائیکروفلم کاپی کرانے کا آرڈر بھی دے دیا اور انہوں نے ۲۵ دن کے اندر اس کی مائیکروفلم کاپی میرے کراچی کے پتے پر بھیجنے کا وعدہ کیا۔

اس طرح برٹش لائبریری کا یہ دورہ مفید رہا۔ اب میں لندن میں رہنے والے کسی ایسے صاحبِ ذوق کی تلاش میں ہوں جو اظہار الحق کے حوالوں کا یہ کام برٹش لائبریری کی مدد سے مکمل کرسکیں۔ اس کے لیے وہاں اپنے بعض دوستوں سے کہا ہے، اور اگر کوئی ایسے صاحب میرا یہ مضمون پڑھ رہے ہوں جو یہ کام کرسکتے ہوں تو وہ مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ انشاء اللہ انہیں اس کام کا مناسب حق الخدمت بھی پیش کرنے کا انتظام کیا جائیگا۔

اسی شام کو میں برٹش ایئرویز سے دبئی کے راستے کراچی روانہ ہوگیا۔

تاثرات

اس سفر میں میرے تین ہفتے متواتر یورپ کے چار ملکوں میں گذرے۔ اس مرتبہ میرے سفر کا بیشتر حصہ تفریحی نوعیت کا تھا، اور اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ کچھ عرصہ معمول کی مصروفیات سے ذہن کو آزاد کرکے گزارا جائے، لیکن ساتھ ہی کچھ اجلاسات میں شرکت بھی ہوگئی، اور الحمد للہ! معارف القرآن کیلئے قرآن کریم کی سورۃ الحج کے نصف حصے اور سورۃ المومنون کے نصف سے زائد حصہ کا انگریزی ترجمہ بھی اسی سفر کے دوران کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ تاہم چونکہ سفر کا اکثر حصہ تفریحی انداز کا تھا، اس لئے یورپ کے ان ممالک کو خاصے قریب سے اور دیر تک دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی یورپ کی متضاد نوعیت کی خصوصیات سامنے آئیں، بعض حیثیتوں سے ان کی بے ساختہ تعریف کرنے کو دل چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں جن اخلاقی قدروں کو فروغ دیا ہے، اور محنت و کاوش اور قومی ہمدردی کے تحت باشندوں کو جو سہولیات مہیا کی ہیں، انسان کی قدر افزائی اور اس کی انسانی عظمت کے تحفظ کے لیے جو مجموعی طرزِ عمل اختیار کیا ہے، وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ وہاں حکام اور عوام کے درمیان غیر معمولی فاصلے بھی نہیں ہیں، پچھلے سال اوسلو میں میں نے جس ڈاکٹروں کے اجتماع

سے خطاب کیا تھا، اس میں گورنر ایک عام آدمی کی طرح شریک تھا، کھانے کا وقت آیا تو وہ بے تکلفی سے مجھ سے بات کرنے کے لیے میری میز پر اپنی پلیٹ میں کھانا لے کر میرے پاس آ بیٹھا، اور جب جانے کا وقت آیا تو سادگی سے اٹھ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا، پروٹوکول کے جو ٹھاٹ باٹ ہمارے یہاں رواج پا گئے ہیں وہ وہاں نہ ہونے کے برابر ہیں، ہلسنکی (فن لینڈ) میں شام کے وقت ہم چہل قدمی کے لیے اس کے پارلیمنٹ اسکوائر والی سڑک پر نکلے تو تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک جھنڈے والی کار سگنل کے سامنے آ کر رک گئی، اور عام کاروں کے ساتھ آگے بڑھی، بعد میں پتہ چلا کہ یہ یہاں کی پرائم منسٹر کی کار تھی، اور وہ اس میں موجود تھیں، اس کے آگے پیچھے نہ کوئی پائلٹ نظر آیا، نہ پولیس کی گاڑیاں دکھائی دیں۔ یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ پچھلے دنوں یہ پرائم منسٹر (جو ایک خاتون ہیں) ایک سپر مارکیٹ میں خریداری کے لیے گئیں تو عام آدمیوں کے ساتھ لائن میں لگی رہیں اور جب ان کا نمبر آیا تب خریداری کی۔

غرض سادگی، صفائی ستھرائی، حسن انتظام، معاملات کی صفائی اور امانت اور احساسِ ذمہ داری کا مظاہرہ ہمیں تقریباً روزانہ ہی نظر آتا رہا اور محسوس ہوا کہ یہ صفات معاشرے میں اچھی طرح رچا بسا دی گئی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہی صفات ہیں جنھوں نے ان اقوام کو دنیا میں عروج دیا ہے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ بڑی زریں بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں بذاتِ خود ابھرنے کی طاقت نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے ان الباطل کان زھوقا۔ لہٰذا اگر کسی باطل قوم کو ابھرتے ہوئے دیکھو تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگی ہے جس نے اسے ابھارا۔ لہٰذا جو مغربی اقوام دنیا میں ترقی کرتی نظر آرہی ہیں، وہ اپنے باطل عقائد و نظریات یا فسق و فجور کی وجہ سے نہیں بلکہ ان صفات کی وجہ سے ترقی کررہی ہیں جو حق ہیں، اور جن کا نتیجہ کم از کم دنیا میں مل کر رہتا ہے۔ حقیقت میں یہ تمام صفات اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے انہیں چھوڑ دیا، اور ان اقوام نے ان پر عمل کر کے عروج حاصل کیا۔

لیکن دوسری طرف انہی اقوام کی بعض صفات ایسی ہیں کہ انہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف عملاً پستی میں جانوروں کی سطح سے بھی نیچے پہنچ گئے ہیں، بلکہ انہوں نے

اپنے معتقدات کے لحاظ سے حماقت اور نادانی کی انتہا کر رکھی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں کائنات کی بال کی کھال نکالنے کے باوجود ابھی تک وہ اس ایمان و اعتراف کی دولت سے محروم ہیں کہ کائنات کا یہ محیر العقول نظام کسی بنانے والے کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا، اور اسی بنانے والے کا یہ حق ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ بتائے۔ یہ سامنے کی بدیہی بات ابھی تک سائنس اور حرفت کے ان سورماؤں کی سمجھ میں نہیں آ سکی، اور یہاں پہنچ کر ان کی ساری حکمت و دانائی ہوا ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف اپنے اپنے ملکوں میں راحت و آسائش کے تمام اسباب جمع کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے معاشرتی ڈھانچے کو جس بری طرح تباہ کیا ہے وہ ہر چشمِ بینا کے لیے ایک درسِ عبرت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ناروے کی آبادی کا مختصر حصہ شادی شدہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت شادی کے بغیر مادر پدر آزاد زندگی گزار رہی ہے، خاندان کا تصور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہن کے رشتے اپنی مٹھاس کھو چکے ہیں، ہر شخص پیسے کی دوڑ میں مبتلا ہے۔ اور اس کی جدوجہد اپنی ذات کی حد تک محدود ہے۔ مہمان اور مہمان نوازی کا معاشرتی زندگی میں کوئی تصور نہیں۔ برسرِ عام فحاشی کوئی عیب کی بات نہیں۔ ہم جنس پرستی کی لعنت نے انسانی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے، ساری دنیا میں تمباکو نوشی کے خلاف مہم چلانے والے اور نشہ آور اشیاء کو جرم قرار دینے والے جب چھٹی کی رات میں شراب کے جام لنڈھانے پر آتے ہیں اور بدحواس ہو کر جو حرکتیں کرتے ہیں تو ان میں اور جانوروں میں تمیز نہیں کی جا سکتی۔ ھلسنکی جاتے ہوئے جس جہاز کے خوب صورت سفر کا میں نے ذکر کیا، اس کا وحشتناک پہلو یہ تھا کہ رات کے وقت تقریباً سب افراد نشے میں مدہوش ہو کر وہ طوفانِ بدتمیزی مچائے ہوئے تھے کہ ہمارا کیبن سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا، اور بے ساختہ زبان پر یہ کلمات آئے کہ الحمدلله الذی عافانا مما ابتلاهم به۔

اس لحاظ سے ان لوگوں کی زندگی دونوں لحاظ سے عبرت کا سامان ہے۔ ان کی زندگی کا اول الذکر پہلو قابلِ تعریف وتقلید ہے، اور وہی پہلو ہے جس سے ان کو ترقی نصیب ہوئی ہے، لیکن دوسرا پہلو انتہائی گھناؤنا، قابلِ نفرت اور قابلِ اجتناب ہے۔ اس نے انہیں ترقی نہیں

دی، بلکہ تباہی کے کنارے پہنچایا ہے، اقبال مرحوم نے درست کہا تھا کہ ؎

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب
نے زسحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے زعریاں ساق و نے از قطعِ موست
قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

اور ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس وقت ہمارے ملک پاکستان میں بالخصوص، اور اکثر اسلامی ملکوں میں بالعموم، ایک بڑھتا ہوا رجحان یہ ہے کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر مغربی مملکوں میں آباد ہونا چاہتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ہمارے ان ملکوں کے حالات ایسے ناگفتہ بہ ہیں کہ نہ امن و امان ہے، نہ باعزت روزگار، نہ قابلیت اور محنت کی کماحقہ قدر، انصاف مفقود ہے، اور بدعنوانی کا دور دورہ ہے۔ لوگ ان چیزوں سے گھبرا کر باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں مغربی ملکوں کا ہر سال کئی بار سفر کرتا ہوں، اور وہاں کے حالات سے بفضلہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہوں۔ میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ یہ ممالک ایک مسلمان کے مستقل قیام کے لائق ہرگز نہیں ہیں۔ کوئی مجبوری یا کوئی بلند مقصد سامنے آجائے تو بات اور ہے، لیکن عام حالات میں یہاں کا مستقل قیام ایسی چیز نہیں ہے جس کے لئے تگ ودو کی جائے، اور ہمارے ملک اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود ایک مسلمان کے لیے بسا غنیمت ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان ملکوں میں بیشک شہری سہولتیں یہاں سے کہیں زیادہ میسر آجاتی

ہیں (وہ بھی سب کو نہیں) لیکن انسان آخری عمر تک دوسرے تیسرے درجے کا شہری رہتا ہے۔ اور اسے زندگی بھر وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جو یہاں کے اصل باشندوں کو حاصل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ شہری سہولتیں انسان کو عموماً اپنے دین، اپنی اقدار اور اپنے بچوں کے روحانی مستقبل کی قیمت پر ملتی ہیں۔ بچوں اور خاص طور سے بچیوں کی تربیت ان ممالک کے رہنے والے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے جو مجموعی طور پر ابھی تک لاینحل ہے۔ والدین بچوں کو عام تعلیمی اداروں میں پڑھانے پر مجبور ہیں جہاں کا نصاب، نظام اور ماحول ایک غیرت مند مسلمان کے لیے تقریباً ناقابل برداشت ہے، اور جہاں تعلیم پانے کے بعد بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد ماں باپ کے ہاتھوں سے تقریباً نکل جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کا حال یہ ہے کہ وہ بچوں کو ابتدائے عمر ہی سے اپنی روایات سے بغاوت سکھاتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ بہت سے مغربی شہروں میں مساجد اور اسلامی مراکز کے قیام کے باوجود ان ملکوں کے بیشتر باشندے اذان کی آواز تک سے محروم ہیں، مسجد کے قریب گھر نہ ہو تو بہت سے لوگ نماز باجماعت، بلکہ جمعہ تک سے محروم رہ جاتے ہیں، انسان کے دل سے خدانخواستہ حلال وحرام کی فکر مٹ جائے تو بات دوسری ہے، لیکن اگر کسی کے دل میں اس فکر کی کوئی رمق ہے تو اس کے لیے قدم قدم پر مشکلات ہیں، سفر کے دوران حلال غذا کا حصول ایک مشکل مسئلہ ہے...... پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اہل مغرب کی زندگی کے وہ منفی پہلو جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، ان کو دن رات دیکھتے دیکھتے نگاہیں ان سے مانوس ہوجاتی ہیں، اور ان کی قباحت وشناعت کا احساس کم ہونے لگتا ہے، اور بعض اوقات بالکل مٹ جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مسلمان وہاں جاکر آباد ہوگئے ہیں، ان میں بے شمار ایسے غیور مسلمان ہیں جنہوں نے ان حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرکے اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھا ہے، بلکہ بعض مرتبہ ان مسلمانوں کے دینی حالات اسلامی ملکوں کے مسلمان باشندوں سے بدرجہا بہتر ہیں، لیکن اگر مسلمان آبادی کے مجموعی حالات کو مدنظر رکھا جائے تو اس صورتِ حال کو آبادی کی اکثریت کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، اور جو لوگ وہاں آباد ہو ہی گئے ہیں،

ان کے تحفظ کے لیے، یہ کوششیں جاری رہنی ہی چاہئیں، اور بفضلہ تعالیٰ ان میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ ابھی ان ممالک میں نہیں پہنچے، ان کے لیے وہاں جا کر مستقل قیام کوئی ایسی پرکشش چیز نہیں ہے جس کے لیے بھاگ دوڑ کی جائے۔

آخری بات یہ ہے کہ مثلاً پاکستان کی تیرہ کروڑ کی پوری آبادی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ملک چھوڑ کر کہیں اور آباد ہو جائے۔ اور اگر اچھی صلاحیت کے لوگوں کا انخلاء اسی رفتار سے جاری رہا جس رفتار سے اس وقت جاری ہے تو اس ملک کی تعمیر کون کرے گا؟ ملک کے حالات بے شک اچھے نہیں ہیں، لیکن قوموں پر ایسے وقت آیا ہی کرتے ہیں، ان کا حل میدان چھوڑ کر بھاگنا نہیں بلکہ حالات کی اصلاح کی کوشش ہے۔ یہ فریضہ اولاً بے شک حکومت کا ہے کہ وہ ملکی حالات کو قابلِ نفرت کی بجائے پرکشش بنائے، لیکن یہ ہم میں سے ہر شخص کا اپنا فریضہ بھی ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرہ اختیار میں حق کا چراغ روشن کرے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ جو چراغ جلایا جاتا ہے، اس سے اور چراغ جلتے ہیں، یہاں تک کہ بالآخر اندھیرا دور ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی سمجھ، اس پر عمل کی توفیق اور استقامت عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین۔

ستمبر ۲۰۰۱ء

جرمنی اور اٹلی کا سفر



۲۱ شعبان ۱۴۲۳ھ
۲۸ اکتوبر ۲۰۰۲ء

جرمنی اور اٹلی کا ایک سفر

جرمنی کی مشہور ارلینگن (Erleangen) یونیورسٹی نے مجھے اسلامی قانون پر ایک لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اسلام اور اسلامی ممالک سے متعلق تعلیم اور تحقیق کے مستقل شعبے ہوتے ہیں، اور یہاں کی تعلیم و تحقیق مغرب میں اسلام، مسلمانوں اور مسلم ممالک کے بارے میں مغربی تصورات کی صورت گری میں خاصا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مغربی میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے، یہ ادارے اس سے متاثر ضرور ہوتے ہیں، لیکن ان میں خاصی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو اس موضوع کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لیے وہ جس مذہب یا ملک کو موضوع بحث و تحقیق بناتے ہیں، اس کے نمایاں نمائندوں کو بھی مدعو کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے بیان کر سکیں۔ لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ عالم اسلام سے عموماً ان افراد کے انتخاب میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ عموماً ایسے اسکالرز کو بلایا جاتا ہے جو خود مغربی نظام تعلیم کی پیداوار اور اس سے مرعوب و متاثر ہوتے ہیں، اس لیے جو کچھ وہ وہاں جا کر بیان کرتے ہیں، اس سے اسلام اور مسلمانوں کی صحیح نمائندگی نہیں ہو پاتی۔ بالخصوص راسخ العقیدہ اہل علم کا جو تصور مغربی میڈیا نے عام ذہنوں میں پھیلایا ہوا ہے، اس کی تائید ہی ہو جاتی ہے۔ خود راسخ العقیدہ اہل علم کو شاذ و نادر ہی کبھی دعوت دی جاتی ہے۔ اس لیے جب کبھی مجھے اس قسم کی کوئی دعوت ملی، میں نے اسے قبول

کیا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے مجھے تین مرتبہ مغربی ملکوں کی یونیورسٹیوں میں دعوت دی گئی، ایک مرتبہ ہارورڈ یونیورسٹی کے لاء اسکول کی طرف سے، ایک مرتبہ لندن اسکول آف اکنامکس (LSE) کیطرف سے، جو معاشیات کی تعلیم کیلئے بین الاقوامی شہرت کا حامل ادارہ ہے، اور تیسری مرتبہ لندن ہی کے انسٹی ٹیوٹ آف مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کی طرف سے، تینوں مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ ان اداروں سے خطاب بے فائدہ نہیں رہا۔ چنانچہ جب مجھے جرمنی کی ارلینگن یونیورسٹی کی طرف سے مدعو کیا گیا تو میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔

مجھے ۳ شعبان ۱۴۲۳ھ/ مطابق ۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو کراچی سے جرمنی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اتفاق سے اسی دن ملک میں عام انتخابات منعقد ہو رہے تھے، چنانچہ میں دن کے وقت اپنا ووٹ استعمال کرنے کے بعد رات کو ساڑھے دس بجے امارات ایئر لائنز سے دبئی کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں سے رات ڈھائی بجے لفتھنسا کا طیارہ ملا جس نے مجھے صبح ساڑھے سات بجے فرینکفرٹ پہنچایا۔ مجھے اس لیکچر کی دعوت دینے میں ایک عرب مسلمان ماہر قانون عبدالعزیز یاقوتی کا بڑا دخل تھا۔ ان کا اصل وطن تو کویت ہے، لیکن وہ عرصے سے جرمنی میں مقیم ہیں، ان کی والدہ بھی جرمن نژاد مسلمان ہیں، اور وہ یہاں کارپوریٹ لاء کے شعبے میں کام کر رہے ہیں، اور ارلینگن یونیورسٹی کے صدر کی سربراہی میں انہوں نے اسلامک اسٹڈیز کا ایک حلقہ قائم کیا ہوا ہے۔ شروع میں تو تصور یہ تھا کہ میرا یہ لیکچر یونیورسٹی کے عام لیکچروں کی طرح کا ہوگا۔ لیکن بعد میں اسے انہوں نے اسلامک اسٹڈیز کے اس حلقے کی طرف سے ایک سمپوزیم کی شکل دے دی جس میں یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسر حضرات کو بھی مدعو کیا گیا۔ یونیورسٹی کی طرف سے یاقوتی صاحب کے ایک رفیق کار مسٹر کرنکس کو میرے استقبال اور ہمراہی کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا، انہوں نے ہی فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر میرا استقبال کیا۔ یہ جرمن نوجوان چونکہ انگریزی روانی سے بولتے تھے، اس لیے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور پورے سفر میں انہوں نے میری میزبانی، رہنمائی اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فرینکفرٹ سے ہمیں ٹرین کے ذریعے ایک اور شہر نیورن برگ (Nurnberg) جانا

تھا، ایک ٹرین میرے پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکی تھی اور دوسری کو نو بجے کے قریب روانہ ہونا تھا، اس لیے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ایئرپورٹ کے ریلوے اسٹیشن پر انتظار کرنا تھا، اس دوران میں نے فرینکفرٹ کے بعض احباب کو فون کرنا چاہا، مگر معلوم ہوا کہ میرے پاس نمبر پرانے تھے، اور اب نمبر بدل چکے تھے، اس لیے ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔

نو بجے ٹرین میں سوار ہوئے، اور تقریباً ڈھائی گھنٹے ٹرین میں گذارے، میں فرینکفرٹ تو پہلے بھی کئی مرتبہ آیا ہوں، لیکن جرمنی کے اندرونی علاقوں میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جرمنی کو اللہ تعالیٰ نے نہایت حسین قدرتی مناظر سے نوازا ہے۔ صاف ستھری آرام دہ ٹرین کے درجہ اول میں یہ سفر نہایت خوشگوار گزرا۔ موسم ٹھنڈا اور ابر آلود تھا، اور ٹرین کے شیشوں سے نظر آنے والے سرسبز پہاڑ، وادیاں اور گھنے جنگلات نگاہوں کے لیے سرور کا باعث بنتے رہے۔ بیچ میں کئی شہر بھی گذرے، یہاں تک کہ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم نیون برگ پہنچ گئے۔ ارلینگن شہر جس میں یونیورسٹی واقع ہے نیون برگ سے کار کے ذریعے تقریباً ۴۵ منٹ کی مسافت پر ہے، میرے قیام کا انتظام میرے میزبانوں نے ارلینگن کی بجائے نیون برگ کے ارابیلا شیراٹن ہوٹل میں شاید اس لیے کیا تھا کہ ارلینگن شہر چھوٹا ہے، اور فرینکفرٹ کے لیے واپسی نیون برگ سے زیادہ آسان تھی۔ ارابیلا شیراٹن ہوٹل شہر کے بالکل وسط میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی واقع تھا، چنانچہ ہمیں وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔

مسٹر کرنکس نے مجھے کمرے میں پہنچایا، لمبے سفر کے بعد کچھ آرام کی ضرورت تھی، مگر وہ جمعہ کا دن تھا، اس لیے مسٹر کرنکس نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ نماز جمعہ کا صحیح وقت معلوم کر کے مجھے کسی مسجد میں لے جائیں گے جتنی دیر میں نے آرام کیا، اتنی دیر میں انہوں نے مسجد کا پتا لگالیا، اور ہم ایک بجے ایک ٹیکسی کے ذریعے مسجد تک پہنچے۔ مسجد ماشاء اللہ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، ایک ترکی نژاد عالم نے خطبہ جمعہ شروع کیا، اور اس کے بعد الحمدللہ نماز جمعہ اطمینان سے نصیب ہوئی۔ مسجد میں زیادہ تر مسلمان عرب اور ترک تھے، چند پاکستانیوں سے بھی مسجد میں ملاقات ہوئی جو مجھے نہیں جانتے تھے، کراچی سے روانہ ہونے کے بعد مجھے انتخابات کے نتائج

معلوم کرنے کی فکر تھی۔ نیون برگ کے ہوٹل پہنچنے کے بعد مجھے اپنے دوست سعید احمد صاحب کو لندن فون کرنا تھا، ان سے میں نے پوچھا کہ کیا انتخابات کے نتائج کی کچھ خبر ہے؟ انہوں نے جواب میں مسرت کے ساتھ بتایا کہ متحدہ مجلس عمل اب تک کی خبروں کے مطابق چالیس سے زیادہ نشستوں پر جیت چکی ہے۔ جب مسجد میں یہ پاکستانی حضرات ملے تو میں نے ان سے انتخابات کے بارے میں پوچھا، ان نوجوانوں نے کہا کہ ''کتاب والے جیت رہے ہیں۔'' نماز کے بعد ہوٹل پہنچا تو وہاں سی این این پر یہ خبر نشر ہو رہی تھی کہ ''افغانستان سے ملحق دو صوبوں میں طالبان کے حامی اسلام پسندوں نے اکثریت حاصل کر لی ہے۔'' بعد میں تفصیلات مجھے اپنے گھر فون کر کے معلوم ہوئیں، اور میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

جمعہ کے دن مجھے وہاں کوئی خاص کام نہیں تھا، اس لیے معارف القرآن کے انگریزی ترجمے پر نظر ثانی کا کام جو اکثر سفر میں میرے ساتھ رہتا ہے، اس وقت سورۂ سبا، پر کام چل رہا تھا، میں اس میں مشغول رہا۔ عصر کے بعد مسٹر کرنکس نے کہا کہ نیون برگ خوب صورت شہر ہے، اگر آپ چاہیں تو تھوڑی سی سیر کر لی جائے، چنانچہ وہ مجھے شہر کے قابل دید مقامات پر لے گئے۔

اس شہر کا نام جرمنی تلفظ کے لحاظ سے نیون برگ ہے، اور انگریزی تلفظ کے لحاظ سے نیورمبرگ (NUREMBERG)۔ یہ شہر دریائے پگنٹز (Pegnitz) کے دونوں طرف آباد ہے۔ اسے جرمنی کے بادشاہ ہنری سوم نے گیارہویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا، اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ ایک عرصہ تک یہ ایک خودمختار ریاست بھی بنا رہا، اور دستکاری کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہوا، بہت سے موجدین اور سائنس دان یہاں سے پیدا ہوئے۔ جرمنی کی تاریخ میں اس لحاظ سے بھی اس شہر کو نمایاں مقام حاصل ہے کہ اسے ملک بھر میں علم و ہنر کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ نازی پارٹی کا مرکز بھی رہا، یہاں کی عمارتیں بھی اپنی صنعت کے لحاظ سے مشہور تھیں، لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی بمباری سے بری طرح مجروح یا نابود ہوگئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد شہر کی تعمیر نو کی گئی اور اب یہ ایک صنعتی شہر کی حیثیت

سے مشہور ہے جس میں بطور خاص کپڑے، چشموں اور کیمیاوی مواد کی صنعتیں نمایاں ہیں۔اس کے علاوہ یہاں کے متعدد تعلیمی ادارے بھی عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔

یہ شہر اپنے طرز تعمیر اور نظم وضبط کے لحاظ سے قدیم وجدید کا خوب صورت آمیزہ ہے۔جدید علاقوں کی عمارتیں اور سڑکیں عصر حاضر کے مذاق کی ہیں۔مگر شہر کے اندرونی حصے میں قدیم روایتی انداز کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، یہاں تک کہ اس علاقے کی گلیاں ابھی تک اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں، خوشگوار ٹھنڈے موسم میں شہر کے خاص خاص مقامات کی یہ سیر خاصی نشاط انگیز ثابت ہوئی۔

اگلے دن نو بجے کے قریب ہم کار کے ذریعے ارلینگن (Erlangen) روانہ ہوئے یہ شہر نیورمبرگ کے شمال میں واقع ہے۔فاصلہ تو پچاس ساٹھ میل سے کم نہ ہوگا، لیکن صاف ستھری سڑکوں اور ٹریفک کی کمی کی وجہ سے ہم تقریباً چالیس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ شہر جس کی آبادی دس لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہے، نیورمبرگ سے زیادہ قدیم ہے، اور اپنی یونیورسٹی کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔اس یونیورسٹی میں یوں تو تعلیم کے تمام شعبے ہیں، لیکن یہ ٹیکنالوجی کی تعلیم میں زیادہ معروف ہے۔

اسی یونیورسٹی کے ایک ہال میں سمپوزیم منعقد ہو رہا تھا۔موضوع تھا: ''پاکستان میں اسلامی قانون اور فتویٰ''، مجھے خصوصی طور سے اسلامی قانون پر گفتگو کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔میں نے اپنے خطاب کے لیے کمپیوٹر پر ایک پیشکش (Presentation) تیار کی تھی تاکہ اسے ملٹی میڈیا کے ذریعے اسکرین پر دکھایا جاسکے۔لیکن عین وقت پر مجھے منتظمین نے بتایا کہ اسکرین پر دکھانے کے لیے مشین غلط آگئی ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس یونیورسٹی میں جو ٹیکنالوجی کی تعلیم میں مشہور ہے، ایک تکنیکی خامی ہی کی وجہ سے میں اپنے لیکچر کے اہم نکات اسکرین پر پیش نہ کرسکا۔اور مجھے فی البدیہ تقریر کرنی پڑی۔ میں نے مختصراً اسلامی قانون کی حقیقت، اس کے مآخذ، ان کی اہمیت اور ریاست کی سطح پر ان کی تنفیذ پر اصرار کی وجوہ بیان کیں، اور اس کے بعد پاکستان کے قیام کا پس منظر، اس کی آئینی تاریخ اور اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلے میں

ہونے والے جزوی اقدامات وغیرہ کی سرگزشت بیان کی۔ مجمع کچھ زیادہ نہ تھا۔ بمشکل پچاس کے قریب حاضرین ہوں گے، لیکن سب اعلیٰ تعلیم کے حامل پروفیسر، ماہرین قانون اور مختلف شعبہ ہائے تعلیم کے سربراہ تھے۔ یہ لیکچر طلبہ کے بجائے انہوں نے اساتذہ کے لیے ترتیب دیئے تھے۔

میری تقریر تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی اور توجہ سے سنی گئی، سوال و جواب کا بھی سلسلہ رہا، تمام سوالات علمی نوعیت کے تھے، کسی بھی سوال سے کسی عناد کی بو نہیں آئی، محسوس ہوا کہ سب لوگ سنجیدہ اور باوقار تھے، اور میڈیا کے پروپیگنڈے اور علمی حقائق میں فرق کر سکتے تھے۔

مجھے یاقوتی صاحب نے بعد میں ٹیلی فون پر بتایا کہ آپ کے جانے کے بعد آپ کی تقریر کے مختلف نکات بعد کے سمپوزیم اور نجی نشستوں میں موضوع گفتگو بنے رہے اور لوگوں نے بتایا کہ اس سے ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ فالحمد للّٰہ علی ذلک۔

اسی شام میں مسٹر کرنکس کے ہمراہ دوبارہ ٹرین کے ذریعے واپس فرینکفرٹ پہنچ گیا۔

اٹلی کا سفر

میں جرمنی سے ۱۲/ اکتوبر کو فارغ ہوگیا تھا، اس کے بعد ۱۶/ اکتوبر سے ۱۸/ اکتوبر تک برطانیہ میں میری مصروفیات تھیں، اور اس کے بعد مجھے واشنگٹن جانا تھا۔ لہٰذا ۱۳ سے ۱۵/ اکتوبر تک تین دن میرے پاس خالی تھے۔ جو میں نے اٹلی کے سفر میں خرچ کئے، میرے دوست سعید احمد صاحب جو لندن میں مقیم ہیں، اور اندلس کا سفر میں نے ان کے ساتھ کیا تھا، مجھے بارہا کہہ چکے تھے کہ کبھی کسی ایسے سفر کا پروگرام بنایئے جس میں کام کوئی نہ ہو۔ میں نے یہ تین دن ان کی معیت میں اٹلی میں گزارنے کا پروگرام بنالیا تھا، اور طے یہ ہوا تھا کہ ۱۲/ اکتوبر کی رات کو وہ لندن سے روم پہنچ جائیں گے اور میں فرینکفرٹ سے۔ چنانچہ اسی پروگرام کے مطابق رات ساڑھے نو بجے مجھے فرینکفرٹ سے روم کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں ۷ بجے شام فرینکفرٹ ائیر پورٹ پہنچ چکا تھا، درمیانی وقفہ میں لاؤنج میں معارف القرآن کا کام کرنے میں گزارا، اور کمپیوٹر کو مزید چارج بھی کرلیا، تاکہ جہاز میں بھی کام کرسکوں۔ ساڑھے نو بجے لفٹ ھنسا کی

پرواز سے روانہ ہو کر ساڑھے گیارہ بجے رات روم ہوائی اڈے پر اترا۔ سامان آنے میں غیر معمولی دیر لگ گئی جس کی وجہ سے میں ساڑھے بارہ بجے کے بعد ایئر پورٹ سے نکل سکا۔ اس ایئر پورٹ سے شہر کا فاصلہ ۴۵ کلومیٹر تھا، لہٰذا رات کو ایک بجے کے بعد ہوٹل کراؤن پلازہ پہنچ پایا، جہاں سعید صاحب میرے منتظر تھے۔ دن بھر کی تھکن نے جلد بستر کی راہ دکھائی اور آرام کیا۔

ویٹی کن میں

صبح ناشتے کے بعد ہم سب سے پہلے ویٹی کن گئے۔ یہ دنیا کی سب سے چھوٹی خودمختار ریاست ہے جو پوپ کی سربراہی میں ۱۹۲۹ء سے قائم ہے۔ رومی سلطنت نے جب سے عیسائی مذہب اختیار کیا تھا، وقفے وقفے سے رومی سلطنت کے بادشاہ اور پوپ کے درمیان شدید کشمکش سلطنت کی یک جہتی کے لیے زبردست خطرہ بنی رہی۔ اگرچہ عیسائی مذہب کا مشہور نظریہ یہ تھا کہ ''قیصر کا حق قیصر کو دو، اور کلیسا کا حق کلیسا کو'' جس کا حاصل یہ تھا کہ ملک کا سیاسی سربراہ قیصر ہے، اور مذہبی سربراہ کلیسا کا پوپ ہے، لیکن بزرگوں نے صحیح فرمایا ہے کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ پوپ اگرچہ مذہبی سربراہ تھا لیکن اسے عملاً خدائی جیسا درجہ دے دیا گیا تھا۔ عیسائی عقیدے کے مطابق پوپ جناب پطرس کا اور ان کے واسطے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلیفہ ہوتا ہے، اور پوپ ہونے کی حیثیت سے اس کے بارے میں عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ وہ معصوم اور غلطیوں سے پاک (Infallibe) ہوتا ہے۔ چنانچہ جو حکم وہ جاری کردے، وہ تمام عیسائیوں کے لیے ایک خدائی حکم کا درجہ رکھتا ہے، اس کے یہ احکام صرف شارح (Interprettor) کی حیثیت میں نہیں، بلکہ شارع اور قانون ساز (Legislator) کی حیثیت میں واجب التسلیم ہوتے ہیں۔ وہ مخصوص دائرے بھی مبہم اور غیر واضح تھے جن میں بادشاہ اور پوپ کی حدودِ اختیار کا تعین کیا جائے، لہٰذا دونوں کے احکام میں ٹکراؤ ایک طبعی امر تھا۔ بادشاہ مذہبی رہنما کی حیثیت سے پوپ کی عزت کرتے اور اسے ''مقدس باپ'' کا لقب دیتے تھے، لیکن جب یہ ''مقدس باپ'' کوئی حکم جاری کرتا جسے بادشاہ اپنی حدود اختیار میں مداخلت سمجھتا تو دونوں میں لڑائی ٹھن جاتی تھی۔ رومن کیتھولک عیسائیوں کی صدیوں کی تاریخ

بادشاہ اور پوپ کی اس کشاکش سے لبریز ہے۔

بالآخر ۱۱/ فروری ۱۹۲۹ء میں اس مشکل کا حل اٹلی کی ریاست اور پوپ کے درمیان ایک معاہدے کی صورت میں نکالا گیا جسے Lateran Treaty کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے ویٹی کن کے علاقے کو پوپ کی سربراہی میں ایک مستقل، آزاد اور خودمختار ریاست کی شکل دے دی گئی۔ یہ ریاست دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست ہے، جس کی فوج، کرنسی، بینکنگ سسٹم اور ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی فون، پوسٹ آفس اور اندرونی نظم ونسق تمام تر اٹلی کی عام حکومت سے آزاد اور پوپ کے احکام کے تابع ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ جس شخص کے پاس اٹلی کی شہریت یا ویزا ہو، اسے اس میں داخلے کے لیے ویزا لینا نہیں پڑتا۔ اس طرح پوپ کے اقتدار کی تسکین کے لیے یہ ریاست ایک حیلے کے طور پر بنائی گئی ہے، اگرچہ اس کا رقبہ یا دائرہ اختیار ''سلطنت شاہ عالم دلی تا پالم'' سے بھی کمتر ہے۔ جس زمانے میں ویٹی کن ریاست کے قیام کا یہ معاہدہ طے پایا، یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی نشاۃ ثانیہ مکمل ہو چکی تھی لبرلزم کا ڈنکا بج رہا تھا، اور عیسائی مذہب اور اس کے علماء کی تنگ نظری اور چیرہ دستیوں سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس نے لوگوں کو مذہب ہی سے منحرف کر دیا تھا، لہٰذا پوپ کے لیے اپنا عالمگیر اقتدار قائم رکھنا ممکن نہیں رہا تھا، اس لیے شاید اس وقت کے پوپ نے اس بات کو غنیمت سمجھا کہ ایک مختصر دائرے میں ہی سہی، اس کے اقتدار کو فی الجملہ تسلیم تو کر لیا جائے۔ اور اس طرح اٹلی کی ریاست اور پوپ کی باہمی رضامندی سے یہ معاہدہ وجود میں آ گیا۔

ویٹی کن اگرچہ خودمختار مستقل ریاست ہے، لیکن محل وقوع کے لحاظ سے وہ اب شہر روم ہی کا ایک حصہ یا ایک محلہ ہے۔ ویٹی کن میں داخل ہونے کے بعد سب سے بڑی پرشکوہ عمارت ''سینٹ پیٹرس باسلیکا'' (St.Peter`s Basilica) کہلاتی ہے۔ باسلیکا انگریزی میں ایک خاص قسم کی عمارت کو کہتے ہیں جس کے لیے اردو میں قریب ترین لفظ شاید ''حویلی'' ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی عمارت ہے جو کسی بڑے چوک کے گرداگرد نصف دائرہ بناتی ہوئی سہ دریوں سے جڑی ہوئی ہو۔ یہ باسلیکا دنیا کے سب سے بڑے چرچ پر مشتمل ہے جو حضرت

عیسٰی علیہ السلام کے سب سے برگزیدہ حواری حضرت پطرس کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا۔ حضرت پطرس جن کو بائبل کی زبان میں Saint Peter کہا جاتا ہے، حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے تھے، عیسائی تاریخوں کی رو سے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد ان کے دین کی تعلیم و تبلیغ میں مصروف رہے، اور اس غرض کے لیے انہوں نے دور دراز کے سفر کیئے، آخر میں اسی سلسلے میں وہ روم بھی تشریف لائے جہاں اس وقت بت پرستوں کی حکومت تھی، انہوں نے انہیں قید کر کے اسی مقام پر سولی پر چڑھایا تھا جہاں اس وقت سینٹ پیٹرس باسیلیکا کی پرشکوہ عمارت کھڑی ہے۔ اسی عمارت میں ان کا مقبرہ بھی بتایا جاتا ہے۔

رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق حضرت پطرس اعظم الحواریّین تھے، اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نائب، عیسائیوں کے خیال کے مطابق وہی رومن کیتھولک چرچ کے اصل بانی ہیں، لہٰذا عیسائیوں نے دنیا کا یہ سب سے بڑا چرچ انہی کے مقبرے کے گرد تعمیر کیا ہے۔ ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے کہ:

> ''جس وقت حضرت پطرس کو ویٹ کن کی پہاڑی پر سولی دی جارہی تھی تو کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سولی دینے والے اسی جگہ ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو سائز کے اعتبار سے دنیا کی سب سے چھوٹی اور اپنے روحانی حلقہ اثر کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی ریاست ہوگی۔''

یہ تمام باتیں عیسائی روایات کی ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد ان کے حواریّین کی تاریخ کا ریکارڈ قابل اعتماد طریقے سے محفوظ نہیں رہ سکا، اور جو کچھ ریکارڈ ہے، وہ پولوس کے اثرات سے آلودہ ہے، اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال! اس میں کوئی شک نہیں کہ سینٹ پیٹرس باسیلیکا کی یہ عمارت اپنے روکار کے شکوہ اور طرز تعمیر کی رعنائی اور پرکاری کے لحاظ سے ایک شاندار عمارت ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام جو بت پرستی کو مٹانے کے لیے تشریف لائے تھے، ان کے نام پر بنی

ہوئی اس عبادت گاہ میں اتنے بت اور مجسمے ہیں کہ یہ ایک بت کدہ معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ظاہری حسن و جمال کے باوجود اس میں عبادت گاہ کے تقدس کی بجائے ایک عجیب قسم کی ظلمت کا احساس ہوتا ہے۔ اور ایسے مقامات پر بطور خاص اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم کا احساس اور زیادہ نمایاں ہوتا ہے کہ اس نے ہمیں اسلام جیسے صاف ستھرے دین حق کی ہدایت عطا فرمائی، وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللّٰہ.

پوپ کی فوج کے دستے جنہیں سوئس گارڈ کہا جاتا ہے، اس سیاحوں سے بھرے ہوئے علاقے میں گشت کر رہے تھے، اور جو راستہ پوپ کی رہائش گاہ کی طرف جاتا ہے اس کے کونے پر دونوں طرف دو سوئس گارڈ اس طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے کہ وہ بالکل بت معلوم ہوتے تھے۔ اس طرح کی شاہانہ شان و شوکت ایک مذہبی سربراہ کو کیسے زیب دیتی اور اس کے حلق سے کیسے اتر جاتی ہے؟ اللہ ہی جانے!

ایک قابل ذکر بات البتہ یہ نظر آئی کہ چرچ کی عمارت میں ننگی ٹانگوں والے لباس سے داخلہ ممنوع ہے، چنانچہ ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ نیکر پہن کر تشریف لائے تھے، مگر ساتھ ایک تھیلا تھا جس میں پتلون پڑی ہوئی تھی۔ عمارت میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے پتلون پہنی اور عمارت کی سیر کرکے باہر نکلے تو اسے اتار کر دوبارہ نیکر کے جامے میں آ گئے۔

ویٹی کن میں اور بھی بہت سی عمارتیں ہیں جن میں یہاں کا میوزیم اور لائبریری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ میوزیم سے تو بندے کو دلچسپی نہیں، البتہ یہاں کی لائبریری عیسائی مذہب اور اس کی تاریخ پر بہت نایاب کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے۔ مجھے اظہار الحق کے جو مآخذ دوسری جگہوں پر دستیاب نہیں ہوئے، ان کے بارے میں امید ہے کہ اس لائبریری میں ضرور مل جائیں گے، لیکن اس وقت لائبریری سے استفادے کا وقت نہیں تھا، انشاء اللہ پھر کبھی خود یا کسی رفیق کی معرفت یہاں ان کتابوں کی تحقیق کروں گا۔

روم کے کھنڈرات

ویٹی کن سے نکل کر ہم ایک اور علاقے میں گئے جو قدیم رومی محلات اور تعمیرات کے کھنڈروں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک وسیع علاقہ ہے جس میں قدیم زمانے کے پرشکوہ محلات کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس علاقے کی ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر چاروں طرف ان آثار کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے عالم شباب میں اس علاقے کے حسن و جمال اور شان و شوکت کا کیا عالم ہوگا، لیکن آج یہ آثار قدم قدم پر انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ دنیا میں کسی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی ہمیشہ رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ رومی سلطنت کی گھن گرج صدیوں تک دنیا میں سنائی دیتی رہی، اس کے بادشاہوں اور سالاروں کے طنطنے یہاں اپنی شان و شوکت دکھاتے رہے، لیکن آج وہ مٹی کے ڈھیر ہو چکے ہیں، اور یہ بوسیدہ کھنڈر ان کی شان و شوکت کا مرثیہ پڑھتے نظر آتے ہیں۔

جو مرکز الفت تھے، جو گلزار نظر تھے
سڑتے ہیں تہِ خاک وہ اجسام بتاں آج
وہ دبدبہ جن کا تھا کبھی دشت و جبل میں
حسرت کے کھنڈر ہیں وہ محلات شہاں آج
جن باغوں کی نکہت سے معطر تھیں فضائیں
ہیں مرثیہ خواں ان پہ ببولوں کی زباں آج

اس علاقے میں کھنڈرات کا یہ سلسلہ اس شہرۂ آفاق کولوسیم پر ختم ہوا ہے جس کی دیواروں کی تصویر دنیا بھر میں روم کی علامت کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ یہ ایک تاریخی تماشا گاہ ہے جو آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے (۸۰ ء میں) روم کے بادشاہ طیطوس (Titus) نے بنائی تھی۔ یہ اسٹیڈیم کے طرز پر بنی ہوئی ایک عمارت تھی جس میں پچاس ہزار تماشائیوں کے بیٹھ کر مختلف کھیل اور کرتب دیکھنے کا انتظام تھا۔ اس عمارت کی تکمیل پر طیطوس نے سو دن تک جشن

منایا تھا۔اس تماشا گاہ میں کرتب دکھانے کے لیے غلاموں کو سدھایا جاتا تھا جنہیں تاریخ میں Gladiators کہتے ہیں۔ان کی آپس میں،اور کبھی جنگلی جانوروں سے کشتی کرائی جاتی تھی، اورطرح طرح کے کرتبوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔آج بھی اس کے اردگرد منتظمین نے بہت سے انسانوں کوان غلاموں کالباس پہنا کر چھوڑا ہوا ہے۔اس تماشا گاہ کوکلوسیم (Colosseum) اس لیے کہا جاتا ہے کہ روم کے مشہور بادشاہ نیروکا ایک لقب کولوسوس (Colossus) بھی تھا، اور یہاں اس کا ایک بڑا مجسمہ نصب تھا،اس کی نسبت سے اس تماشا گاہ کوکلوسیم کہا جانے لگا۔

روم چونکہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے،اور رومی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔اس لیے اس کا چپہ چپہ تاریخ ہے۔سات پہاڑیوں پر بنا ہوا یہ شہر قدم قدم پر کوئی نہ کوئی یادگار رکھتا ہے،دنیا بھر سے سیاح ان یادگاروں کودیکھنے آتے ہیں،لیکن ان یادگاروں کے ہر گوشے سے عبرت وموعظت کے جو سبق کھلی کتاب کی طرح دعوت فکر دیتے ہیں،تفریح وسیاحت کے جوش میں ان کی طرف دھیان دینے والا کوئی نہیں۔قرآن کریم اس قسم کے آثار کو دیکھ کر عبرت و موعظت کے انہی پہلوؤں کو یاد دلاتا ہے:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ یہ دیکھتے کہ جولوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیاانجام ہوا؟

ان تمام آثار سے سبق یہی ملتا ہے کہ اس دنیا میں عزت،دولت،شہرت،لذت اور شان و شوکت سب فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں،اگر کوئی چیز باقی رہنے والی ہے تو وہ انسان کا ایمان اور عمل صالح ہے جس کے نتائج انمٹ اور لازوال ہیں۔

وینس میں

اگلے روز ہم ٹرین کے ذریعے وینس روانہ ہوئے۔جسے عربی زبان میں ''بندقیہ'' کہا جاتا ہے۔یہ تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کا سفر تھا۔راستے میں اٹلی کے بہت سے شہر گزرتے رہے جن

میں فلورنس کا مشہور اور خوب صورت شہر بھی شامل تھا۔ تقریباً ایک بجے دوپہر ہم وینس کے ریلوے اسٹیشن پر اترے۔ میرے دوست سعید صاحب نے یہاں ایک ہوٹل میں بکنگ کرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ریلوے اسٹیشن ہی سے ہوٹل فون کر کے راستہ معلوم کیا تو ہوٹل والوں نے بتایا کہ آپ ٹیکسی سے بھی آ سکتے ہیں جس میں تقریباً ساٹھ یورو خرچ ہوں گے، اور بس سے آئیں تو وہ ہمارے ہوٹل کے بالکل دروازے پر اتارے گی، اور فی کس تین یورو لے گی، وقت تقریباً برابر ہی خرچ ہوگا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ پھر بس ہی سے جانا چاہیے۔ لیکن جب ہم ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو سامنے ایک بحری گودی کا سا منظر تھا۔ نہ کوئی ٹیکسی نظر آ رہی تھی، نہ بس۔ البتہ سامنے سمندر میں چھوٹی بڑی کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں، معلوم ہوا کہ انہی کشتیوں کا نام بس یا ٹیکسی ہے۔ اگر چھوٹی کشتی مکمل طور سے کرائے پر لیں تو وہ ٹیکسی ہے، اور اس پر ٹیکسی ہی لکھا ہوا بھی ہے، اور اگر مشترک استعمال کی بڑی کشتی میں بیٹھیں تو وہ بس ہے۔

وینس کی یہی خصوصیت ہے جسے دیکھنے دنیا بھر سے سیاح یہاں آتے ہیں کہ یہ پورا شہر پانی کے بیچوں بیچ آباد ہے، اور اس میں آمد و رفت کا ذریعہ یہی کشتیاں ہیں۔ چنانچہ ہم ایک پانی کی بس میں سوار ہو گئے وہ پانی میں چلتی اور مختلف مقامات پر رکتی رہی، کچھ لوگ اترتے اور دوسرے چڑھ جاتے۔ تقریباً ۴۵ منٹ بعد اس بس نے واقعۃً ہمیں جس جگہ اتارا اس کے بالکل سامنے پنوراما ہوٹل واقع تھا۔ اور کشتی سے اتر کر ہم آسانی اس میں پہنچ گئے۔

وینس درحقیقت اٹلی کے شمال میں بحر متوسط کا ایسا کنارہ ہے، جو ایک سو اٹھارہ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک سو اسی آبی راستے ہیں، اور جزیروں کو باہم مربوط رکھنے کے لیے چار سو چھوٹے بڑے پل بنائے گئے ہیں ان جزیروں پر جب مکانات بنائے گئے تو آپس میں آمد و رفت کے لیے ان آبی راستوں کو استعمال کیا گیا جن میں آمد و رفت اور نقل و حمل کا ذریعہ کشتیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ وینس کے بعض جزیروں پر آبادی کا ثبوت تو کئی ہزار سال قبل مسیح سے بتایا جاتا ہے، لیکن ایک مربوط اور منظم شہر کی حیثیت تک وہ رومی سلطنت کے دور میں پہنچا اور اس میں کئی صدیاں صرف ہوئیں۔ وینس کی عمارتیں جو بہت

سے محلات پر بھی مشتمل ہیں پانی کے کنارے کھڑی نظر آتی ہیں جس سے دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ عمارتیں پانی میں بنائی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ درحقیقت قدرتی جزیروں پر بنی ہوئی ہیں، البتہ کہیں کہیں پانی کے حصے کو پاٹ کر بھی کچھ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔

شام کے وقت ہم پانی کی بس ہی کے ذریعے شہر کے وسط علاقے میں گئے جہاں کا مرقس چوک (St.Mark Square) اپنی رونق، روایتی حسن اور سیاحت کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ابتدا میں یہ ایک طرح کی سبزی منڈی تھی، بعد میں ایک بادشاہ کے حکم سے اسے صاف کر کے ایک تفریحی چوک کی شکل دے دی گئی اس کے چاروں طرف ایک ہی ڈیزائن کی تین منزلہ عمارتیں ہیں جن کے برآمدوں میں رومی طرز کی محرابیں تسلسل کے ساتھ چلی گئی ہیں، اور اب شاپنگ سینٹر کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں، ان عمارتوں کے کنارے پر اک کلاک ٹاور ہے جو وینس کا سب سے اونچا مینار ہے۔

مرقس چوک سے بہت سی گلیاں اندرون شہر میں جاتی ہیں، اور اندرون شہر کی آبی گلیوں تک پہنچاتی ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے پل بنے ہوئے ہیں، اور ان میں چھوٹی کشتیاں چلتی ہیں۔ یہیں اندر جا کر وہ ریالٹو برج واقع ہے جس پر کھڑے ہو کر شہر کی مرکزی نہر گرانڈ کینال کا نظارہ زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ شہر اس لحاظ سے ایک عجوبہ ہے کہ وہ ایک پانی میں بسا ہوا شہر ہے، اور جہاں، پانی اور خشکی کے مکینوں نے بقائے باہمی کا سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اس عجوبہ روزگار شہر میں ایک دن ایک رات کا قیام خاصا دلچسپ رہا۔

۱۵/ اکتوبر کو مجھے لندن روانہ ہونا تھا۔ ایئر پورٹ بھی پانی کی بس کے ذریعے جانا ہوا۔ ایک جگہ یہ بس رکی تو معلوم ہوا کہ یہاں وینس کی مشہور گلاس فیکٹری ہے جس میں شیشے کے گلاس اور دوسرے برتن بنتے ہیں۔

میں وینس سے لندن پہنچا، ۱۶/ اکتوبر کو وہاں ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ ۱۷/ اکتوبر کو شیفیلڈ میں ایک مدرسے کا افتتاح تھا، اس میں شرکت اور خطاب کی نوبت آئی۔ شام ہی کو میں

آکسفورڈ چلا گیا، اور ۱۸/ اکتوبر کو آکسفورڈ اسلامک سینٹر کی اکیڈمک کونسل کی میٹنگ میں شریک ہوا، اسی شام لندن واپس آکر ایک رات وہاں گزاری اور ۱۹/ اکتوبر کو وہاں سے واشنگٹن گیا، اسی رات وہاں ایک اجتماع سے خطاب تھا، آئندہ دو روز بھی مختلف اجتماعات میں صرف ہوئے۔ ۲۳/ اکتوبر کو واشنگٹن سے روانہ ہوکر ۲۴/ کی رات کو بحمد اللہ واپس کراچی پہنچا۔ یہاں پہنچ کر طبیعت ناساز ہوگئی، اس دوران کوئی پیچیدہ یا مشکل کام کرنے کی طبیعت اجازت نہ دیتی تھی۔ اس لیے ایک ہلکے پھلکے کام کے طور پر سفر نامے کی یہ سطور لکھنے کا موقع مل گیا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.